جنوبی و شمالی ہند کی

# تاریخی مثنویاں

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

کندن لال کندن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Marfat.com

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

# تاریخی
# مثنویاں

## تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

کندن لال کندن

Marfat.com

130/139

جملہ حقوق محفوظ!

# Junubi wo Shumali Hind ki Tareekhi Masnaviyan

By

**Kundan Lal Kundan**

Year of Edition 2001
ISBN 81-87667-09-5
Price Rs. 250/-

کتاب کا نام.............جنوبی وشمالی ہند کی تاریخی مثنویاں
مصنف.............کندن لال کندن
سنِ اشاعت.............۲۰۰۱ء
قیمت.............۲۵۰ روپے
مطبع.............کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

Published by

**Educational Publishing House**

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph: 3214465, 3216162 Fax:91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com

Marfat.com

# ترتیب


| | | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| پیش لفظ | | | ۹ |
| مقدّمہ | | | ۱۲ |
| **باب اوّل** | | | |
| صنفِ مثنوی | | | ۱۶ |
| مثنوی کی تعریف | | | ۱۶ |
| دیگر اصنافِ سخن اور مثنوی | | | ۱۷ |
| مثنوی کے اوزان | | | ۱۹ |
| مثنوی پر تنقید | | | ۲۳ |
| **باب دوم** | تاریخی مثنویوں کا ارتقا جنوبی و شمالی ہند میں | | ۳۱ |
| عبدل | عبداللہ | ابراہیم نامہ | ۴۵ |
| شوقی | شیخ حسن | ۱۔ فتح نامہ نظام شاہ | ۵۱ |
| | | ۲۔ میزبانی نامہ محمد عادل شاہ | ۵۸ |
| نصرتی | محمد نُصرت | ۱۔ علی نامہ | ۶۲ |
| | | ۲۔ تاریخ اسکندری | ۷۴ |
| غضنفر | غضنفر حسین | جنگ نامہ سید عالم علی خاں | ۷۹ |
| نیئر | | جنگ نامہ بہادر راؤ | ۸۸ |
| عزت | حسین علی | اضراب سلطانی | ۹۱ |
| پیم | پیم چند | شاہنامہ | ۱۰۱ |
| کمتر | شاہ کمتر | داستان نواب نظام علی خاں | ۱۰۵ |


Marfat.com

| | | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| فقیہ | باپو میاں | ۱۔ مثنوی برحادثۂ آتش زدگی در بمبئی | ۱۰۹ |
| | | ۲۔ مثنوی مسمارگیٔ شہر بمبئی | ۱۱۱ |
| نادر | | مثنوی نادر | ۱۱۳ |
| ناطق | عنایت خاں دولت زئی | مثنوی قصّہ شہیداں | ۱۱۶ |
| عرفان | | مثنوی اخبار شہیداں | ۱۱۸ |
| نذر علی | | مثنوی سراج التواریخ | ۱۲۱ |
| ضیا | مولوی سید باقر حسن | مثنوی ضیا دکن | ۱۲۵ |
| اطہر | سیّد وزیر الدین | مثنوی طغیانی رودِ موسیٰ | ۱۳۱ |
| دانش | دلاور علی | تذکرہ منظوم سلاطین دکن تحفہ عثمانیہ | ۱۳۴ |
| وفا | مولوی حبیب اللہ | آصف نامہ | ۱۳۹ |
| ذوقی | سیّد حسین | مثنوی ذوقی موسوم بہ شاہنامہ احمدیت | ۱۴۷ |
| جعفر | میر جعفر (زٹلی) | ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی | ۱۵۲ |
| کبیر | | مثنوی | ۱۵۹ |
| میر | میر تقی | ۱۔ جنگ نامہ | ۱۶۴ |
| | | ۲۔ در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ | ۱۶۷ |
| حسن | میر حسن | شادی | ۱۶۹ |
| عبرت و عشرت | | پدماوت (شمع و پروانہ) | ۱۷۴ |
| رنگین | سعادت یار خان | جنگ نامہ رنگین | ۱۷۸ |
| منشی | مول چند | اردو شاہنامہ | ۱۸۵ |
| امیر | امیر علی | جنگ نامہ یلدہ بھوپال | ۱۸۸ |
| امیر | شاہ امیر الدین | اطلاع نامہ | ۱۹۲ |
| سہیل | سید حیدر حسن خاں رضوی | ۱۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ | ۱۹۴ |
| | | ۲۔ مثنوی سہیل دکن | ۲۰۱ |


Marfat.com

| | | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| | | ۳۔ تاریخ ہندوستان منظوم | ۲۰۳ |
| احمد | سید احمد علی شاہ | ۱۔ کشف البغاوت گورکھپور | ۲۰۹ |
| | | ۲۔ محبوب التاریخ | ۲۱۶ |
| تمنا | کاشی رام سہائے | یادگار بھوپال | ۲۲۲ |
| اختر | واجد علی شاہ جانِ عالم | حزنِ اختر | ۲۲۸ |
| حیدر | غلام حیدر | اردو سکندر نامہ | ۲۳۲ |
| قدیم رنگ کی مثنویوں کا آخری دور | | | ۲۳۵ |
| تسلیم | احمد حسین عرف امیر اللہ | ۱۔ مثنوی تاریخ رامپور ۲۔ تواریخ کامل | ۲۴۳ |
| شاد | سید علی محمد | ۱۔ مثنوی نوید ہند | ۲۴۹ |
| | | ۲۔ مثنوی مادر ہند | ۲۵۱ |
| ناظم | برج نرائن ورما | مثنوی پھول نامہ | ۲۶۱ |
| رفیق | سلامت علی | غزنی نامہ | ۲۶۹ |
| مسلم | حکیم حافظ بشیر محمد خاں صاحب | ہندوستانی شاہنامہ | ۲۷۶ |
| میر ایوب علی علوی | | مثنوی یادِ علوی | ۲۷۹ |
| ناز | نانک چند | ۱۔ مثنوی ظفر نامہ | ۲۸۳ |
| | | ۲۔ وچتر ناٹک | ۲۹۱ |
| سریر | سید محمد عباس | شاہنامہ ہند | ۲۹۷ |
| گوکل چند نارنگ | | ۱۔ مثنوی شہید حقیقت رائے | ۳۱۰ |
| | | ۲۔ ستیوں کا شراپ | ۳۱۶ |


Marfat.com

| | | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| | | | ۳۲۲ |
| | | | ۳۲۴ |


## اختتامیہ :- چند تاریخی مثنویوں کی فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| راغب | محمد جعفر خاں | فتح نامہ | ۳۲۴ |
| بنیاد | مرزا بنیاد | جنگ نامہ | ۳۲۴ |
| اکرم | مولوی اکرم محمد | جنگ نامہ | ۳۲۵ |
| اسیر | میر گلزار علی | سوزِ عشق | ۳۲۵ |
| سحر | شیخ امان علی | تعریفِ تخت نشینی نواب واجد علی شاہ اختر | ۳۲۵ |
| عاشق | نواب محمد رضا خاں | رشکِ ماہِ تمام | ۳۲۶ |
| عیش | شیخ فدا علی | اشکِ مسلسل | ۳۲۶ |
| خوشتر | منشی جگناتھ سری واستو | را مائین | ۳۲۷ |
| امیر مینائی | امیر احمد | ۱- در بیان جشن مسند نشینی نواب کلبِ علی خان | ۳۲۸ |
| | | ۲- در بیان خلعت پوشی نواب کلبِ علی خان | ۳۲۸ |
| | | | ۳۲۸ |
| شایاں | طوطا رام | مہابھارت | |
| جمنا داس تھارگو | | جنگ روس و جاپان | ۳۲۹ |
| رواں | جگت موہن لال | نقدِ رواں | ۳۲۹ |
| زبیر | مرزا محمد رئیس | دُرِ شہوار | ۳۳۰ |
| جعفر ملیح آبادی | | سنگ و آہنگ مجموعہ کلام | ۳۳۰ |
| کتابیات | | | ۳۳۲ |


Marfat.com

# انتساب

اُن عظیم شخصیتوں کے نام

جو

اُردو ادب سے بے لوث محبت کرتے ہیں

اور

اُردو ادب کے گنج ہائے مخفی کی تحقیق

کو فرضِ مقدم سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

# احوالِ واقعی

نام :- کُندن لال مدان۔
تخلص :- کُندنؔ

کُندن لال کا تعلق تونسہ شریف کے مردم خیز خطّے سے ہے جو صوفیا کا مسکن تھا اور جس کی خاکِ پاک سے جیّد ہستیاں پیدا ہوئیں۔ کُندن لال تونسہ شریف کے قریب کوٹ قیصرانی میں یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے، ان کے والد شری لیکھو رام مدان بلوچستان میں انتظامیہ کے رکن تھے۔ اور خوش حال زندگی بسر کرتے تھے۔ کُندن لال نے آزادی کے بعد بی۔ اے تک تعلیم دہلی کالج اجمیری گیٹ میں حاصل کی جسے اب ذاکر حسین کالج کہا جاتا ہے۔ ایم۔ اے انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں کیا۔ اس کے بعد اُردو میں تاریخی مثنویات پر تحقیق کرنے کے لئے ایم۔ لٹ (دہلی) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۰ء میں انہیں ایم۔ لٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔ بعد میں تاریخی مثنویوں پر تحقیقی و تنقیدی موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ مگر بروقت پی۔ ایچ۔ ڈی مکمل نہ ہو سکی۔ ایک عرصہ تک تحقیقی کام رُک گیا مگر ادب کے شغف نے دوبارہ تحقیقی و تنقیدی کام کی طرف مُلتفت کیا، اور ازسرِ نو کام پر کمربستہ ہوا جس کا نتیجہ قارئینِ کرام کے سامنے ہے۔

تصانیف :- (۱) ارمغانِ کُندن، مجموعۂ کلام، جس میں غزلیں، نظمیں، تضمین، قطعات اور ایک مثنوی "لذّتِ عشق" ہے۔ یہ کلام ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۶ء تک کے کلام کا انتخاب ہے۔

(۲) مثنوی لذّتِ عشق (ہندی)

(۳) رباعیاتِ اختر۔ مرتبہ :- کُندن لال کُندنؔ

(۴) تاریخی مثنویاں، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

زیرِ طبع :- (۶) فنِ شاعری، جلد اوّل۔ جلد دوم ـ انتخابِ کلام کُندن لال کُندنؔ (ہندی) وغیرہ۔

ارمغانِ عروض۔ چون آہنگوں پر مشتمل رباعیاں (زیرِ طبع)

Marfat.com

# پیش لفظ

از

## (پدم شری) پروفیسر گوپی چند نارنگ

اُردو مثنوی تاریخ ادب اُردو کا ایسا پہلو ہے جس کی بوقلمونی اور تنوع اہلِ نظر کو ہمیشہ دعوتِ فکر دیتی رہی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر میدان وسیع ہے، اُسی قدر کم توجہ اس کو نصیب ہوئی ہے غزل کی اکثریت اور خوبیاں برحق، لیکن کسی بھرپور شعری روایت کا تصور بیانیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ مثنوی سے بے توجہی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو بیانیہ روایت داستانوں اور مثنویوں کے عہدِ شباب میں اپنے عروج کو پہنچی تھی، انیسویں صدی کے نمٹتے نمٹتے وہ ناول اور فکشن کی روایت میں تبدیل ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کچھ مدت کے بعد اُردو تحقیق کا سفر شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے آتے آتے صنفِ مثنوی طویل بیانیہ کی دُنیا سے نکل کر مختصر نظم گوئی کے تصرف میں آچکی تھی۔ پس اس کا نظر انداز ہونا کسی حد تک فطری بھی تھا۔ درسی ضرورت کی کچھ کتابیں البتہ مثنوی کے بارے میں لکھی جاتی رہیں۔ لیکن علاوہ کوئی سنجیدہ بحث مثنوی کے حوالے سے نہیں اٹھائی گئی۔ البتہ ڈاکٹر گیان چند جین نے صنفِ مثنوی کے آغاز و ارتقا پر جامع کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۵۵ء میں راقم الحروف نے ایم۔ اے کر لینے کے بعد جب پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام کا منصوبہ بنایا تو طے کیا کہ اُردو زبان و ادب جو دو تہذیبوں کے سنگم کی دین ہے اور جو ثقافتی اشتراک کی بہترین نمائندگی کرتا ہے اس کی تہذیبی جڑوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستانی ذہن اور مزاجِ عامہ سے اُردو کا جو شعوری اور لاشعوری رشتہ ہے اس کا معروضی مرقع سامنے آئے۔ یہ کام چار برس کے بعد ۱۹۵۹ء میں مکمل ہوا۔ اسی کام کے دوران اور اس کی ایک شق کے طور پر مجھے اُردو مثنویوں کی ہندوستانی بنیادوں سے دلچسپی

Marfat.com

پیدا ہوئی۔ اس وقت میرے سامنے اُردو مثنویوں پر کسی جامع کام کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ لیکن جیسے جیسے اس راہ پر آگے بڑھا مجھے احساس ہوا کہ اس موضوع کے کئی پہلو کئی ابعاد ہیں (جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب کے مقدمے میں کیا ہے) مجبوراً موضوع کی تحدید کے لئے میں نے فقط ایک گوشے کو چُن لیا اور صرف قصے کہانیوں کے ہندوستانی مآخذ پر توجہ کرنے کی بیش از بیش سعی کی۔ اور دوسری جہات کو چھوڑ دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان تینتیس ۳۳ برسوں میں گنگا اور سندھ میں بہت پانی بہہ گیا ہے۔ کئی کتابیں منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ڈگریوں کے لئے آئے دن تحقیقی مقالات لکھے جاتے ہیں۔ لیکن اُردو مثنوی کے ثقافتی مطالبات میں ابھی بہت سے ایسے کھانچے ہیں، جنہیں بھرنا ابھی باقی ہے۔ زیرِ نظر کتاب جناب کندن لال کندنؔ کی برسوں کی محنت کا ثمر ہے تقریباً چوبیس پچیس برس پہلے ۱۹۶۶ء میں کندنؔ لالؔ اُردو میں ایم۔اے کرنے کے لئے دہلی یونیورسٹی میں میرے پاس آئے تھے۔ ایسی لگن اور وابستگی کی مثالیں بہت کم ہیں۔ آج کل لوگ کام سے پہلے اس کے فوائد کا حدود اربعہ ناپ لیتے ہیں۔ قدم بعد میں اُٹھاتے ہیں۔ نفع و نقصان کا گوشوارہ پہلے مرتب کر لیتے ہیں۔ کندن لال صاحب اس وقت بھی محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے، اور آج بھی اُسی محکمہ سے وابستہ ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش آئی ہو۔ وہ اُسی مستی و بے نیازی سے رہ وادیٔ خیال کو طے کرتے رہتے ہیں۔ اس بیچ انہوں نے اپنے شوق کی آبیاری کے لئے ایم فل بھی کر لیا، اور جب جب وقت ملتا رہا اُردو کی تاریخی مثنویوں پر کام بھی کرتے رہے۔ نہایت خاموش طبع انسان ہیں۔ برسوں جس شخص نے ملازمت کے بکھیڑوں اور ذاتی زندگی کے جھمیلوں میں علم کی جوت کو جلائے رکھا ہو، اس کی دل سوزی اور

Marfat.com

استواری مثال کا درجہ کیوں کر نہ رکھے گی۔ اس تحقیقی کام کے لئے انہوں نے کہاں کہاں کا سفر کیا اور کس کس در کی خاک چھانی اس کا کچھ اشارا انہوں نے اپنے مقدّمے میں کیا ہے۔ ان میں سے متعدّد مثنویاں ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں اور زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئیں۔ انہوں نے ایسی کئی نایاب مثنویوں کا حوالہ دیا جن کے ذکر سے ہماری تاریخیں خالی ہیں۔ یقیناً آئندہ کام کرنے والوں کو زیر نظر کتاب کی معلومات سے مدد ملے گی۔ کوئی تحقیقی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا' جتنا ان سے ممکن ہوا انہوں نے کر دیا۔ جتنا آنے والوں سے ممکن ہوگا وہ کام کو آگے بڑھائیں گے۔ مجھے یقین ہے اُردو کے ایک بے لوث خدمت گزار کے اس کام کو جو اس نے نہایت دل سوزی اور گہری محبّت سے کیا ہے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

گوپی چند نارنگ

۳۰.۱۱.۹۰

---

"تاریخی مثنویاں"

قطعۂ تاریخ اشاعت

تحقیق کی گئی تعمیری مثنویاں
اخلاق سے مزیّن تہذیبی مثنویاں
جذبوں میں دلنوازی مضموں ہیں دلپذیر
ہیں سرخوشی کی حامل تفریحی مثنویاں
دن رات ایک کر کے کندن نے جمع کی ہیں
عہدِ کہن نمایاں تمثیلی مثنویاں
تاریخ میں نے پوچھی ہاتف نے یہ ندا دی
کہہ دو "ادب نمایہ تاریخی مثنویاں"
۱۱۳ + ۱۸۷۸ = ۱۹۹۱

شاعرِ رومان حرخ چنیوٹی

# مقدّمہ

اُردو شاعری کے ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس میں ایسا کوئی بڑا رزمیہ وجود میں نہیں آیا جس کو ہم عالمی زبانوں کے ادب کے مقابلے میں تو کیا خود اپنے یہاں کی زبانوں کے بہترین رزمیوں مثلاً "رامائن" "مہابھارت" "پرتھوی راج راسو" کے ساتھ بھی رکھ سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کا دامن کسی اعلیٰ رزمیہ سے ابھی تک خالی ہے، لیکن اس کمی کو انیس و دبیر کے مرثیے اور حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام بڑی حد تک اور اُردو کی بعض اہم تاریخی مثنویاں اپنے محدود دائرۂ اثر کے باوجود کسی حد تک پورا کر دیتی ہیں اور اس اعتبار سے ان مثنویوں کی اہمیت دوسری اصنافِ سخن کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اُردو شاعری پر بہت سے الزاموں کے ساتھ یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس میں تاریخی حقیقت نگاری کا فقدان ہے اس لحاظ سے اُردو کی ان تاریخی مثنویوں کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جس میں تاریخی اور تہذیبی حقائق اور مخصوص معاشرتی اور ثقافتی رجحانات و عوامل کی عکاسی کی گئی ہے۔

یہ امر بھی بہت خوش آئند نہیں ہے کہ مثنوی جیسی اہم صنفِ سخن پر اُردو کے محققین، ناقدین اور مؤرخین نے وہ توجہ نہیں کی جس کی وہ مستحق تھی۔ اُردو ادب کے تمام قارئین کے لئے انگلیوں پر گنائی جانے والی چند بزمیہ مثنویوں کو چھوڑ کر برصغیر ہند میں اُردو مثنویوں کی مکمل فہرست بنانا بھی آسان نہیں ہوگا۔ حالی اور شبلی نے برسوں پہلے مثنوی کی افادیت اور اہمیت کا احساس دلایا تھا اور بزرگوں کی اِن ابتدائی کوششوں کے بعد اس بات کی بے حد ضرورت تھی کہ مثنویوں پر بڑے پیمانے پر کام شروع ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا البتہ آزادی کے بعد کچھ کام انفرادی طور پر شروع ہوا۔ یہ شروعات بھی نیک فال کی غماز ہے یعنی اس صنف کی طرف دھیان مرکوز ہوا صنفِ مثنوی پر ابتدائی تحقیقی و تنقیدی کام جلال الدین جعفری، عبدالقادر سروری

Marfat.com

اور امیر احمد علوی کا تھا۔ آزادی کے بعد گوپی چند نارنگ گیان چند جین، علی جواد زیدی، فرمان فتح پوری اور سید عقیل رضوی نے اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور بہت بڑی کمی کو پورا کیا فرمان فتح پوری نے دراصل "اُردو میں منظوم داستانیں" پر کام کیا۔ تمثیلی مثنویوں کی طرف جناب منظر اعظمی نے "اُردو میں تمثیل نگاری" لکھ کر اہلِ فکر کو متوجہ کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویوں پر" سب سے پہلے کام کیا اور اُردو مثنویوں کے ہندوستانی رشتوں کی طرف اہلِ نظر کو توجہ دلائی علیحدہ علیحدہ چند مشہور و معروف بزمیہ اور تاریخی مثنویوں پر اور مثنوی نگاروں پر بھی کام ہوا، اُردو ادب کی تاریخوں نیز تذکروں کے علاوہ چند تنقیدی مضامین اور کتابوں میں اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچا گیا۔ پھر بھی اس متنوع اور وسیع موضوع پر ان کتابوں میں اس صنف کے تمام پہلوؤں کا احاطہ تو نہیں اجمالی جائزہ ہی ممکن ہو سکا۔ اس صنف کے سرمائے کے بوقلموں اور مختلف الجہات موضوع پر بڑی جانفشانی اور لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

صنفِ مثنوی کی طرف ایک عرصے تک تحقیق و تنقید کا خیال نہ جانے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ نقادوں کے ذہنوں پر غزل کے جادو کا اس طرح طاری رہنا ہے کہ دوسری اصنافِ سخن کو وہ تحقیقی و تنقیدی حق نہیں مل پایا جس کی وہ مستحق تھیں۔

جہاں تک مثنوی کے تاریخی پہلو کا تعلق ہے اس کا حق ہنوز سب سے کم ادا ہوا۔ دکن اور شمالی ہند کی دو چار تاریخی مثنویوں پر انفرادی طور پر تھوڑا کام ہوا مگر مجموعی طور پر یہ پہلو تشنہ ہی رہا، یہ ناچیز کوشش اس سمت میں پیش رفت کا پہلا قدم ہے۔ مجھے امید ہے کہ اُردو ادب سے محبت رکھنے والے محقق بڑے بڑے سرکاری و نیم سرکاری کتب خانوں اور اچھی نوعیت کے نجی کتب خانوں تک رسائی حاصل کر کے مثنوی کے بیش قیمتی دفینے اور گمنام مثنوی نگاروں کو منظرِ عام پر لانے کے مبارک کام میں مشغول ہوں گے جس سے اُردو ادب اور زبان کی اچھی خدمت ہو سکے گی۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے انفرادی طور پر تو کچھ کام ہوا مگر لمحۂ فکریہ ہے کہ آج تک اُردو ادب پر اجتماعی تحقیق کا کام خواہ وہ ابتدائی مرحلے پر ہی کیوں نہ ہو شروع نہیں ہو لا اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اُردو اکادمیوں، یونیورسٹیوں اور اُردو سے متعلق دوسرے بڑے

Marfat.com

اداروں کو منظم طریقے سے ابتدا کرنی چاہیئے تھی جو نہیں ہو پا رہی ہے۔ انفرادی طور پر یہ بہت مشکل کام ہے، پھر بھی اس کام کو انجام دینے کے لئے اس سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ بوند بوند سے تالاب بھرتا ہے۔ امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ صنف مثنوی کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر یقیناً ایک نہ ایک دن تحقیقی و تنقیدی کام منصوبہ بند اجتماعی طریقہ پر بھی ہو گا۔

طالبِ علمی کے زمانے میں "اردو کی تاریخی مثنویاں" کے موضوع پر مجھے مختصر اور متعین وقت میں مقالہ پیش کرنا تھا اس کی تیاری کے لئے صرف دہلی یونیورسٹی کے کتب خانے ہی سے استفادہ کر کے مقالہ پیش کر سکا اور ایم۔ لٹ (مل) کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا بعد میں مذکورہ موضوع پر تفصیل سے تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کے لئے مجھے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے بھی یہی موضوع دیا گیا۔ مگر افسوس یہ کام مقررہ وقت پر نہیں پیش کر سکا، لیکن اس دشت پیمائی میں کچھوے کی چال کی طرح گامزن رہا۔ وقت اس کام کو سرانجام نہ دینے میں میری شخصی کوتاہی کو اتنا دخل نہیں جتنا وقت کی ستم ظریفی کو دخل ہے۔ اتفاق سے میں محکمۂ ڈاک سے منسلک ہوں، جس کے غیرادبی ماحول کے علاوہ بے حد ذہنی اور جسمانی مشقت سے فرصت پانے کے بعد چند لمحے نکال کر اپنے ذوق کی تشنگی کو بجھانے کے لئے آہستہ آہستہ کام کرتا رہا۔ اس سلسلے میں مجھے رضا لائبریری رامپور، خدابخش اورینٹیل لائبریری پٹنہ، نیشنل لائبریری اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، جامع مسجد لائبریری بمبئی، سالار جنگ میوزم، کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو، اسٹیٹ لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد وغیرہ کے کتب خانوں کی خاک چھاننا پڑی۔ چونکہ دکنی اردو کی تاریخی مثنویوں کے مخطوطات زیادہ تر سالار جنگ میوزم اور حیدرآباد آرکائیوز کے آفس میں موجود ہیں اس لئے مجھے حیدرآباد تین چار بار جانا پڑا۔ وقت اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے ایک بار جب دکنی اردو کی تاریخی مثنویوں پر تقریباً کام مکمل ہو چکا تھا تو سارا مسودہ حیدرآباد سے واپسی کے سفر میں گم ہو گیا، میں اتنا مایوس ہوا کہ ایک عرصہ تک تحقیقی کام بالکل چھوڑ بیٹھا۔ مگر ہمتِ مرداں مددِ خدا پھر کافی عرصے کے بعد اردو ادب کے شغف نے تحقیقی و تنقیدی کام کی طرف ملتفت کیا اور ضمیر نے کچھ ایسا جھنجھوڑا کہ از سرِنو کام پر کمربستہ ہوا جس کا نتیجہ قارئین کرام کے سامنے ہے۔

Marfat.com

آخر میں ان بزرگ حضرات کا بے حد مشکور ہوں جن کی عنایتوں اور بیش قیمتی مشوروں نے مجھے اپنے موضوع سے متعلق مواد فراہم کرنے میں مدد کی جس کے نتیجے میں میرا تنقیدی و تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی شفقت سے فروری ۱۹۷۰ء میں میری اس وقت رہنمائی کی جب میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں کتب خانہ کی کتابوں کی ورق گردانی کے لئے گیا تھا موصوف کے دولت خانہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد میں م۔ ع۔ علوی التھانوی ثم حیدرآبادی نے مثنوی "یادِ علوی" کے قلمی نسخے سے جو موصوف کی ذاتی ملکیت ہے میرے موضوع سے متعلق مواد نقل کر کے فراہم کیا۔ جناب محمد عمر خاں مدرس نے جنگ جیجل گوڑہ سے متعلق مقدمہ سراج الابصار سے ماخوذ مثنوی "ناطق" اور مثنوی "اخبار شہیداں" از عرفان کے اقتباسات نقل کر کے مواد فراہم کیا۔

علاوہ ازیں مذکورہ کتب خانوں کے منتظمین کا بھی میں بے حد مشکور ہوں جنہوں نے موضوع سے متعلق مطلوبہ مطبوعات و مخطوطات کی فراہمی نہایت خوش مزاجی اور خندہ پیشانی سے کی اور بعض اوقات مخطوطات شناسی میں بھی مدد کی مذکورہ بالا حضرات کے شکریئے کے لئے میرے پاس موزوں الفاظ نہیں ہیں۔

اپنے اساتذہ میں محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر شریف احمد کا بطورِ خاص ممنون ہوں جن کی علمی شغف اور لگن سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا میں پروفیسر فضل الحق صاحب صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کا بھی ممنون ہوں جن کی نگرانی میں میں نے کام شروع کیا تھا اور جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے میری حوصلہ افزائی کی اور تحقیق کے آداب سے آگاہ کیا موصوف کے مشوروں کو مشعلِ راہ بنا کر ہی میں کام کرتا رہا۔

تحقیقی کام میں حرفِ آخر کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تاریخی مثنویوں پر یہ ابتدائی کام ہے اس لئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ کچھ تاریخی مثنویاں اچھے نجی کتب خانوں میں یا بڑے بڑے سرکاری یا نیم سرکاری کتب خانوں میں مطبوعات یا مخطوطات کی شکل میں موجود ہوں جن کا تذکرہ اس مقالہ میں نہ آیا ہو۔ اربابِ فکر و نظر ان کی نشاندہی کر کے مشکور و ممنون فرمائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ میرے اس ابتدائی کام میں جہاں کہیں غلطیاں راہ پا گئی ہوں گی وہاں میری اصلاح کریں گے۔ ایسی غلطیوں، کمیوں، اور کوتاہیوں کا پورا ازالہ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں کیا جائے گا۔

کندن لال کندن

Marfat.com

# صنفِ مثنوی

**مثنوی کی تعریف** اصنافِ سخن میں مثنوی نظم کی وہ شکل ہے جس کا ہر شعر باعتبارِ ردیف و قافیہ جداگانہ اور باعتبارِ مضمون ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ عموماً مثنوی میں قافیہ ہی ہوتا ہے۔ اور یہ قافیہ بھی ہر شعر کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ لیکن پوری مثنوی ایک ہی بحر میں ہوتی ہے۔ دو ہم قافیہ الفاظ کے التزام کی وجہ سے اس کا نام مثنوی قرار پایا اس لئے مثنوی کے معنی "دو دو کیا گیا" کے ہیں۔ اشعار میں تسلسل کا ہونا ضروری ہے اشعار کا یہ باہمی ربط و تسلسل مثنوی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ مثنوی قصیدے کے برعکس نہ صرف اشعار کی تعداد کی پابندی سے بالاتر ہے بلکہ غزل کی طرح ہر شعر میں ردیف و قافیہ کی قید سے مُبّرا ہے۔ بقول نواب امداد امام اثر "ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی"[۱] مضامین کے لحاظ سے جس طرح غزل، مرثیہ، قصیدہ، واسوخت، ریختی ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہیں اس طرح بہ لحاظِ موضوع مثنوی میں بھی امتیاز پایا جاتا ہے۔ قدما کے نزدیک مثنوی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں خارجی یا بیانیہ اور اُس کے متعلقات کی مرقع کشی کی جائے اور دوسری وہ جن میں داخلی غنائی یا جذبے کی شاعری ہو جہاں خارجی یا بیانیہ شاعری کے لئے مثنوی کا جامہ پسند کیا گیا ہے وہاں غنائی شاعری کیلئے غزل کا شبنمی پردہ بہترین سمجھا گیا ہے۔ دراصل مثنوی نہ صرف مناظرِ قدرت کی تصویر کشی پر اکتفا کرتی ہے اور نہ واقعات کے ربط و تسلسل پر قانع ہے۔ بلکہ

---

[۱] اثر امداد امام کی کاشف الحقائق حصہ دوم کارونیشن پریس لکھنؤ ص ۲۹۷

Marfat.com

کیفیات و جذبات اور احساسات کی ترجمانی کر کے غزل کے دائرے میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ احسن مارہروی کا فرمانا ہے :-

" جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں اُن کی اتنی گنجائش کسی صنفِ سخن میں نہیں۔ زندگی کے تمام سوانح رزمیہ ہوں یا تاریخی، عشقیہ ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا افسانہ غرض کہ تخیّل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے"۔ [۱]

اور ڈاکٹر گیان چند جین کا بھی قول ہے :-

" اگر کسی مثنوی میں محض خارجی واقعات ہوں تو وہ منظوم تاریخ یا رپورتاژ سے زیادہ دقیع نہ ہوگی اگر وہ محض شدتِ جذبات کی بارانی کرے تو وہ ایک طویل غزل بن کر رہ جائے گی اچھی مثنوی میں کم و بیش دونوں پہلو ہوتے ہیں۔ مثنوی کی فوقیت اس امر میں ہے"۔ [۲]

یہی وجہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے سمونے کے لئے مثنوی کے علاوہ اور کوئی دوسری صنفِ سخن ان معاملات کا احاطہ نہیں کرسکتی اور فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر اس لحاظ سے فوقیت دی گئی ہے۔

**دیگر اصنافِ سخن اور مثنوی**

جملہ اصنافِ سخن میں صرف مثنوی ہی سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے جس میں پابندیاں کم سے کم اور آزادی زیادہ سے زیادہ ہے۔ فنّی حیثیت سے بھی عموماً سبھی اصنافِ سخن میں قافیہ کی پابندی ضروری ہے۔ غزل اور قصیدہ از مطلع تا مقطع اس پابندی کی بدولت مسلسل مضامین کے نظم کرنے میں ساتھ نہیں دیتے بلکہ ان کا دائرہ بھی

---

[۱] احسن مارہروی مقدمہ کلیاتِ ولی طبع اوّل ص ۷۷

[۲] جین گیان چند اردو مثنوی شمالی ہند میں۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ طبع اوّل ص ۵۵-۵۶

Marfat.com

محدود ہے۔ جدید غزل بے شک حیات و کائنات کے مسائل چھو لینے کی کوشش کرتی ہے لیکن رمز و کنایہ کی مخصوص صفت کی وجہ سے مادیات اور اس کے متعلقات کی واضح تصویر کشی نہیں کر پاتی۔ البتہ تغزل خمریات اور وارداتِ عشق کی ترجمان ہے ورنہ غالب جیسا عظیم غزل گو شاعر یہ کہنے پر مجبور نہ ہوتا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل  کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

قصیدے کی کائنات غزل کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے اس میں مختلف اور مسلسل موضوعات قلم بند کئے جا سکتے ہیں۔ مگر قصیدہ کا بیشتر اثاثہ مدح ہجو اور شکایتِ روزگار پر مشتمل ہے اور اسی محور کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔ جذبات نگاری کے لئے جس لطیف پیرائے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے قصیدے کی بلند آہنگی اس سے نباہ نہیں کر سکتی اس کے علاوہ قافیہ کی پابندی اشعار کی تعداد کو بھی متعین کر دیتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ دو سو اشعار پر مشتمل قصیدہ مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے قصیدہ کی طوالت سامعین یا ممدوح کی اکتاہٹ کا سبب بن سکتی ہے۔ علاوہ ازیں قصیدہ میں واقعاتی عنصر بہت کم ہوتا ہے۔ اس لئے مدح میں شاعر اپنا جوہر، تخیل کی بلند پروازی میں تو صرف کر سکتا ہے لیکن حقیقت نگاری کو جو جزئیات کی تفصیلات کی متقاضی ہوتی ہے زیادہ نباہ نہیں سکتا۔

غزل اور قصیدہ کے مقابلہ میں صنفِ مرثیہ زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ مثنوی کی طرح مرثیے میں اشعار کی کوئی قید نہیں لیکن اس وسعت اور آزادی کے باوجود کچھ پابندیاں ایسی بھی ہیں جو کہ مرثیہ نگار بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ قصیدہ کی طرح مرثیہ بھی سننے سنانے کے لئے لکھا جاتا ہے لہٰذا اس کی طوالت صرف دو تین گھنٹے کی نشست کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ پھر مرثیہ کا مقصد مجلس پر رقت طاری کرنا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مرثیہ اکثر ایک ہی تاثر کے گرد گھومتا ہے، اور وہ ہے مہتم بالشان واقعۂ کربلا۔ یہ سانحہ اپنی جگہ عظیم سہی لیکن آفاقی شاعری کے تمام آثار چڑھاؤ یا تجربات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ مرثیہ میں واقعہ کربلا کے کسی ایک پہلو پر طبع آزمائی تو کی جا سکتی ہے لیکن شاہ نامہ کی

Marfat.com

طرح کیکاؤس اور افراسیاب کی سرفروشانہ مہمات اور جنگی عزائم کی جیتی جاگتی تصویریں پیش نہیں کی جا سکتیں۔

غزل، قصیدہ اور مرثیہ کے علاوہ رباعی، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند اور اور دوسری اصناف میں بھی قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان اصناف میں مسلسل مضامین قلمبند کرنے اور مختلف مضامین کی وسعت سمونے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں مثنوی میں ایسی پابندیاں کم ہیں جس سے اس کی وسعت میں رکاوٹ پیدا ہو.... نہ قصیدے اور مرثیے کی طرح اس کے اجزائے ترکیبی کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ قافیہ کی نیرنگی پڑھنے والوں کو گراں گزرتی ہے۔ پھر اثر جذبات روزمرہ اور محاورہ کی برجستگی گھلاوٹ اور نیرنگی واقعات پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں ہر قسم کے جذبات، خیالات، احساسات، شرم و حیا، رشک و حسد، کینہ و بغض، غیظ و غضب، جذبۂ ایثار و محبت اور مامتا وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔

اس بحث کا یہ مطلب نہیں کہ مثنوی عیوب یا خامیوں سے پاک ہے، اگر یہ بات ہوتی تو اس صنف کو زوال نصیب نہ ہوتا۔ یکسانیت مثنوی کی موت ہے۔

**مثنوی کے اوزان** فارسی میں باوجود مثنویوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہونے کے نظامی سے پہلے مثنوی کے اوزان مقرر نہیں ہوئے تھے۔

نظامی نے پانچ مختلف بحروں میں پانچ مختلف مثنویاں لکھیں، جن کی پیروی بعد تک ہوتی رہی مولوی جلال الدین احمد، تاریخ مثنویات اردو میں رقمطراز ہیں:۔

"امیر خسرو کی ایجاد پسند طبیعت نے نظامی کے پانچ وزنوں پر تین وزن اور بڑھائے۔" [۱]

مگر گیان چند جین اس سے متفق نہیں وہ "اردو مثنوی شمالی ہند میں"

---

[۱] مولوی جلال الدین احمد۔ تاریخ مثنویات اردو۔ ص ۲۰

Marfat.com

لکھتے ہیں، "خسرو نے محض نظامی کے اوزان میں مثنویاں لکھیں، لیکن بعد میں ..... پانچ اوزان پر مزید دو اوزان کا اضافہ ہوا۔" [۱]

اُردو مثنویوں میں بھی انھی اوزان کی پابندی کی گئی۔ انشاء اللہ خان انشاؔ نے دریائے لطافت میں ان اوزانوں کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان کی خصوصیت بھی درج کردی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ [۲]

۱۔ بحر سریع مسدس مطوی موقوف۔ مفتعلن مفتعلن۔ فاعِلات/ فاعلن

مثال میر تقی میرؔ کی دریائے عشق سے عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال ؛ ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

۲۔ ا۔ بحرِ ہزج مسدس مقصور یا محذوف۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیل/ فعولن

مثال مثنوی۔ آصف نامہ۔ از وفا سے

ہے پہلی جلد سے تا جلد ہفتم        دکن کا ایک تاریخی ہے قلزم

۲۔ ب۔ بحر ہزج مثمن سالم۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔

سرتیر۔ شاہنامہ ہند سے

کہیں تلواریں چلتی تھیں کہیں خنجر برستے تھے ؛ چمکتی بجلیوں کی بارشوں میں سر برستے تھے

۳۔ بحرِ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف۔ مفعول مفاعلن فعولن/ مفاعیل

مثال دیا شنکر نسیم کی، مثنوی گلزارِ نسیم سے

جُھک جُھک کے بدن چرائی آئیں.        رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

۴۔ بحرِ خفیف مسدس مخبون مقطوع۔ فاعلاتن۔ مفاعلن۔ فعلن

مثال۔ مرزا شوق۔ مثنوی زہرِ عشق سے

ذکر میرا سُن کے نہ رو دینا        میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

۵۔ بحرِ متقارب مثمن مقصور یا محذوف۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعول/ فعل

---

[۱] جین گیان چند اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ طبع اوّل۔ ص ۶۳

[۲] ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ص ۶۳-۶۴

Marfat.com

مثال میر جعفر زٹلی کی مثنوی "ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالمگیر بادشاہ غازی" ے

زہے شاہ اورنگ دھانک بلی — کہ در ملکِ دکن پڑی کھل بلی

"علی نامہ" از نصرتی۔

دونوں بھار ہم تول تھے یوں اگر — سیوا[1] اُن میں پاسنگ کا تھا پتھر

۶۔ بحر رمل مدّس مقصور یا محذوف۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعِلات

مثال دلاور علی دانش، مثنوی، تذکرہ منظوم "سلاطین دکن" ے

اس دکن میں چھ صوبوں کا شمار — اور ہے تاریخوں سے یہ آشکار

۷۔ بحر رمل مدّس مخبون مقطوع۔ فاعلاتن۔ فعلاتن۔ فعلن

مثال مومن خاں مومن کی "مثنوی قول" ے آس ملنے کی نہیں مرنا محال ٭ ہر طرح سے ہم ہیں محرومِ وصال

۸۔ بحر متدارک مثمن یا مقطوع / مخبون۔ فَعْلُنْ فَعِلُنْ۔ فَعِلُنْ۔ فَعِلُنْ

مثال۔ ا۔ میر تقی میر کی مثنوی جوشِ عشق ے

یار سے سفر کا مائل ہو کر — حُبِّ وطن کو جی سے دھو کر

مثال۔ ب۔ بحر متقارب مثمن اثرم مقبوض۔ فعلُ فعولن۔ فعلُ فعولُن
اثرم مقبوض مقبوض محنق سالم

مومن خاں مومن "مثنوی تف آتشیں" ے

قید کہوں کیا اپنے گھر کی — کا نپتی جاوے باد سحر کی

۹۔ بحر متقارب مثمن اثلم۔ فعلن۔ فعولن۔ فعلن۔ فعولن۔ حالی کی مثنوی "کلمۃ الحق"

آٹھویں بحر متقارب کے تیئس ۲۳ اوزان ایسے ہیں جو اس کے ساتھ مل کر آتے ہیں اگرچہ ان کے ارکان میں خفیف سا فرق پایا جاتا ہے مگر یہ سب ایک ہی ہیں اور ان کا آپس میں میل جول جائز ہے۔

مندرجہ بالا بحروں میں دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں زیادہ مقبول ہیں۔

---

[1] مراد شیوا جی مرہٹہ۔

Marfat.com

مگر ان بحروں کی پابندی برتی نہیں گئی۔ سعادت یار خاں رنگین ایسے شخص ہیں جنہوں نے اجتہاد سے کام لے کر سات کی بجائے گیارہ بحروں میں طبع آزمائی کی اور اس روایت شکنی کا بجا طور پر ان کو فخر حاصل ہے۔ رنگین کے دو ایجاد کردہ اوزان درج ذیل ہیں۔

۱۰۔ مفتعلن۔ فاعلن۔ مفتعلن۔ فاعلن

۱۱۔ فعلن۔ فعلن۔ فعلن۔ فع (یا) فعلن۔ فعلن۔ فاع۔ فعل

اس کے بعد عہدِ حاضر سے پہلے مشاہیر میر۔ محمد حسین آزاد۔ شوق قدوائی مرزا سودا اور حفیظ جالندھری کے علاوہ کسی نے بھی روایت شکنی نہیں کی۔ روایت پرستوں کا کہنا ہے کہ سات بحروں کے علاوہ مثنوی کسی اور بحر میں لکھی نہیں جا سکتی۔ لیکن روایت شکن ارباب نے کبھی بھی اس پابندی کی پروا نہیں کی اور ان کی جدت پسند طبیعت نے جدھر بھی ذوق کی دل بستگی دیکھی اس طرف کا رُخ کیا۔ پنڈت کیفی کی رائے ہے:۔

"باہر والوں کے بڑھائے ہوئے یہاں یہ کہہ گئے ہیں کہ فلاں وزن یا بحر رزم کے لئے اور فلاں بزم وغیرہ کے موضوع کے لئے ہیں مگر یہ قید پابندی کی مستحق ہے نہ اس کی پابندی کی گئی۔ میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اس بحر میں ہے جسے رزم کے لئے مخصوص کیا گیا تھا اس فرمانِ تخصیصی کی خلاف ورزی کا کوئی خراب نتیجہ اس مثنوی میں نہیں پایا جاتا" ؎[1]

بلکہ ثابت کر دیا کہ کوئی بحر کسی خاص موضوع کے لئے مقرر نہیں۔ مولوی جلال الدین احمد کی رائے ہے:۔

"یہ کوئی ضروری اور لازمی امر نہیں کہ ان مستعملہ اور مروّجہ اوزان کے علاوہ کسی دوسرے وزن میں مثنوی لکھنا ناجائز سمجھا جائے، البتہ

---

[1] پنڈت کیفی کیفیہ ص ۲۹۹

130139

Marfat.com

جن وزنوں کو مخصوص کیا گیا ہے ان میں یہ نسبت دوسرے اوزان کے دلکشی اور ترنم اور موزونیت زیادہ ہے" [1]

ڈاکٹر گیان چند جین کی بھی یہی رائے ہے :-

" قصیدہ، غزل اور مرثیہ ایسی اصناف ہیں جن کا موضوع کم و بیش متعین ہے۔ اگر ان کے لئے کسی وزن کی تخصیص نہیں تو مثنوی جیسی لامحدود صنف کے لئے بحر کی تحدید کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کوئی ایک وزن مثلاً مفعول فاعلات۔ مفاعیل۔ فاعلن۔ غزل قصیدہ اور مرثیہ جیسی مختلف النوع اصناف کے لئے نازیبا نہیں تو مثنوی کے لئے بھی کیوں ممنوع ہے" [2]

لیکن ان سات بحروں کے علاوہ حفیظ جالندھری کا " شاہنامہ اسلام" رسوا کی " نو بہار" حفیظ کی " شام رنگیں" حالی کی کلمتہ الحق" اقبال کی " صبح کا تارا" جیسی مثنویاں جن اوزانوں میں لکھی گئی ہیں ان میں کونسی ایسی مثنوی ہے جو دلکشی سے محروم ہے۔

**مثنوی پر تنقید**

دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں اُردو مثنوی کی عمر خاصی طویل ہے مگر اس پر نظریاتی یا اصولی تنقید بہت کم ہوئی ہے۔ اس پر تنقیدی نظر اس وقت سے پڑنے لگی تھی جب یہ اپنے عروج کی بلندیوں کو چھونے کے بعد مائل بہ انحطاط یا روبہ زوال تھی۔ اس وقت تنقید کے دو نظریئے تھے۔ ایک نظریاتی دوسرا اصولی، ایک مثنویوں کے ظاہرا اور باطنی حُسن کا شیدائی تھا اور اس کے عیوب سے نظریں چُراتا تھا۔ دوسرا ان عیوب کی نشاندہی کر کے خوش ہوتا تھا پہلا نظریہ شبلی کا تھا جو قدیم قدروں کے پرستار تھے۔ دوسرا حالی کا تھا جو قدیم شاعری کی فرسودگی کے مخالف یا ناقد تھے۔ حالی اصولی تنقید کے موجد ہیں " مقدمہ شعر و شاعری" میں جہاں انہوں نے غزل' مرثیہ' قصیدہ وغیرہ کے پرکھنے

---

[1] مولوی جلال الدین احمد۔ تاریخ مثنویات اُردو۔ ص ۲۱

[2] جین ڈاکٹر گیان چند۔ اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔ طبع اوّل۔ ص ۶۸

Marfat.com

کے لئے اصول بنائے ہیں وہاں مثنوی کے لئے چند اصول متعین کئے ہیں۔ حالی کے بعد شبلی نے "شعر العجم" جلد چہارم میں مثنوی پر تنقیدی نظر ڈالی۔ ان ناقدین کے بعد طویل عرصہ تک مثنوی پر قلم اٹھانے والوں نے ان اصولوں کی پیروی کی" شعر الہند" میں مولانا عبد السلام ندوی نے حالی اور شبلی کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا۔ مولوی جلال الدین نے شبلی کے بنائے ہوئے اصول تاریخ مثنویات اُردو میں پیش کئے۔

حالی نے اُردو مثنوی پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے درج ذیل اصول قائم کئے ہیں۔ [۱]

۱۔ "ربطِ کلام ہو جو کہ مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے"

۲۔ "جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے"

۳۔ "انتہا درجہ کا مبالغہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ جو کسی چیز کی تعریف یا مدح یا ذم میں کہا جائے۔ گو وہ اس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر صادق آسکتا ہو، نہ یہ کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی مصداق نہ ہو"

۴۔ "مقتضائے حال کے مطابق کلام ایرا د کرنا چاہیئے خاص کر قصے کے بیان میں ایسا ضروری ہے"

۵۔ "جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا کسی مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً و معناً نیچر اور عادت کے موافق ایسی ہونی چاہیئے جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے"

۶۔ "قصہ میں ایسی بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے"

۷۔ "قصے کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو"

---

[۱] الطاف حسین حالی "مقدمہ شعر و شاعری" مرتبہ وحید قریشی۔ ص ۲۷۵

Marfat.com

۸۔ "قصے میں ان ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں، رمز و کنایہ میں بیان کرنا ضروری ہے"

حالی نے مندرجہ بالا آٹھ اصولوں کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اول یہ کہ اصول مثنوی سے کہیں زیادہ قصہ نگاری کے اصولوں کی بشارت دیتے ہیں۔ دوئم ان میں سے کچھ اصولوں کو مثنوی کے تنقیدی اصولوں میں جگہ نہیں دینی چاہیئے مثلاً چھٹا اور آٹھواں اصول کیونکہ ان کا تعلق قصہ سے ہے صنفِ مثنوی سے نہیں۔ سوئم اس میں کچھ اصول مثنوی سے کچھ زیادہ دوسری اصنافِ سخن کے لئے ہونے چاہئیں۔ چہارم ان میں سے کچھ اصول بھرتی کے ہیں، مثلاً پانچواں آنا جامع ہے کہ دوسرے تیسرے چوتھے اور ساتویں اصول کا بھی احاطہ کر لیتا ہے اس لئے ان کو علیحدہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ باوجود ان خامیوں کے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ حالی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے مثنوی پر تنقیدی نگاہ ڈال کر مثنوی کی تنقید کے لئے نیا باب کھولا۔

حالی کے بعد شبلی نے مثنوی کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور شعر العجم جلد چہارم میں درج ذیل اصول وضع کئے [۱]

(۱) حسن ترتیب

(۲) کیریکٹر

(۳) کیریکٹر کا اتحاد

(۴) واقعہ نگاری

الف ۔ "واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے کہ جس طرح ایک ماہر فن کرتا ہے، یعنی اس کی تمام اصل خصوصیات و جزئیات بیان کی جائیں"

ب ۔ "واقعہ نگاری میں جزوی باتوں کو نظر انداز نہ کیا جائے"

ج ۔ "واقعہ نگاری میں ایسی کوئی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے"

---

[۱] شبلی نعمانی "شعر العجم" جلد چہارم باہتمام حامد حسن علوی ۔ ص ۲۰۱ تا ۲۰۴

Marfat.com

شبلی نے مثنوی کے اصولِ نقد میں واقعہ نگاری کو تو جگہ دی مگر منظر نگاری اور جذبات نگاری کا ذکر نہیں کیا۔ کیریکٹر کا عنوان قائم کرنے کے بعد دوسرا عنوان کیریکٹر کا اتحاد قائم کرنا محلِ نظر ہے۔

مثنوی کی زبان اور اسلوبِ بیان کا کیا معیار ہونا چاہیئے، اس طرف شبلی نعمانی نے کوئی اشارہ نہیں کیا سب سے بڑھ کر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شبلی نے اپنے متعین کئے اصولوں کو بھی کام میں نہیں لیا اور شاہنامہ کی تنقیدی بحث میں الگ سے عنوان قائم کئے۔ شبلی کا مثنوی پر تنقیدی جائزہ ایک سرسری جائزہ ہے، حالی کی طرح شبلی نے تفصیل سے کام نہیں لیا۔

حالی اور شبلی نے مثنوی کی تنقید کے لئے اس وقت اصول مقرر کئے تھے جس وقت مثنوی نہ صرف لکھی جارہی تھی بلکہ اس کے بعد بھی لکھی جاتی رہی۔ ان اصولوں پر اس وقت عمل کرنا تو بڑی حد تک لازمی تھا۔ مگر آج کل جب مثنوی کا دور ختم ہو چکا ہے ہمیں ایسے پیمانے تیار کرتے ہوں گے جو یہ نہ بتائیں کہ مثنوی میں کیا ہونا چاہیئے بلکہ یہ باتیں کہ مثنوی میں کیا ہے اور کہاں تک مثنوی نگار نے واقعہ نگاری یا اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس ضمن میں گیان چند جین[۱] نے چند بنیادی باتوں کی طرف توجہ دی انہوں نے حالی اور شبلی کے اصولوں پر تنقیدی بحث کی اور ان کی خامیوں اور خوبیوں کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے حسبِ ذیل اصول مدوّن کئے۔

۱۔ حسنِ تعمیر

۲۔ زبان و بیان

۳۔ کردار نگاری

۴۔ منظر نگاری

۵۔ جذبات نگاری

---

[۱] جین ڈاکٹر گیان چند "اردو مثنوی شمالی ہند" انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ طبع اول۔ ص ۸۱-۸۶

Marfat.com

۶۔ ہمعصر تہذیب کی مرقع نگاری۔

**حسنِ تعمیر** ڈاکٹر گیان چند جین کا یہ پہلا اصول شبلی کے حسن ترتیب اور حالی کے ربط کلام کے علاوہ مثنوی نگار سے مثنوی کے واقعات جزئی بیانات میں تناسب و توازن کا بھی تقاضہ کرتا ہے۔ بیانیہ شاعری کے لئے ربط و تسلسل اور وحدتِ مستحسن ہیں۔ جن کی تعمیر و ترتیب محض داستانوں مثنویوں کے لئے لازمی نہیں تاریخی و رزمیہ مثنویوں کے لئے بھی لازمی شرط ہے۔ ہاں موضوع کے لحاظ سے مثنوی اگر داستان ہے تو پلاٹ مربوط اور گھٹا ہوا زیادہ بہتر ہے۔ تاریخی مثنویوں میں داستانوی مثنویوں کی طرح کوئی قصّہ یا افسانہ نہیں ہوتا بلکہ تاریخی واقعات ہوتے ہیں جنہیں تاریخی ترتیب کے ساتھ مصنّف کو بیان کرنا چاہیئے۔ اگر مثنوی صرف ایک تاریخی واقعہ پر منحصر ہے تو اس کا پلاٹ گھٹا ہوا ہونا چاہیئے۔ اگر تاریخی مثنوی کسی ملک یا ملک کے ایک حکمراں خاندان "کسی حکمراں خاندان کے صرف ایک فرمانروا کے عہدِ حکومت کا احاطہ کرتی ہے تو اس کے عہد میں جو واقعات رونما ہوئے ہوں ان کی عکاسی ضروری ہے اور ان اقدامات کا بالترتیب ذکر بھی مستحسن ہے۔ جو اس فرمانروا نے عہد کی فلاح و بہبود اور ملکی انتظامات یا اس کی سالمیت کے لئے کئے ہوں اور ہر ایسا واقعہ جس سے تاریخ متاثر ہوتی ہے نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے مصنّف کو واقعات کے توازن کا خیال رکھنا ہوگا۔ جس سے مثنوی کا حسنِ تعمیر برقرار رہے۔

**زبان و بیان** مثنوی کی خوبی اس میں نہیں کہ اس میں فلسفیانہ مباحث پیش کئے گئے ہوں بلکہ اس کی خوبی حسن تعمیر اور طرزِ اظہار میں مضمر ہے۔ معنی اور ہیئت کا خوشنما اور مربوط اظہار ہی اس کی جان ہے۔ موضوع کے اعتبار سے نہ صرف زبان میں تبدیلی ضروری ہے بلکہ لب و لہجہ کی تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔ مثلاً رزمیہ مثنویوں کی بلند آہنگی اور عشقیہ مثنویوں کا دھیما پن

Marfat.com

اپنی جگہ دونوں مناسب بلکہ ضروری ہیں۔ تخیلی پُر تکلف اور پیچیدہ طرز کے مقابلہ میں سادہ پُرکار اسلوب زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ شعریت بھی شاعری کی جان ہے جو اسی اسلوب سے پیدا ہوتی ہے۔

## کردار نگاری

مثنویوں میں ہر طرح کے کردار ملتے ہیں جو اپنی عمر کے اعتبار سے اپنے پیشے اور طبقے کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اگرچہ کچھ مخصوص کردار اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے زندگی سے قریب ترین مگر پھر بھی عالم و جاہل کے طرز بود و باش اخلاق و اطوار بول چال مزاج اور اندازِ گفتگو مختلف ہوتا ہے۔ زیادہ تر کردار مختلف النوع ہوتے ہوئے بھی ارتقا پذیر نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اخلاق و اطوار اور مزاج و گفتار کی نیرنگی رکھتے ہوں۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ہماری مثنویوں میں ایسے کردار کا فقدان ہے جو اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل ہوں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ ان قصوں میں حُسن و عشق کا ایک عام سطحی تصور کارفرما ہے۔ جو عام ذہن کو تو تسکین دے سکتا ہے مگر ان میں جمالیاتی حس پیدا نہیں کر سکتا۔

## منظر نگاری

مثنوی میں منظر نگاری جمالیاتی حُسن کو اور بھی اُجاگر کرتی ہے۔ منظر نگاری میں ہر وہ چیز پیش کی جا سکتی ہے جس کا مشاہدہ ممکن ہو، چاہے وہ عبادت خانہ ہو یا مے خانہ، محبوب کی پُر رونق محفل ہو یا عشق حرماں نصیب کا تکیہ، باغ کی پُر فضا بہار کا ذکر ہو یا صبح صادق کا دل فریب جلوہ، اندھیری ڈراؤنی رات ہو یا میدانِ جنگ کی ہیبت ناکی۔ غرضیکہ یہ سب کچھ منظر نگاری کے دائرے میں آ سکتے ہیں۔ اگر منظر نگاری حقیقت نگاری پر مبنی ہو تو نہ صرف قابلِ قدر ہے بلکہ الفاظ میں زندہ و متحرک تصویروں کا نگارخانہ تخلیق کو زندہ جاوید بنا دے گا اگر کسی منظر کی بناوٹ تصور کی رنگ آمیزی پر ہوگی، تشبیہہ و استعارے فہم سے بالاتر ہوں گے اور مبالغے کی کثرت ہوگی تو منظر نگاری کا صحیح معنوں میں حق ادا نہیں ہو سکے گا۔

Marfat.com

نواب امداد امام اثرؔ "کاشف الحقائق" میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فارسی کے مثنوی نگار شعرا عموماً فطرت نگاری کا کم مذاق رکھتے ہیں ان کی ساری تصنیفیں نیچرل معاملات سے کم وبیش طور پر علاحدگی دکھلاتی ہیں، جہاں دیکھو مبالغوں کی بھرمار ہے۔ یا اس طرح کے مصنوعی اندازوں سے ان کے کلام بھرے ہوئے ہیں" لہ

**جذبات نگاری**

منظر نگاری کی طرح جذبات نگاری بھی مثنوی کا لازمی جز ہے۔ اچھی شاعری وہ ہے جس میں انسانی جذبات وکیفیات کی ہو بہو تصویر کشی کی گئی ہو۔ جذبات نگاری کی نیرنگی نہ صرف انسانوں میں بلکہ حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بندر کے بچے کو ذرا چھیڑ کر دیکھئے، بندر یا کس طرح اپنے بچے کو بچانے کی خاطر آپ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ یہ غصے کے جذبے کی صرف ایک ادنی مثال ہے۔ جذبات ہر قسم کے ہو سکتے ہیں مثلاً غم ویاس، رشک والفت، غیرت وغیظ، وغیرہ۔ مثنوی چونکہ بیانیہ شاعری کے لئے بہترین صنف ہے اس لئے دوسرے اصنافِ سخن کے مقابلے میں اس میں جذبات نگاری اور وارداتِ قلبی کی عکاسی کر کے مثنوی غزل کے میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔ منظر نگاری کی طرح جذبات نگاری میں بے جا مبالغہ ناقابلِ فہم استعارے بے محل تشبیہات تخیل کی بے اعتدالی اور ضلع جگت کی کوشش پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔

**ہم عصر تہذیب کی مرقع نگاری**

مثنوی چونکہ بیانیہ شاعری کے لئے مخصوص ہے اس لئے اس میں ہم عصر تہذیب کی مرقع نگاری خوب ہوتی ہے۔ اُردو میں اکثر طویل عشقیہ یا بزمیہ مثنویاں لکھی گئی ہیں، جن کا مقصد عشقیہ قصے کے علاوہ ہم عصر تہذیب کی تفاصیل بھی پیش کرنا تھا۔ عہدِ گزشتہ کا یہ

---

لہ اثرؔ امداد امام "کاشف الحقائق" طبع دوم - جلد دوم - ص ۳۱۶

Marfat.com

تہذیبی ورثہ جو ہمیں مثنویوں میں ملتا ہے وہ صرف ماضی کی اچھی یا بُری قدروں سے روشناس نہیں کراتا بلکہ مستقبل کی روشنی کا سبب بھی بنتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی تاریخ مرتب کرتے وقت ہم اپنے اس تہذیبی ورثہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے مثنوی کے جائزہ کے لئے متذکرہ بالا اصول پیش کر کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ ان اصولوں کو وضع کرتے وقت ان کے پیش نظر اُردو کی طویل داستانیں اور عشقیہ مثنویاں رہی ہوں گی۔ چونکہ اُردو میں طویل اور عمدہ تاریخی رزمیہ مثنویاں نہیں لکھی گئیں اس لئے ان اصولوں کو مقرر کیا گیا ہے اور تاریخی مثنویوں کو انہی اصولوں کے تحت ہی جانچا اور پرکھا گیا۔ تاریخی مثنویوں کے لئے واقعہ نگاری بہترین لوازمات میں سے ہے۔ اور شبلی بھی واقعہ نگاری کی اہمیت کے قائل ہیں۔ واقعہ نگاری میں جس چیز کا بھی بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے جس طرح ایک ماہر فن کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے واقعات جس سے بعض اوقات ایک مجمل تصویر کھنچ جاتی ہے اور ان جزئیات سے اکتاہٹ پیدا نہ ہو تو انہیں بھی واقعہ نگاری کے تحت لانا چاہیئے۔

Marfat.com

# تاریخی مثنویوں کا ارتقاء

## (جنوبی اور شمالی ہند میں)

لغت میں تاریخ کے معنیٰ ماضی کے کسی حادثے، واقع یا تحریر کا وہ دن مقرر کرنا ہے جب وہ واقعہ یا حادثہ ظہور پذیر ہوا۔ مگر اصلاح میں عہدِ گزشتہ کے حادثات واقعات اور حالات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کو تاریخ کہا جاتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں تاریخ کی تعریف یوں کی گئی ہے:۔

HISTORY IN THE WIDER SENSE IS ALL THAT HAS HAPPENED, NOT MERELY ALL THE PHENOMINA OF HUMAN LIFE, BUT THOSE OF NATURAL WORLD AS WELL: ؁[1]

یہ تعریف نہ انسانی زندگی سے متعلق واقعات پر مبنی ہے بلکہ حیوانات، جمادات نباتات وغیرہ کے حالات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لیکن تاریخ کے دامن کی وسعت یوں بھی نظر آتی ہے۔

"عام طور پر تاریخ کا اطلاق انسانی زندگی سے متعلق واقعات ہی پر ہوتا ہے۔ فلسفہ، ادب، مصوری، سائنس، سیاسیات، معاشیات غرض علوم و فنون کے ارتقائے احوال کو بھی تاریخ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرضیکہ علم تاریخ سے مراد انسانی معاشرے اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا تذکرہ ہے"[2]

تاریخ کی موجودہ تعریف اس کے قدیم تصور یا تعریف سے بڑی حد تک

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا۔ جلد گیارہ۔ ص ۵۹۴ (انگریزی میں) مطبوعہ گریٹ برٹین ۱۹۶۸ء

[2] اُردو انسائیکلوپیڈیا۔ عبدالحمید خاں۔ طابع و ناشر مطبوعہ فیروز سنز لمیٹیڈ لاہور۔ بار اوّل ۱۹۶۲ء ص ۴۴۲

Marfat.com

مختلف صورت اختیار کر چکی ہے۔ زمانہ قدیم کا مورخ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ جس ملک کی تاریخ بیان کر رہا ہے اس کے مختلف حکمرانوں کے بنیادی کردار خاندانوں کے حالات اور معرکوں کی تفصیلات اس طرح بیان کی جائیں کہ قاری اس عہد کے حکمرانوں کے عروج و زوال کی داستان سے واقف ہو جائے۔ لیکن آج کا مورخ جہاں کسی بادشاہ کے عہدِ حکومت کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو صرف شخصی اور خاندانی حالات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی کوشش کرتا ہے کہ اس زمانہ کے معاشرتی، سماجی اور سیاسی حالات کا جائزہ لے اور اس زمانے کا تہذیبی اور تمدنی کردار کی وضاحت و تشریح پیش کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے کا مزاج، بود و باش اور معاشی حالات پر تنقیدی نظر ڈالے۔ پہلا مورخ اس زمن میں زیادہ آگے بڑھتا تو بادشاہ اور رعایا کا تعلق دکھاتا اور وہ بھی صرف ایک محدود اخلاقی پس منظر میں، آیا بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ مہربان، رحم دل اور انصاف پسند رہا ہے، یا جابر، ظالم۔ اہلِ علم و ہنر کی قدر کرتا تھا یا نہیں؟

ہمارا موضوع تاریخی مثنویاں ہے۔ اس لئے ہم قدیم و جدید تصورات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے موضوع کی حدود متعین کریں گے۔ آج کی تاریخ کا سلسلہ صرف واقعات کے تسلسل کا معاملہ نہیں بلکہ کسی بھی ملک کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس ملک کے مختلف علمی و فکری میلانات کو بھی دیکھنا ضروری ہے اس طرح تاریخ کا یہ عمل ابھرا یا محدود ہونے کی بجائے وسیع اور معنی خیز ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں اب تک تاریخ کو ان تصورات کی روشنی میں نہیں پیش کیا گیا ہے۔ اور نہ ہم نے اس پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا تاریخ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں چند تاریخی واقعات یا کچھ تاریخی ناموں کی تصویر ابھرتی ہے۔ ہم نے تاریخی مثنویوں سے مراد صرف وہی واقعاتی مثنویاں لی ہیں جو کسی تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ اگر مثنوی کے کردار اور اس کے واقعات مستند تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے یا اس میں تاریخ کا مذکورہ بالا شعور نظر نہیں آتا تو ہم نے ایسی تمام مثنویوں کو نیم تاریخی مثنویوں کی صف میں جگہ دی ہے۔ لیکن محض تہذیبی، تمدنی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی

Marfat.com

نوعیت کی ان مثنویوں کو جو عام قصّوں اور کہانیوں سے عبارت ہیں انہیں تاریخی مثنویوں سے الگ رکھا گیا۔ کیونکہ ان مثنویوں کو کسی دَور یا زمانے کی حدوں کا قطعیت کے ساتھ تعیّن نہیں ہوتا۔ ان مثنویوں کو تاریخی مثنویوں کی فہرست میں شامل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا گیا ہے جو کسی عظیم رہنما یا کسی بلند شخصیت یا مخصوص ادارے یا تاریخی مقام کے ذکر پر مشتمل ہیں اور جنہیں فی زمانہ تاریخی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

**تاریخی مثنویوں کی تعریف** نظم کا وہ قالب جس میں عہدِ گزشتہ کے تاریخی حالات واقعات وحادثات وغیرہ تاریخی مقام وکردار کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ ہر شعر باعتبار قافیہ ایک دوسرے سے مختلف اور آپس میں مربوط ہو اور پوری مثنوی ایک ہی بحر میں لکھی گئی ہو۔ ایسی مثنوی کو تاریخی مثنوی کہا جائے گا۔ تاریخی مثنویوں کے تدریجی ارتقاء یا تنقیدی مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا کہ اُردو ادب میں لکھی گئی اکثر مثنویاں انسانی معاشرے کی تہذیب وتمدّن کا آئینہ تو کیا پیش کرتیں ان میں حقائق کا وہ احساس یا شعور بھی نہیں ملتا جس کے بغیر تاریخ کا تصوّر بے معنی ہے۔

تاریخی مثنویوں کے تدریجی ارتقاء سے متعلق تاحال اتنا کم مواد ملتا ہے۔ مثنویوں کی تعریف وتاریخ لکھتے ہوئے مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے کچھ ناقدین نے تاریخی مثنویوں پر اظہار خیال ضرور کیا ہے۔ چنانچہ اس اظہارِ خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے آئندہ صفحات میں تاریخی مثنویوں کے ارتقاء پر روشنی ڈالی جائے گی۔

نصیر الدّین ہاشمی اور عبدالقادر سروری جیسے اہلِ قلم کا خیال ہے کہ دوسری اصناف کی طرح اُردو مثنویوں کی ابتدا بھی دکن میں ہوئی، لیکن ان کا یہ قول محلِ نظر ہے۔ اگر بابا فرید گنج شکر رح ـــــ کے اشعار جن میں مثنوی کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے الحاقی تصوّر نہ کئے جائیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ مثنوی کی ابتدا در اصل شمالی ہندوستان ہی سے ہوئی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو

Marfat.com

کی پہلی تاریخی مثنوی موجودہ تحقیق کے مطابق جنوبی ہندوستان میں لکھی گئی۔ حسن شوقی غالباً پہلا شاعر ہے جس نے تاریخی مثنوی "ظفرنامہ نظام شاہ" جس کو فتح نامہ نظام شاہ" بھی کہا جاتا ہے، لکھی۔ اس مثنوی میں شاعر نے فتح مندی کا سہرا نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔ حالانکہ اس شاندار فتح کا حق تمام شاہانِ دکن کو برابر پہنچتا ہے۔ یہ لڑائی تالی کوٹ کے مقام پر ۹۷۲ھ میں ہوئی۔ ایک طرف عادل شاہی، نظام شاہی، اور قطب شاہی فوجیں تھیں، دوسری طرف دجیانگر کے راجہ رام راج کی فوجیں۔ راجہ رام راج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا، اور میدانِ جنگ میں راہی ملکِ عدم ہوا۔

شوقی کی دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" سلطان محمد عادل شاہ ہے جس کا موضوع ایک تاریخی واقعہ ہے جو محمد عادل شاہ کی شادی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی اپنے عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ حسن شوقی سے پہلے عبدل نے ایک نیم تاریخی یا سوانحی مثنوی "ابراہیم نامہ" ۱۰۱۱ھ میں لکھی تھی، جس میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی زندگی کے متعلق حالات قلم بند کئے ہیں اس مثنوی کی تاریخی اہمیت اتنی ہے کہ ایک بادشاہ کی سماجی و اخلاقی زندگی کے حالات معلوم ہوجاتے ہیں۔

محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ کا عہد آیا جس کا دربار شعراء اور اہل کمال سے ہر وقت پُر رہتا تھا اس کے درباری شاعر نصرتی کی دو تاریخی مثنویاں "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" ملتی ہیں۔ علی نامہ ۱۰۷۶ھ میں مکمل کی گئی جس کا پتہ اس شعر سے چلتا ہے ؎

لکھیا شہ کا جس میں یو کرجب اس　　ہزار یک ہور ستر پو تھے چھے برس

اس مثنوی میں مرہٹوں، مغلوں اور ہمعصر دکنی ریاستوں کے فرمانرواؤں سے جنگوں کا حال ہے۔ دوسری مثنوی "تاریخ اسکندری" ۱۰۸۳ھ میں تصنیف ہوئی جس کی تصدیق نصرتی کے اس مصرعہ سے ہوتی ہے ؏

سہس ہور اسی پو جو تھے تین سال

Marfat.com

اس مثنوی میں عادل شاہی کے آخری حکمراں سکندر عادل شاہ کے عہد میں شیواجی مرہٹہ سے نبرد آزمائی کا بیان ہے جو امرانی سے قریب واقعہ ہوئی۔ عبدالکریم بہلول خاں اور شیواجی کے لشکر کے مقابلہ پر آیا اور اُسے شکست دی، یہ عادل شاہی خاندان کی آخری فتح تھی۔

سکندر عادل شاہ کا عہد نہایت پُرآشوب تھا جس میں عوام کو سکون اور اطمینان کم نصیب ہوا۔ اس لئے رعایا کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ملتا ہے کیونکہ غم دوراں سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہی واحد راستہ تھا اسی لئے اس زمانہ میں مذہبی مثنویاں بے شمار لکھی گئیں۔

جب اورنگ زیب نے سکندر عادل شاہ کو معزول کر کے آخری دکنی ریاست کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا تو گجرات، گولکنڈہ اور بیجاپور کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی۔ علماء و فضلاء منتشر ہونے لگے اس عہد میں دکن کی حیثیت صرف ایک صوبہ کی رہ گئی تھی۔ ولی اورنگ آبادی دکنی عہد کے آخری بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ انہوں نے بھی کوئی قابلِ قدر طویل مثنوی نہیں لکھی۔ صرف ایک مختصر مثنوی تاریخی مقام سورت سے متعلق ہے۔ جو "تعریفِ سورت" کے عنوان سے لکھی گئی۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے، غالباً یہی مثنوی شمالی ہند کے شعراء کے لئے نمونہ ثابت ہوئی۔

آصفیہ عہد میں بھی دکنی زبان میں کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ پہلی تاریخی مثنوی غضنفر حسین نے "جنگ نامہ سیّد عالم علی خاں" ۱۱۳۲ھ میں لکھی۔ مثنوی میں سالِ تصنیف یوں رقم ہے ؎

ہزار ہور سو تیس تھے سنہ دو اُپر

اس مثنوی میں آصف جاہ اوّل اور عالم علی خان کی جنگ کا حال ہے جو شوال ۱۱۳۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۷۲۰ء میں برہان پور اور اورنگ آباد کے درمیان فردا پور کے مقام پر واقع ہوئی۔

Marfat.com

۱۱۷۴ھ میں منیر نے جنگ نامہ بہاؤ راؤ، لکھی جس میں احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کی جنگ کا واقعہ نظم کیا ہے۔ حسین علی خان عشرت مثنوی "ضرب سلطانی" موسوم بہ "فتح نامہ ٹیپو سلطان" ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء میں تصنیف کی۔ اس مثنوی میں ٹیپو سلطان کی لڑائی انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے کا ذکر ہے جو جو ۱۷۸۵ء میں دریائے تنگ بھدرا کے مقام پر ہوئی تھی۔ اور اتحادی فوجوں کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔ بھیم چند ایک ہندو شاعر نے ۱۲۰۰ھ میں فردوسی کے شاہنامہ کو مختصر منظوم شکل میں پیش کیا جس کی زبان بقول شاعر ہندی ہے۔

کیا جو فردوسی طوس نے　　　اس عہد لگ شاہنامہ منے

کیا اس کو ہندی زبان بھیم چند　　　ہے امید جو ہوئے عالم پسند

کمتر شاہ کمتر عہد آصفیہ کے دکنی زبان کے آخری تاریخی مثنوی نگار ہیں۔ جنہوں نے ایک مثنوی "داستان نظام علی خاں" ۱۲۱۱ھ میں لکھی۔ اس مثنوی میں نواب آصف جاہ ثانی نظام علی خاں کے عہد کے واقعات نظم کئے ہیں۔

۱۲۱۷ھ میں بمبئی کے مشہور شاعر باپو میاں فقیہہ نے مختصر واقعاتی مثنویاں لکھیں ایک "بر حادثہ آتش زدگی، در بمبئی ہے" جس میں ایک بھیانک آگ جو فورٹ ولیم کے علاقہ میں لگی تھی کا ذکر ہے۔ اگلے سال دوسری مثنوی "مسمارگی شہر ممبئی"، لکھی جس میں اس علاقہ کی مسمارگی کا ذکر ہے۔ جو ایک سال پیشتر آگ میں جل کر بدنما منظر پیش کر رہا تھا۔ اس علاقہ کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے علاقہ زبردستی خالی کرا کر مسمار کیا گیا۔

۱۲۳۳ھ میں نادر نے مثنوی نادر جس کا دوسرا نام سفرنامہ نواب اعظم جاہ، والی ارکاٹ، لکھی جس کی صراحت شاعر کے درج ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

کیا ہے سفر جب شہ نیک خو　　　کہ بارہ سو اٹھتیسواں سنہ تھا وہ

قدیم رنگ کی دکنی مثنویوں کے مقابلے میں اس مثنوی کی زبان آسان ہے اس میں دکنی زبان کی وہ خصوصیات بھی نہیں پائی جاتیں جو عادل شاہ قطب شاہ کے

Marfat.com

دور میں پائی جاتی تھیں۔ اس مثنوی میں جنوبی ہند کے اس عہد کی معاشی، سیاسی، طرزِ زندگی کا تاریخی اجمالی عکس صاف جھلکتا ہے۔

عنایت خاں ناطق نے اپنے عہد کا چشم دید واقعہ "مثنوی شہیدان" ۱۲۳۸ھ میں لکھا جو نواب سکندر جاہ کے آخری عہد میں بمقام چنچل گوڑہ حیدر آباد واقع ہوا۔ یٰسین خان مہدی نے مولوی عبدالکریم کو قتل کر دیا اس واقعہ نے پورے حیدرآباد کے علاقہ کو متاثر کیا۔ یہاں تک کہ نواب سکندر جاہ کے سپاہیوں نے چنچل گوڑہ کے مہدیوں پر توپوں سے چڑھائی کر دی۔ نواب کی فوج کو شکست ہوئی۔ جب انگریزوں نے دوبارہ چنچل گوڑہ کا محاصرہ کیا تو مہدیوں نے صلح کر لی۔ اس حادثہ کا اثر مدتوں تک محسوس کیا جاتا رہا۔ تیس بتیس سال بعد ۱۲۶۹ھ میں عرفان نے اخبارِ شہیداں کے نام سے مثنوی لکھی جس کا موضوع بھی یہی ہے۔

نذر علی نذر نے "سراج التواریخ" نواب فرخندہ علی نصیر الدولہ آصف جاہ چہارم کے عہد میں ۱۲۶۵ھ میں لکھی جو شاہنامہ فردوسی کے خلاصے کا منظوم ترجمہ ہے۔

مولوی باقر حسین ضیا نے ۱۳۰۱ھ میں "مثنوی ضیا دکن" نواب آسمان جاہ آصف جاہ سابع کے عہد میں لکھی جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ مرزا داغ دہلوی نے "مثنوی ضیا دکن" کی منظوم تقریظ لکھی جس سے مثنوی کے سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔

سُنیں اس کی تاریخ اہلِ سُخن      منوّر مبیں ہے ضیائے دکن

اس مثنوی میں نواب آسمان جاہ کے عہد میں ریاست کے جس جس شعبے میں ترقی ہوئی اس کا اجمالی تذکرہ ہے۔ محبوب علی آصف جاہ سادس کے آخری دور میں اطہر نے ۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں ایک مثنوی "طغیانی رود موسیٰ" لکھی جس میں مصنف نے چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔ اس واقعہ نے بلدہ حیدر میں کچھ گھنٹوں میں آفت برپا کر دی جس سے بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ اطہر نے سیلاب موسیٰ کو دہلی کے غدر سے تشبیہ دی ہے۔

Marfat.com

کیا انقلاب آیا دکن میں میرے خدا ‏ دہلی کے غدر سے بھی زیادہ یہ ہوگیا

یہ ایک ایسا دل دوز واقعہ تھا جو مدتوں تک ذہن میں تازہ رہا۔ ذوقی نے بہت بعد میں اس طغیانی موسیٰ کا واقعہ نظم کیا۔

دلاور علی دانش نے ۱۳۱۷ھ میں مثنوی تذکرہ سلاطین دکن (تحفۂ عثمانیہ) تصنیف کی جو آصف خاندان کے پہلے نواب نظام الملک آصف جاہ سے لے کر محبوب علی آصف جاہ سادس کے عہد تک کے مختصر تاریخی حالات پر مشتمل ہے۔ دانش کا اس مثنوی کو لکھنے کا واحد مقصد شہزادہ عثمان علی خان کو اپنے آبا و اجداد کے تاریخی کارناموں سے روشناس کرنا تھا۔

مولوی محمد حبیب اللہ رفعا نے آصفیہ خاندان کی تاریخ سات جلدوں میں نظم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ سب سے پہلے جلد ہفتم دفتر عثمانی ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء میں بتقریب جشن سیمیں نواب عثمان علی خاں کے موقعہ پر شائع ہوئی۔ اس جلد میں عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے پہلے پچیس سالوں میں جو تعلیمی، عدالتی اسکیموں، حکومت کی تنظیم نو، طبابت، فوج، تعمیرات، صنعت، آبپاشی، محکمہ آثارِ قدیمہ، سررشتہ ٹپہ خانہ وغیرہ شعبوں میں کی گئی ترقی کا اجمالاً ذکر کیا ہے۔

سید حسن ذوقی آصفیہ عہد کے آخری شاعر ہیں جس نے مثنوی کا ذوقی موسومہ شاہ نامہ احمدیت جو تین حصوں پر مشتمل ہے لکھی۔ اس مثنوی میں چھوٹے چھوٹے دو سو ترانوے عنوانات ہیں جن میں کچھ تاریخی اشخاص و واقعات کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۶۰ء پہلی بار چھپی۔

دراصل دکنی رنگ و آہنگ کی مثنویوں کا دور نواب آصف جاہ ثانی نظام علی خان کے عہد میں ہی ختم ہوگیا تھا۔ چونکہ دارالحکومت کے ساتھ ساتھ دبستانِ ادب بھی شمالی ہند میں منتقل ہوگیا تھا اور یوں تمام اصنافِ شاعری میں ترقی، وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی۔ عوام و خواص نے اہل کمال کی قدردانی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، مگر آئے دن کی افراتفری اور حکمرانوں کی نااہلی مرہٹوں اور دوسرے بیرونی حملہ آوروں

Marfat.com

کی یورش نے عوام اور اہلِ کمال کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اس طوائف الملوکی، معاشی بدحالی اور سیاسی ابتری نے تصوف اور فقیروں اور خدا رسیدہ بزرگوں کا سہارا لینے پر مجبور کیا ظاہر ہے ان حالات میں تاریخی یا رزمیہ مثنویاں کیسے وجود میں آتیں اس کے برخلاف داستانوی عشقیہ و مذہبی مثنویوں کے علاوہ مرثیہ نگاری کو عروج حاصل ہوا۔

شمالی ہند میں اُردو کی سب سے پہلی تاریخی مثنوی میر جعفر علی زٹلی کی "ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالمگیر بادشاہ غازی" ہے۔ جس میں اورنگ زیب کے معرکۂ دکن اور قلعہ بیجاپور کی فتح کے حالات نظم کئے ہیں۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک کوئی قابلِ ذکر تاریخی مثنوی نہیں ملتی۔ صرف میر تقی میر اور سودا نے چند ہجویہ مثنویاں اور شکار نامے لکھ کر اس دور کی سماجی اور معاشرتی پس منظر کی کھوکھلی تصویریں ضرور پیش کیں۔

میر تقی میر نے ایک مثنوی جنگ نامہ ۱۲۰۹ھ میں لکھی جس میں آصف الدولہ اور انگریزوں کی روہیلوں کے خلاف لڑائی کا ذکر ہے۔ یہ لڑائی ۱۲۰۹ھ میں ہوئی اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ میر تقی میر سے پہلے کبیر نے جس کا پورا نام وحالاتِ زندگی معلوم نہ ہو سکے ایک مثنوی لکھی جو غالباً ۱۱۸۸ھ کے لگ بھگ کی تصنیف ہے۔ اس مثنوی میں نواب شجاع الدولہ اور روہیلوں کی لڑائی کے بعد جو روہیلکھنڈ کی دگرگوں حالت ہو گئی تھی اُس کی آئینہ داری کرتی ہے۔

میر تقی میر کے بعد میر حسن کا ذکر آتا ہے جنہوں نے بزمیہ مثنوی "سحر البیان" لکھ کر اُردو ادب کے دامن کو بڑی وسعت دی۔ انہوں نے ایک مثنوی "شادی" بھی لکھی، جس میں نواب آصف الدولہ کی شادی کا ذکر ہے۔ نواب شجاع الدولہ کی مدح بھی کی گئی ہے۔ اس مختصر مثنوی کی تاریخی حیثیت صرف اتنی ہے کہ یہ ایک نواب کی شادی کے متعلق ہے جو ۱۱۸۳ھ میں واقع ہوئی۔ اس شادی کے متعلق میر تقی میر نے ایک مثنوی "کد خدائی آصف الدولہ" کے نام سے لکھی ہے۔ مصحفی اور جرأت

Marfat.com

رنگیں سے پہلے عبرت و عشرت نے "پدماوت" جس کا دوسرا نام "شمع و پروانہ" بھی ہے ۱۲۱۱ھ میں لکھی جو مثنوی کے ایک مصرعہ ؎

"بلا شک جانے تصنیف دو شاعر"

کے لفظ "تصنیف دو شاعر" سے تاریخ تصنیف برآمد ہوتی ہے۔ مثنوی کے چند کردار تاریخی ہیں، ورنہ رانی پدمنی کو حاصل کرنے کے لئے سلطان علاؤ الدین کا چتوڑ پر فوج کشی کرنا تاریخی اعتبار سے مؤرخین کے نزدیک مختلف الرائے رہا ہے۔

سعادت یار خاں رنگیں نے "جنگ نامۂ رنگین" ایک تاریخی مثنوی ۱۲۰۲ھ میں لکھی، اس میں پائن کی لڑائی جو ۱۲۰۲ھ میں ہوئی تھی کا ذکر ہے۔ یہ لڑائی مادھوجی سندھیا اور مغل سردار کے درمیان ہوئی تھی۔ رنگیں کے ہم عصر ان نے کوئی تاریخی مثنوی نہیں لکھی

شاہ نصیر کے شاگرد منشی مول چند نے رزمیہ موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ انہوں نے شاہنامہ اُردو، جس کا تاریخی نام "قصہ خسروانِ عجم" ہے ۱۲۲۵ھ میں لکھی جو ۱۲۶۲ھ میں شائع ہوئی۔ منشی مول چند نے فردوسی کے ساٹھ ہزار اشعار کو نو ہزار اشعار میں سمونے کی کوشش کی جس سے بے جا اختصار کی بدولت مثنوی محض تاریخ نگاری بن کر رہ گئی ہے۔

امیر علی آمیر گوالیاری نے مثنوی جنگ نامہ بلدہ بھوپال ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء میں تصنیف کی جس سے مصنف نے تقریباً تیرہ سال پیشتر ۱۸۱۲ء میں مرہٹوں کے ریاست بھوپال پر حملہ کا چشم دید واقع بیان نظم کیا ہے۔ شاہ امیر الدین علی نے ۱۲۷۱ھ میں صرف چھپن اشعار پر مشتمل مختصر مثنوی بہ عنوان "اطلاع نامہ" واجد علی شاہ کو مخاطب ہو کر لکھی جس میں اجودھیا میں ایک ٹیلہ جو ہنومان بیٹھک کے نام سے مشہور تھا اس شہنشاہ اورنگ زیب نے ایک مسجد بنوائی تھی جو بعد کو مسمار کردی گئی تھی کا ذکر ہے۔

سہیلؔ کی تصنیف کا موضوع تاریخ رہا ہے، اس کی تین مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔ پہلی مثنوی "تاریخ منظوم سلاطینِ بہمنیہ" ہے۔ دوسری مثنوی "سہیل دکن" اور تیسری

Marfat.com

"تاریخ ہندوستان منظوم" ہے۔ ان مثنویوں کے سنہ تصنیف کا تعین نہ ہو سکا۔ مگر اندرونی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تصنیف ہوگی۔ دوسری مثنوی نظام الملک آصف جاہ کے عہد کی ہے اور تیسری مثنوی ۱۸۵۷ء کے بعد کی تصنیف ہے کیونکہ اس میں ملکہ وکٹوریہ کی تعریف کی گئی ہے۔

سید احمد علی شاہ احمد نے دو مثنویاں لکھیں ایک "کشف ابغاوت گورکھپور" ۱۸۵۸ء میں تصنیف ہوئی۔ دوسری "محبوب التواریخ" ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء کی تصنیف ہے۔ پہلی مثنوی میں غدر کے حالات نظم کئے ہیں۔ دوسری میں ریاست و شہر گورکھپور کا مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔

کاشی رام سہائے تمنا نے ۱۸۶۷ء میں "مثنوی یادگارِ بھوپال" تصنیف کی۔ مصنف نے یہ مختصر مثنوی صرف ایک دن میں لکھی اور نواب شاہ جہاں بیگم بھوپال کو پیش کی۔ اس مثنوی میں تمنا نے نواب دوست محمد خاں کے عہد ۱۸۱۲ء سے لے کر نواب سکندر بیگم بھوپال کے عہد ۱۸۶۸ء تک کے مختصر حالات قلم بند کئے ہیں۔

غلام حیدر حیدر نے مثنوی "گلدستۂ شجاعت" موسوم بہ سکندر نامہ جو خواجہ گنجوی کے فارسی منظوم سکندر نامہ بحری دبری کا اردو میں ترجمہ کیا جو دوسری بار ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مومن خاں مومن، ضمیر اور ناسخ نے عشقیہ اور مذہبی مثنویاں لکھیں۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر نے ۱۲۷۴ھ میں ایک سوانحی مثنوی "حزن اختر" لکھی جس کی اہمیت اتنی ادبی نہیں جتنی تاریخی یا سوانحی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی حصے میں اپنے قید ہونے کا تاریخی واقعہ نظم کیا ہے اور آخری حصہ میں اپنی محلات کا تذکرہ کیا ہے۔

قدیم رنگ کی مثنویوں کے آخری دور میں منشی امیر اللہ تسلیم کی شخصیت قابل ذکر ہے جنہوں نے ایک بہترین تاریخی مثنوی 'تاریخ رامپور' لکھی جو تین اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلا جزء "تاریخ بدیع" کے نام سے موسوم ہے جس میں سلطنت

Marfat.com

کے بانی نواب علی محمد سے لے کر نواب کلب علی خاں کے عہد کے حالات و واقعات کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ کا نام "تواریخ کامل" ہے۔ جس میں نواب مشتاق علی اور حامد علی کے عہد ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء کے واقعات کا ذکر ہے۔ تیسرا حصہ "سفرنامہ خسروی" ہے، جو نواب حامد علی خاں کے سفر یورپ کے واقعات پر مبنی ہے۔

اسی عہد میں بہار میں شاد عظیم آبادی نے ۱۸۸۷ء میں "نوید ہند" ایک سیاسی مثنوی تمثیل کے انداز میں لکھی جس کی ترمیم شدہ شکل "مادر ہند" ۱۹۰۸ء میں وجود میں آئی۔ دونوں مثنویوں کا لبِ لباب بھی ایک ہے۔ شاد عظیم آبادی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تاریخی واقعات کو استعارات میں پیش کیا۔ اس مثنوی میں شاد نے ہندوستانیوں کو سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہانے کی بجائے اخلاقی اقدار کا حربہ استعمال کر کے سیاسی آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

۱۹۰۷ء میں برج نرائن ناظم نے مثنوی "پھولنامہ" تصنیف کی جس میں ریاست جیند کی تاریخ قلمبند کی ہے۔ ریاست جیند کے راجاؤں مہاراجاؤں کی شادیاں، اولاد، ریاست، کے نظم ونسق فلاح و بہبود کے انتظامات، تعمیرات و توسیعات آبپاشی مغلوں اور انگریزوں سے سیاسی تعلقات کا اجمالاً ذکر بھی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہو چلی تھی۔ ہندوستانی باشندے ہندوستان کی آزادی کے لئے پُر امید ہو چلے تھے، جہاں ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی کرن چمکتی دکھائی دینے لگی تھی، وہاں دوسری طرف دو قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کی تفریق کا بھی بیج بویا جانے لگا تھا۔ کچھ شعراء نے اپنی قوم کے بچوں کو ابتدائی تاریخ سے واقفیت بہم پہنچانے کے تبلیغی کام شروع کیا۔ بشیر محمد مسلم نے تاریخ ہندوستان موسوم بہ "ہندوستانی شاہنامہ" کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تلخیصی انداز میں بڑے بڑے تاریخی واقعات کو نظم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ "ہندوستانی شاہنامہ" کے پہلے دو حصے ۱۹۱۲ء میں شائع

Marfat.com

ہوئے۔ سلامت علی رفیق نے بھی ۱۹۲۱ء میں 'غزنی نامہ' تصنیف کیا اور تبلیغی کام کو آگے بڑھایا۔ 'غزنی نامہ' میں سلامت علی رفیق نے محمود غزنی کے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے کئی حملے کرنے کی وجوہات 'ہندوستانی راجاؤں کی غزنی سلطنت کے خلاف سازش بنانا بتایا ہے۔

نانک چند ناز نے ۱۹۵۲ء میں 'ظفر نامہ' تصنیف کی۔ جو دسویں گرو گوبند سنگھ کلغی دھر مہاراج کے فارسی زبان میں لکھے منظوم 'ظفر نامہ' کا تشریحی ترجمہ ہے ظفر نامہ میں گورو مہاراج کی معرکہ آرائیوں کا تذکرہ، نیز اس میں گورو جی کے دو بڑے صاحب زادوں کی گرفتاری اور بعد میں اورنگ زیب کے ہاتھوں شہید ہونے کا ذکر اور دو چھوٹے شہزادوں کا زندہ دیوار میں چنوائے جانے کا ذکر ہے۔ ناز نے ۱۹۵۹ء میں گورو گوبند سنگھ کے 'وچتر ناٹک' کا بھی تشریحی ترجمہ کیا ہے۔ جس میں گورو گوبند سنگھ جی نے اپنی زندگی کے بارے میں نیز گورو نانک دیو جی سے لے کر نانویں گورو تیغ بہادر تک مختصر سلسلہ وار واقعات بیان کئے ہیں۔ علاوہ اس کے مغلیہ خاندان کے بے رحم، ظالم، جابر بادشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں گورو تیغ بہادر کی شہادت کا حال ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں اور والد سے جو سلوک کیا تھا کا بھی ذکر ہے۔ وچتر ناٹک میں ملتا ہے:۔ اس سے چار سال پیشتر سید محمد عباس سرسر کابری کا 'شاہنامہ ہند' ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ جس میں سرسر نے ہندوستان میں عربوں کی حکومت سے لے کر محمد غوری کے عہد تک کے تاریخی دور کو مثنوی میں پیش کیا ہے" شاہنامہ ہند" فردوسی کے شاہنامہ کے جواب میں ہے۔ شاہنامہ تصنیف کرتے وقت سرسر کے پیشِ نظر "تاریخ فرشتہ" کے علاوہ مولانا ریاست علی ندوی کی "عہدِ اسلامی کا ہندوستان" جیسی مستند تاریخی کتابیں تھیں۔

گوکل چند نارنگ کا مجموعہ "اقوالِ بزرگان" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ جو کئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مگر اس میں ہمارے موضوع سے متعلق تاریخی واقعات پر

Marfat.com

تین مختصر مثنویاں ہیں ایک مثنوی "شہیدِ اعظم حقیقت رائے" دوسری "رانی پدمنی" اور تیسری "سیتوں کا شراب" شامل ہیں "سیتوں کے شراب" میں نارنگ نے شیرِ پنجاب رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب کی دگرگوں حالت کا افسانوی انداز میں نقشہ پیش کیا۔

قدیم رنگ کے یہ آخری چند شعراء وضع قدیم پر قائم رہے۔ لیکن مغربی اثرات سے جدید رنگِ شاعری پیدا ہوا، جس نے مثنوی کی اہمیت اور اس کے موضوعات کو بدل کے رکھ دیا۔ جدید شعراء نے عہدِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور معاشی واقعات کو آزاد نظم یا مختصر مثنوی کے پیکر میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

تاریخی مثنویوں کے اس توارِیخی ارتقاء کے بعد ہم اگلے صفحات پر ایک ایک تاریخی مثنوی کا الگ الگ تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیں گے۔

Marfat.com

# عبدل

ابراہیم نامہ کا مصنف عبدل دہلوی کا پورا نام عبداللہ[1]، عبدالعلی، عبدالغنی یا عبدالستار میں کوئی ضرور ہوگا۔ مسعود حسین خان نے لسانیاتی استدلال کی بنا پر عبدل کا نام عبداللہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سالِ پیدائش اور وفات کا پتہ نہ چل سکا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ سے ۱۰۳۷ھ کے درباری شاعروں میں عظیم مرتبہ کے حامل تھے۔ گولکنڈا کے درباری شاعر ملّا وجہی ان کا ہم عصر تھا۔ لیکن دونوں کی زبان میں بہت فرق ہے۔ عبدل نے ابراہیم عادل شاہ کو اپنا اُستاد کہا ہے مگر در حقیقت وہ بادشاہ کے اُستاد تھے۔ ان کے حالاتِ زندگی ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ شمالی و جنوبی ہند کے تذکروں اور تاریخوں سے عبدل کی زندگی اور خاندانی حالات کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مسعود حسین خان کا قیاس ہے کہ ہم عصر شاعر و تذکرہ نگار غالباً اس لئے عبدل کے بارے میں خاموش ہیں کیونکہ عبدل دہلوی تھے اور شمالی ہند کے تذکرے غالباً اس لئے عبدل کا پتہ نہیں دیتے کہ عبدل کی ادبی شہرت دکن میں پروان چڑھی۔ مثنوی کی لسانی خصوصیات کی بناء پر پروفیسر بھگوت دیال ورما اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عبدل خاکِ دہلی سے پیدا ہوئے اور بیجاپور میں ادبی شہرت حاصل کی، مگر عبدل نے دہلوی ہونے کی صراحت تو اپنی مثنوی کے درج ذیل شعر میں کردی ہے

زباں ہندوی مجھ سو ہوں دہلوی    نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

**ابراہیم نامہ** مثنوی ابراہیم نامہ کے تین قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ایک نسخہ[2] (اودندھ) اودھ کے کتب خانے میں تھا جو بمبئی کے میوزم کی زینت ہے۔

---

[1] مسعود حسین خان، ابراہیم نامہ از عبدل، مرتبہ شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۶۹ء ص ۲۸۵

[2] بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل ۱۹۶۲ء ص ۲۶۱

Marfat.com

جس کے متعلق رسالہ "ہندوستانی" [1] الہ آباد کے جنوری ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں سب سے پہلے پروفیسر بھگوت دیال ورما نے تعارفی نوٹ لکھا ہے۔ دوسرا نسخہ سالار جنگ میوزم کے کتب خانے میں ہے، جس کے متعلق نصیرالدین ہاشمی نے "وضاحتی فہرست [2]" میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ تیسرا نسخہ ڈاکٹر زور نے سالار جنگ کے کتب خانے کی جو نقل اپنے ہاتھ سے کی اُسے ادارۂ ادبیات اُردو کو نذر کر دیا۔
یہ مثنوی سات سو تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جو سنہ شہور ۱۰۱۲ھ کی تصنیف ہے۔ جس کی تصدیق مثنوی کے آخری عنوان کے تحت ایک شعر سے ہوتی ہے۔ آخری عنوان "در تواریخ ختم کتاب ابراہیم نامہ" شہور کے زیر تحت شعر ملاحظہ ہو ؎

بچن پھول گوندیوں ابراہیم نام     کیا سہس پر برس بارہ تمام ص ۱۱۶

سے ظاہر ہے کہ مثنوی ابراہیم نامہ شہور ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۰۲۰/۲۱ھ و ۱۶۱۱/۱۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس مثنوی کو مسعود حسین خاں نے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا۔

شعرائے قدیم نے مثنوی کے جن اجزائے ترکیبی کو لازمی قرار دیا ہے، یہ مثنوی اُن پر پوری اترتی ہے۔ مثنوی کی ابتداء حمد، نعت، بادشاہِ وقت کی تعریف، شعر و شاعری کی تعریف، اور سببِ تالیفِ کتاب کے بعد مصنف اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مثنوی کے سارے عنوان فارسی نثر میں ہیں۔ اور اشعار دکنی اُردو میں، گو شاعر کے نزدیک مثنوی بزبانِ ہندوی ہے۔
جب بادشاہِ وقت نے عبدل سے مثنوی لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا کہ میں کونسی زبان میں مثنوی کہوں۔ اس موقعہ کے سوال و جواب ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] { بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو جلد اوّل ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۶۱
رسالہ ہندوستانی ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ الہ آباد کا سہ ماہی رسالہ شمارہ جنوری ۱۹۳۳ء }

[2] ہاشمی نصیرالدین کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست مطبوعہ ۱۹۵۷ء ص ۸۰۱

Marfat.com

سویوں بچن سن شاہ استاد کا | پوچھیا جگت گر شعر کہہ کس زبان
زبان ہندوی مجھ سو ہوں دہلوی | نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبدل کے عہد میں دکنی ہندوی اور دہلوی زبان میں فرق موجود تھا۔ دکنی شعراء اپنی تخلیقات کو زبانِ ہندوی سے متعلق سمجھتے تھے۔ مثنوی کا ابتدائی شعر ملاحظہ ہو ؎

الٰہی زباں گنج توں کھول موجھ | امولک بہا کر نہ کچھ بول موجھ ص ۱

مثنوی کا نفسِ مضمون ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور کی تعریف اس کے شہر و دربارِ بیجاپور کی آراستگی و پیراستگی، اُن کی رزم و بزم آرائیاں، سلحداروں کی تعریف، کاملینِ فن و ماہرینِ علم و ہنر کی سرپرستی، نورس پور کی تعریف، جشنِ میزبانی وغیرہ ہیں۔ عبدل نے یہ سب تاریخی و نیم تاریخی واقعات شعری جامہ میں پیش کئے۔ اور مثنوی کے جامہ میں ابراہیم عادل شاہ کی غیر مبہم تصویر پیش کردی ہے۔

اس مثنوی کا مرتبہ صرف نفسِ مضمون کی بناء پر ہی بلند و بالا نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی بلند مرتبہ کی حامل ہے۔ مثنوی کی زبان قدرے مشکل ہے اور بھاشا سے قریب ہے جس کی وجہ سے ہندوانہ روایت کی عکاسی اور ہندی صنائع و بدائع کی کثرتِ استعمال ہے۔ ورنہ مُلّا وجہی کی "قطبِ مشتری" ابراہیم نامہ سے جو صرف دو سال پہلے تصنیف ہوئی ہے اس میں ہندی اصطلاحوں سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ عبدل کے کلام میں تشبیہات کی ندرت ملاحظہ ہو ؎

دیوا جوت پرتاب ہو دیس بھر | سورج روپ ہو بیج پڑے پھول جھڑ
سو وہ پھول جھڑ کر پڑیا گگن پر | شفق روپ ہو کر اگن جال کر
کوئی بچن ہستی جھلک دانت یوں | کنول کی کلی میں جھمک بیج جیوں
کوئی قد ددتی چلی ڈڈل یوں | حسن باغ میں توڑو لے سرو جیوں ص ۲۷
کوئی جرئت ٹیلا پیشانی میں لائے | کھڑا سورج جیوں صبح میدان آئے ص ۱۰۲

Marfat.com

کوئی مشک ٹیلا پیشانی میں دھر — پڑے چاند بیچ جیوں سیاہی نظر۔ ص ۱۰۲

کوئی دانت کالے دسین یوں نگار — کنول پھول میں جیوں اپچے بھنور ہار۔ ص ۱۰۲

سو ہیں آنکھ دیدے سے سفیدی ملائے — جڑے جوت موتی میں لیلم نمائے

کوئی کالے لٹکن سو پھندنے دھرے — کنول پھول پر آ بھنور جیوں ٹھرے

مندرجہ بالا تشبیہات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے فطرت نگاری کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ مناظرِ قدرت اور مناظر فطرت کی عکاسی جزوی تفصیلات کے ساتھ کی گئی ہیں۔ جس سے شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں اور قدرتِ کلام کا ثبوت ملتا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ کے دربار کی تعریف ملاحظہ ہو۔ دربار کی سجاوٹ کا کیا خوب منظر پیش کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدل، شاہ کی رزم بزم میں ہمیشہ شریک رہتا تھا۔ ؎

سنو شاہ دربار کا اب سنگار — بجنتر بجے[۱] ہر جنس ٹھار ٹھار۔ ص ۲۶

لگے زیب سونے، روپے کے کواڑ — کہ جیوں رات دن مل کھڑے ہیں دوار

کھڑے ہیں اگت[۲] کر سو پردار[۳] بار — بتاں[۴] ہاتھ رتنوں کندن کیا سنوار۔ ص ۲۷

کھڑے بہت اسپ گجپت راؤ — کہ نرپت کہیں نہ کچھ گنت آؤ

کھڑے مست جھولے تو ہتی[۵] اپار — گگن شاہ دہلیز تل جیوں پہاڑ

بھریا روپ تو شاہ دربار یوں — سنوں محل نورس صفت ماہ جیوں۔ ص ۲۷

مندرجہ بالا آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر بادشاہ کے دربار کی تعریف کرنے کے بعد نورس محل کی صفت بیان کرنا چاہتا ہے یہ محل بیجاپور کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ یہ محل سنگت محل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ محل کی تعریف اشعار کے پردہ میں ملاحظہ ہو۔ ؎

نورس محل تختے[۶] عجب خوش نمائے — فرشتے رہے دیکھ کر بھول آئے۔ ص ۳۱

---

۱ باجے۔ نوبت ۲ سواگت۔ استقبال ۳ پہرے دار ۴ ڈنڈا۔ عصا ۵ ہاتھی ۶ بہت زیادہ
۷ کیاری۔ قطعہ باغ۔

Marfat.com

کھویں دیکھ کر ایکس ایک سوں یات — ازل راکس کر بھشت اس دیکھ دھات
جتار اس عالم خدا سب کر یا — نہ اس محل کی جوڑ نظروں پڑیا
دِسے محل درمیاں ایر دِپ[۱] سنگار — ہر اک کھانب[۳] ہر جنس جڑتی نگار[۲]
فرش باندھ رتنو کندن جو ترے — ہر اک نگ اَمولک سولیا کر جڑے ۔ص[۴]

ڈاکٹر نذیر احمد نے علی گڑھ تاریخ ادب اُردو[۵] میں اس مثنوی کے متعلق لکھا ہے :-

" فارسی اور اُردو میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی مثنویاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ البتہ ایسی نظمیں جو کسی دَور کی سماجی، اخلاقی اور مجلسی حالات و واقعات کی آئینہ دار ہوں خال خال ہیں۔ عبدل نے اپنی مثنوی کے ذریعے اس دَور کے رسم و رواج، آدابِ دربار، محفل، عمارات، زیورات، سیر و شکار وغیرہ موضوعات پر قابلِ قدر اطلاعات بہم پہنچائی ہیں اس زمانے کی عمارتوں میں جو تصاویر ہیں اِن کے زیورات کی خوبی اور اہمیت سمجھنے میں اس مثنوی سے بڑی مدد ملتی ہے "

عبدل نے مثنوی میں واقعہ نگاری کا کمال بھی دکھایا ہے۔ کسی منظر یا محفل کا ذکر کرتا ہے تو اس سے متعلق تمام تفصیلات اس طرح سامنے آتی ہیں کہ قاری کے سامنے محفل یا منظر کی جیتی جاگتی تصویر آجاتی ہے۔ مثلاً عبدل نے بادشاہ کی مجلس کی تعریف کی ہے تو وہاں کی ہر شئے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔

بیٹھے مجلسی لوگ ہر اک فن — کھلے پھول ہر جنس دولتِ چمن
ایکس ایک تھیں خوب بدیا دنت نگار — ہر اک بات لوجھک سو نو نو ہزار ۔ص[۳]

عبدل نے ابراہیم نامہ میں بادشاہ کے بزمیہ پہلو کے ساتھ رزمیہ کارناموں کا بھی

---

[۱] درست کرنا۔ ٹھیک کرنا۔ [۲] بہت حسین۔ [۳] کھمبا ستون [۴] جواہرات جڑا ہوا۔
[۵] بحوالہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو۔ جلد اوّل ۱۹۶۲ء ۔ص ۲۶۱

Marfat.com

ذکر کیا ہے جن کی تصدیق عصری تاریخوں سے کی جا سکتی ہے۔ دلاور خاں کے زوال کے بعد ابراہیم عادل شاہ کی قطب و نظام شاہوں سے معرکہ آرائیاں ہوئیں ہاتھیوں اور گھوڑوں کی فوج کے کماندر دربار میں ہر وقت موجود ہیں ؎

کھڑے بہت اسپت گجپت راؤ	کہ نرپت کہتیں نہ کچھ گنت آؤ
کھڑے مست جھومے ہو ہتی اپار	گگن شاہ دہلیز تل جیوں پہاڑ

واقعاتِ مملکتِ بیجاپور[1] کے مصنف نے ابراہیم کے لشکر کی تعداد باون ہزار سوار احشام اور نو سو پچپن ۹۵۵ ہاتھی بتائی "

المختصر مثنوی ابراہیم نامہ ایک اہم تاریخی نظم ہے جس میں عبدل نے اپنے محسن بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے سماجی اور تہذیبی زندگی کی آئینہ داری کی ہے۔ اس وجہ سے یہ مثنوی اُردو ادب میں بلند مقام رکھتی ہے۔

مثنوی کا اختتام درج ذیل شعر پر ہوتا ہے ؎

خدایا تو عبدل بچن پھول کر	بھنور عارفوں چت سو مقبول کر ۱۲۷۵

---

[1] واقعاتِ مملکتِ بیجاپور۔ حصہ اوّل ۔ ص ۲۲۶

Marfat.com

# حسن شوقی

نام شیخ حسن[1] تخلص شوقی تھا۔ سن پیدائش اور وفات، خاندانی اور نجی حالات کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ صرف نشاطی پہلا شاعر ہے جس نے اپنی مثنوی "پھول بن" ۱۰۶۶ھ میں حسن شوقی کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کیا ہے۔ ان اشعار کو دیکھنے کے بعد قاری حسن شوقی کی ادبی حیثیت سے روشناس ہو جاتا ہے۔ لیکن خاندانی حالات پر یہاں بھی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ حسن شوقی کا قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی درباروں سے واسطہ رہا تھا۔ حسبِ ذیل شعر ملاحظہ ہو جو نشاطی نے شوقی کی تعریف میں کہا ہے ؎

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال ہزاراں بھیجتا رحمت منج[2] اپر[3] آل

شعر میں صیغہ ماضی کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت حسن شوقی کا انتقال ہو چکا تھا۔ جناب حسینی شاہد نے "رسالہ قدیم اردو" جلد اوّل میں سخاوت مرزا کے حوالے سے لکھا ہے کہ "شوقی[4] نہ صرف محمد عادل کا ہم عصر تھا بلکہ اس نے سلطان ابراہیم عادل شاہ جگت گرد کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔"

ناقدین نے حسن شوقی کو سیلانی شاعر بتلایا ہے۔ جو احمد نگر، بیجاپور، اور گولکنڈہ کے درباروں سے وابستہ رہا۔ اس کی دو مثنویاں اور کچھ غزلیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ پہلی مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" یا "ظفر نامہ نظام شاہ ہے۔ جو تاریخی اعتبار سے بھی اردو کی پہلی تاریخی مثنوی ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق اس سے پہلے کوئی تاریخی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ شوقی کی دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" ہے جو سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں لکھی گئی، جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

---

[1] سخاوت مرزا۔ اردو رسالہ اپریل ۱۹۵۴ء ص ۱۳-۱۴، بجوالہ رسالہ قدیم اردو ایڈیٹر مسعود حسین خان جلد اوّل۔ ۱۹۶۵ء ص ۵۱۲ [2] مجھ۔ [3] اُوپر۔ [4] ایضاً ص ۵۱۲-۵۱۳

Marfat.com

## فتح نامہ نظام شاہ

یہ پہلی تاریخی مثنوی ہے جس میں حسن شوقی نے ایک اہم تاریخی واقعہ نظم کیا ہے۔ یہ جنگ "تالی کوٹ" کے مقام ۹۷۲ھ میں ہوئی۔ بعض مؤرخین کا اس مقام پر لڑائی ہونے سے اختلاف ہے۔ یہ لڑائی دریائے کرشنا کے جنوب میں دس میل کے فاصلے پر غالباً بمقام مدگل واقعہ ہوئی۔ دکن کی سیاسی تاریخ میں اس جنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دکن کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی اور بریدشاہی چاروں مسلمان سلطنتیں ایک اسلامی جھنڈے کے نیچے صف آرا ہو کر دجیانگر کے راجہ رام راج کو للکارا۔ رام راج اپنی بے شمار فوج لے کر میدانِ جنگ میں آیا۔ اس سے پہلے یہ سلطنتیں آپس میں نہ صرف بر سرِ پیکار رہتی تھیں، بلکہ کبھی کبھی دجیانگر کے راجہ سے گٹھ جوڑ کر کے ایک دوسرے کو پامال کرنے کے درپے ہو جاتی تھیں۔ اس جنگ سے چند سال پہلے عادل شاہ نے راجہ رام راج سے مل کر حسین نظام شاہ کو شکست دلوائی تھی۔ نظام شاہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھا۔ جب راجہ رام راج کا ظلم اپنی انتہا پر پہنچ گیا، اس کا تکبر اس حد تک بڑھ گیا کہ ہم عصر بادشاہوں کے ساتھ مساویانہ سلوک سے بھی پرہیز کرنے لگا تو اس کے غرور کو توڑنے کے لئے دکنی سلاطین نے ۹۷۲ھ میں جنگ کا فیصلہ کیا۔ راجہ رام راج میدان میں ہی راہی ملکِ عدم ہوا۔ اتحادی فوجوں نے دجیانگر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کی شان و شوکت کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیا۔ حسن شوقی کی اس مثنوی کا ذکر رسالہ اردو[1] دکن میں اردو[2] اور علی گڑھ تاریخ ادب اردو[3] سبھی میں کیا گیا ہے۔ مثنوی کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن شوقی کا تعلق نظام شاہی سلطنت سے تھا۔ مثنوی کو نظام شاہ سے

---

۱ مولوی عبدالحق۔ قدیم اردو حسن شوقی رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء۔ ص ۵۴۰ ۵۵۲

۲ ہاشمی نصیر الدین، دکن میں اردو طبع پنجم انشا پریس لاہور ۱۹۶۰ء ص ۱۵۹ - ۱۶۰

۳ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۹۱ - ۲۹۴

Marfat.com

منسوب کرے اس نے حقِ نمک خواری ادا کیا ہے۔ ورنہ فتح میں صرف نظام شاہ کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ تمام مسلمان حکمرانوں نے یہ جنگ مل کر جیتی تھی۔ اس فتح میں سب برابر کے شریک تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نظام شاہ نے اپنی پہلی شکست کا بدلہ لینے کی خاطر اس لڑائی میں جان کی بازی لگادی اور قلبِ لشکر میں بڑی بہادری سے لڑا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو جیت آسان نہ تھی۔ جب عادل شاہی اور قطب شاہی فوجوں کے حوصلے رام راج کے شدید حملوں سے پست ہو چکے تھے تو اس وقت اچانک نظام شاہی دستے کے ہاتھوں راجہ رام راج گرفتار ہوا، اور اس کا سر تن سے جُدا کر کے نظام شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے راجہ رام راج کے سر کو نیزے کی نوک سے نصب کرا کے دشمن کی فوج کو دکھلایا، جس سے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور اس طرح اپنی دیرینہ دشمنی کا بدلہ لے لیا۔

مثنوی کی ابتدا قدیم رنگ میں، حمد و نعت سے ہوئی۔ اس کے ضمنی عنوانات فارسی نثر میں لکھے گئے ہیں۔ پہلا ضمنی عنوان اس طرح قائم کیا ہے۔

"شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ"

مذکورہ بالا عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے تحت جنگ کا حال بیان کیا گیا ہوگا۔ طرفین میدانِ جنگ میں مصروفِ پیکار ہوں گے۔ جنگ کا بھیانک منظر سامنے آئیگا۔ چاروں طرف لاشوں کے انبار لگے ہوں گے۔ شاعر میدانِ جنگ کی منظر نگاری کریگا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ شروع میں شوقی نے دُنیا کے نامور شجاع اور دولت مند ہستیوں کے نام نظم کئے ہیں جو اپنی اعلیٰ انسانی خدمت و بہترین اقدار کی بنا پر آج بھی زندہ ہیں اور ممالکِ غیر کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کر کے اپنے ملک کی ان پر برتری کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد دکنی سلاطین کا ذکر ہے، جو آپس میں اتحاد کا اقرار کرتے ہیں اور راجہ رام راج کے مقابلے میں ایک ساتھ میدانِ جنگ میں اُترنے کا پیمان

Marfat.com

کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عادل شاہ لکھا دیں علی کے غلام | نظام شاہ بہری لکھا دیں نظام
عادل داد ہور دسے وہش کو اگل[1] | کیا بادشاہی سو بازو کے بل
قطب شاہ کے گھر میں سدا راج[2] ٹھٹ | بریدی تھے جزدی جیو کے گھٹ[3] ۔ ص ۴۸
آپس میں اپیں دوست سب مل ہوئے | محبت سوں اخلاص یک دل ہوئے ۔ رسالہ اردو ۱۹۲۲ء
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق | آپس میں اپیں مل کئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک پناہ | جو اس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بھاگ سوگند و عہد استوار | یو غازی و غایر ہوئے برقرار
نکو در ہلاتے جو شب درمیاں | دیکھیں کیا چرخ پھیرے ہے آسماں ۔ ص ۴۹ ایضاً رسالہ اردو ۱۹۲۲ء

"رائے اندیشیدن رام راج باوزیران خود برائے جنگ کردن بہ نظام شاہ"

اس عنوان کے تحت ابتدا میں پہلے چوبیس اشعار ہیں جن میں شاعر نے منظر نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ شام کے وقت جب سورج ڈوبنے لگتا ہے اور چاند نکلنے والا ہوتا ہے اس حسین منظر کو فارسی اور ہندی الفاظ کے مرکب یا ان کی پیوندکاری سے شاعری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ منظر نگاری کر کے رام راج کے دربار کا کیا عمدہ نقشہ پیش کیا گیا ہے کہ شاعری کا حق ادا کر دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ڈوبے قاب زریں سو خرقاب میں | گئی حور زنگی کرے خواب میں
حبش تے پھواں چیر سر پر لیا | ترک دیک پرنار سر تل کیا
حبش تے جو پرگت ہوا چندر روپ | حبش نے چنتے ترک چینی سر دپ
بیٹھا ناگ کالا اوڑیا راج ہنس | اوٹھی سیام سندر سوتاراج اونس
پڑیا پھول پر جب بھنور پنکھ پسار | چھپیا ترک زنگی کھڑا آشکار
بیٹھا دھن اوپرا ڈکر کال جو | ہوا سور تل چاند اوپر ال جو ۔ ص ۵۸ ایضاً از رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۲ء

---

[1] سبقت لے جانے والا [2] بادشاہی [3] قوی

Marfat.com

راجہ رام راج اپنے درباری مشیران اور مصاحبین خاص سے جنگ کے متعلق صلاح و مشورہ کرتا ہے اور بڑے غصے میں کہتا ہے کہ تمام بڑے بڑے ہم عصر راجے مجھے خراج پیش کرتے ہیں، مگر ایک نظام شاہ ایسا ہے جو اس حقیقت کو ماننے سے انکار کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ مجھ کو آنکھیں دکھاتا ہے۔ یہ سن کر سارے مصاحب اور مشیران خاص راجہ رام راج کو صلاح دیتے ہیں کہ نظام شاہ سے جنگ کی جائے۔ اور وہ راجہ رام راج کے کارناموں کو اور اُس کی جنگی کارگزاریوں کی تعریف کرتے ہیں۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ حسن شوقی نے انوکھی تشبیہات اور استعارے کے استعمال سے تخلیقی و شاعرانہ فنی مہارت کا بھی ثبوت پیش کر دیا ہے۔ ؎

کہاں رام راجہ کہاں شاہ حسین | کہاں بحرِ قلزم کہاں تلتین
تو گرمی منے شاہ تے کم نہیں | تو سردی منے ماہ تے کم نہیں
اندھارے اُجالے کوں تو دھوپ چھاؤں | خرابی کو ڈونگر و بستی کو گانوں
وہ گرمی کرے توں تو سردی سو ٹال | وہ سردی کرے توں تو گرمی سوں جال

اردو رسالہ جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۴۵

اس کے بعد شوقی نے یکے بعد دیگرے مثنوی میں پانچ اور ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں۔ ایسے مراسلے اور ان کے جوابات نظم کئے ہیں جو ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ کو لکھے ہیں۔ ان مراسلوں کی تاریخی اہمیت صرف اتنی ہے کہ ان میں چند شخصیتوں کے نام گنائے ہیں۔ مثلاً ایک عنوان کے تحت راجہ رام راج دربار لگاتا ہے اور درباریوں سے اس طرح مشورہ لیتا ہے ؎

کیا رام خلوت منے انجمن | بلایا جتے رائے اور رائے زن
چندر بھان بلیتم و ینکٹا[1] دھری | چلن بھار سوں دھرتری تھر تھری
رتن جرأت جو کھی دھر یا سامنے | کہا بیٹھ[2] مجھ آ منے سامنے

اردو رسالہ جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۴۶

---

[1] راجہ رام راج کے بھائی کا نام ہے جو ایک تاریخی کردار ہے [2] بیٹھ

Marfat.com

کہیا رخت دولت کے تم تھانب ہیں — تمہیں مرد میداں کے رن تھانب ہیں
تمہیں پانچ تن ملکہ یک بد کہو — تمہیں پانچ جن ملکہ یک سد کہو
بہوت دن تی چھاتی منے سل اہے — نظا میاں سوں سجھے آج سو بندیاں اہے

ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے درمیان نفرت کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے شوقی لکھتا ہے ؎

تو شدّاد ہور عاد نمرود کوں — خدا کر نہ پوجے تو معبود کوں
اگر فیل و مور اژدر و بق اہے — ہر یک شے منے مظہرِ حق اہے
تو کرتا ہے انکار کفّار سوں — نہ کفّار سوں بلکہ کرتار سوں
اہے کفر و اسلام کرتار کا — جو جینے میں تاگا سو زنّار کا
وے جو ہوا سو موحد ہوا — موحد ہوا نیں سو ملحد ہوا

رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۹ء ص ۴۸

اس کے بعد راجہ رام راج حسین نظام شاہ کو نصیحت کرتا ہے کہ گائے کے گوشت سے پرہیز کرو، دکن میں رہ کر مکّہ کی فکر نہ کرو بلکہ تو مل کی حیثیت سمجھنے کی کوشش کرو۔ عرب کی عزّت اور اس سے محبّت کی بجائے یلورا اور دولت آباد کی حفاظت کی فکر میں مصروف رہو ؎

قوی کر یلورے کی بنیاد کوں — جو خجلت اچھے قصر شدّاد کوں
نہ کم مان دے دولت آباد کوں — نہ سرپار کر دیکھ شمشاد کوں

ایضاً ص ۴۸

راجہ رام راج نظام شاہ کو خط لکھتا ہے جس میں خراج طلب کیا ہے، اور دھمکی دی ہے کہ اگر خراج نہ بھیجا تو تیری حکومت کا نیست و نابود کر دوں گا اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ ترکاں کوں چھوڑوں نہ ترکی کماں — اگر گیو رستم ہو حاضر ضماں

---

لہ لہ مل کر سہ جنگ

نہ چھوڑوں مُلانا نہ چھوڑوں فقیر　　نہ بڑا نہ لڑکا نہ بورنا نہ پیر
ادک دور بنیاد اسلام کی　　جو مانے دراہی[1] جگت رام

رسالہ اُردو جولائی ۱۹۲۹ء ص ۵۴۸

اس کے بعد درج ذیل عنوانات قائم کئے ہیں۔
"سوار شدن نظام شاہ برائے جنگ رام راج"
"مستعد شدہ آمدن رام راج برائے جنگ نظام شاہ"

ان عنوانات کے تحت رسالہ اُردو میں صرف تین اشعار درج ہیں۔ جن سے یہ بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ طرفین کی فوجوں کی صف بندی کیونکر ہوئی، فوجوں کی لڑائی اور تیاری میں کیا کیا انتظامات کئے گئے آخری عنوان جس پر مثنوی کا خاتمہ ہوتا ہے اور نظام شاہ کو فتح حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نظام شاہی لشکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتا ہے اور راجہ رام راج کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جاتا ہے۔

"فتح یافتن نظام شاہ بر لشکر رام راج و سر او بریدہ پیشِ تغال فرستادن"

کلپ[2] جو کلنگان کے دو دیکھ عین　　چلیا فوج رچ باندھ بھیری حشین
چلیا دل کھنڈل چوں گرج جتیا　　دندی بھول اوسان گئے اٹ پٹیا ص ۵۵۱

غرض یہ

خلل تھا کفر کا دیا جس خدا　　کیا رام کا سیس تن سے جُدا۔ ایضاً ۵۵۲

اور شہر وجیا نگر کو بڑی بے دردی سے لوٹا گیا۔ فتح نامہ نظام شاہ ایک تاریخی مثنوی ہے۔ اگر مثنوی مکمل صورت میں دستیاب ہو جاتی تو شاید کچھ اہم تاریخی شواہد سامنے آجاتے اور حسین نظام شاہ اور راجہ رام راج کے کردار و گفتار پر بھی اور زیادہ روشنی پڑتی۔

---

[1] آفاقی　[2] منصوبہ

Marfat.com

حسن شوقی کی یہ مثنوی ادبی لحاظ سے بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے، اس میں جہاں تشبیہات کے انوکھے پن اور ہندی فارسی الفاظ کی پیوندکاری سے ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے، وہیں غیر مانوس الفاظ بھی ملتے ہیں۔ شوقی پُرگو شاعر تھا جس نے رزمیہ اور بزمیہ دونوں رنگ کی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ مثنویوں میں منظر نگاری، مرقع کشی اور واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ بعض جگہ جذبات نگاری کا بھی کمال دکھایا رزمیہ مثنویوں کے لئے بلند آہنگی لازمی ہے۔ اس لحاظ سے بھی مثنوی کمزور نہیں۔ غرض مثنوی جہاں شاعرانہ خصوصیات کی حامل ہے وہاں تاریخی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" میں رائے دی ہے :۔

"یہ مثنوی اس عہد کی شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔ زورِ بیان واقعہ نگاری، اظہارِ جذبات، تشبیہات و استعارات کی ندرت کے لحاظ سے بہت کم دکنی مثنویاں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں" [1] ص ۲۹۲

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"یہ مثنوی فنی اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہم اور قابلِ قدر ہے۔ اس میں جنگ کے واقعات و حالات کی تفصیل مل جاتی ہے۔ جو دوسرے ذرائع سے نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔"

**میزبانی نامہ**

حسن شوقی کی یہ دوسری مثنوی ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۹۸۲ھ ہے۔ پہلی مثنوی "فتح نامہ نظام شاہ" تھی اور اس وقت کی تصنیف ہے جب شوقی کا تعلق نظام شاہی دربار سے تھا۔ مثنوی "میزبانی نامہ" سلطان محمد عادل شاہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حسن شوقی کا نظام شاہی سلطنت کے زوال کے بعد اپنی سیلانی طبیعت کے سبب دربار سے

---

[1] ہاشمی نصیر الدین ۔ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو ۔ ص ۲۹۲

Marfat.com

الگ ہو کر بیجاپور کا رُخ کیا۔ اور سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں مثنوی لکھی۔ جس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ نے کسی خاص تقریب پر میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔

یہ مثنوی بھی مکمل صورت میں دستیاب نہ ہو سکی۔ حسن شوقی کی اس مثنوی کا ذکر "رسالہ اُردو"[1] اور "علی گڑھ تاریخ ادبِ اُردو"[2] میں کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کی تاریخی اہمیت صرف اتنی ہے کہ اس میں محمد عادل شاہ کی شادی کا ذکر ہے۔ بادشاہ نے اپنے وزیرِ اعظم مصطفیٰ کی صاحب زادی تاج جہاں بیگم سے ۱۰۴۳ھ میں نکاح کیا اس شادی کا ذکر صرف "محمد نامہ"[3] میں ملتا ہے اس کے علاوہ دوسری تاریخوں اور تذکروں میں کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وزیرِ اعظم مصطفیٰ خاں کی تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ وہ عرصہ تک سلطنتِ عادل شاہی کے انتظامات میں سیاہ و سفید کا مالک رہا تھا۔ کیسے ممکن تھا کہ حسن شوقی محمد عادل شاہ کے ساتھ اس کی لڑکی کے نکاح کا بے بنیاد ذکر کرتا۔ علاوہ اس کے سیاسی مصلحت کی بنا پر بھی عین ممکن ہے کہ محمد عادل شاہ کی شادی مصطفیٰ خاں کی لڑکی سے ہوئی ہو۔

محمد عادل شاہ کی شادی کے واقعہ سے ہی اس مثنوی کو تاریخی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، ورنہ اس کی اصل نوعیت محض سماجی اور تہذیبی ہے۔ حسینی شاہد نے نادر غزلیات[4] حسن شوقی کے عنوان کے تحت بڑی سلجھی ہوئی رائے دی ہے:۔

"فتح نامہ نظام کو اگر تاریخی اہمیت حاصل ہے تو میزبانی نامہ کو اپنے

---

[1] مولوی عبد الحق "رسالہ اُردو" جولائی ۱۹۲۹ء۔ ص ۵۵۲ - ۵۵۷

[2] شعبۂ اُردو علی گڑھ تاریخ ادب اُردو یونیورسٹی علی گڑھ طبع اوّل ۱۹۶۲ء

[3] محمد نامہ بحوالہ مسعود حسین خان قدیم اُردو جلد اوّل ۱۹۶۵ء مطبع المعارف حیدرآباد ص ۵۱۴

[4] حسینی شاہد نادر غزلیات بحوالہ قدیم اُردو مرتبہ مسعود حسین خان شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۶۵ء ص ۵۶۴

Marfat.com

عہد کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ داری کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے۔"

اس مثنوی کا آغاز بھی حسن شوقی نے حمد سے کیا ہے۔ بادشاہ کی مدح کے بعد اصل واقعہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پہلی مثنوی کی طرح اس مثنوی میں بھی ضمنی عنوانات فارسی نثر میں دیئے گئے ہیں۔ اس میں پہلی مثنوی کی بہ نسبت روانی زیادہ ہے۔ تشبیہات و استعارات کا انوکھا پن ملاحظہ ہو۔ جب مصطفیٰ خاں محمد عادل شاہ کو اپنی بیٹی سونپتا ہے یعنی چاند کو سورج کے حوالے کرتا ہے ؎

دیا چاند کو سور[1] کے سات[2] کر　　　دیا نور کوں نور کے سات کر

ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، ان سے نہ صرف شاعر کی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے، بلکہ مثنوی کی قدر و منزلت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ شہر میں بادشاہ کی سواری نکلتی ہے ؎

سدا دار پہ تجہ منگل گڑ گڑیں　　　منگل گڑ گڑیں جیوں بدل گڑ گڑیں
ہتھی[3] مست پر پیلبان مست ہے　　　زبردست پر کیا زبردست ہے
سدا دار پہ تجہ طبل باجتے　　　طبل باجتے ہور مندل کا جتے
بہت دیس سے شہ کی گھر کاج ہے　　　شہر گشت گی رات سو آج ہے

از اُردو رسالہ جولائی ۱۹۳۹ء ص ۵۵۶

شادی کے موقع پر آتشبازی کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ ہوائیوں کو ناگنوں سے اور اُن کی چنگاریوں کو سنپولوں سے کیا انوکھی تشبیہ دی ہے ؎

ہوائیاں نتھیاں واتھیاں ناگنیاں　　　ہوا کے اوپر جا سنپولے جنتیاں

لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شوقی راجہ رام راج کے عہد کی شان و شوکت

---

[1] مُراد، سورج [2] مُراد، ساتھ [3] مُراد، ہاتھی

Marfat.com

ابھی بھولا نہیں۔ محمد عادل شاہ کی شادی کی تعریف کرتے ہوئے دبی زبان سے کہتا ہے ؎

تیا خرچ پاناں ہوا راج کاج  نہ سو نے میں دیکھا کبھی رام راج

یہ مثنوی دُعائیہ اشعار پر تمام ہوتی ہے ؎

قلم (دگر) کروں راس سب بانس کے  سیاہی دریا کا غذ آکاس کے

لکھئے ہور لکھے بھرے یو تمام  صیفت شہ کی پوری نہووے والسلام

تو بہتر کہ شوقی زراہِ صواب  دعا دو کرے جو اچھے مستجاب

سدا جیو راجے جنم راج کر  جو دشمن مونڈی تل کرے لاج کر

کرے راج جو لگ گگن دھر تری  کرے راج جو لگ پرب استری

شہریار خاطر تیں شاد دار  قیامت لگوں یو رہوے یادگار (ص ۵۵ ایضاً)

حسن شوقی کی مذکورہ بالا دو مثنویوں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جس سے اس کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

# نصرتی

محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ حسب و نسب ابتدائی تعلیم و تربیت حالاتِ زندگی اور عادل شاہی دربار سے وابستگی کے متعلق جو کچھ مختصر سے حالات ملتے ہیں وہ اُن کی اپنی تصانیف "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ" کے چند اشعار سے ماخوذ ہیں۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے مُلّا نصرتی کے متعلق مزید تحقیق کی جس کا ذکر انہوں نے اپنی تصنیف "نصرتی" میں کیا ہے۔ "تذکرہ شعرائے دکن"[1] "چمنستان شعرا"[1] اور گارساں دتاسی کے بیانات سے جو کچھ مُلّا نصرتی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ نہ صرف بغیر کسی حوالے یا شواہد کے درج ہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہیں۔ سال وفات کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ فتوت نے تذکرہ ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ ملا نصرتی بیجاپور کی فتح ۱۰۹۷ھ میں زندہ تھے۔ مصنف تذکرہ شعرائے دکن نے وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "گلشن عشق" کے قلمی نسخے میں درج قطعہ سے سال وفات ۱۰۷۵ھ ثابت کیا ہے۔ بہرحال ایک بات جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نصرتی نے عادل شاہی کے تین آخری فرمان رواؤں کا زمانہ دیکھا اور طویل عمر پائی تھی۔

مُلّا نصرتی کی تصانیف جو اب تک کی تحلیق کے مطابق دست یاب ہو چکی ہیں ان میں تین مثنویاں اور کچھ غزلیں اور رباعیاں مخمس ہجو اور قصیدے شامل کیے جا سکتے ہیں۔ مثنویوں میں پہلی مثنوی "گلشنِ عشق" ہے جو ۱۰۶۸ھ کی تصنیف ہے۔ یہ بزمیہ داستان ہے جس نے نصرتی کو عوام میں روشناس کرایا۔ دوسری مثنوی "علی نامہ" ہے جو ۱۰۷۶ھ کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی پہلی مثنوی "گلشنِ عشق" کے برعکس رزمیہ ہے۔ تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" ہے جو ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے

---

[1] مولوی عبدالجبار۔ تذکرہ شعرائے دکن بحوالہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نصرتی۔ ص ۵

Marfat.com

اس میں نصرتی نے بہلول خاں اور شواجی مرہٹہ کی لڑائی کا ذکر کیا۔ چونکہ ہمارا موضوع "اُردو کی تاریخی مثنویاں" ہے۔ اس لئے ہم صرف مُلا نصرتی کی آخری دونوں مثنویوں پر روشنی ڈالیں گے۔

**علی نامہ**[۱] علی نامہ کے دو قلمی نسخے یورپ[۲] کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں سنٹرل ریکارڈ آفس اور سالارجنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ کرم خوردہ اور ناقص الآخر ہے۔ اس مثنوی کو پہلی بار مولوی عبدالحق نے تنقیدی انداز میں مع شرح شائع کیا۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے ۱۹۵۹ء میں سالارجنگ دکنی پبلشنگ کمیٹی کی سرپرستی میں شائع کیا۔

نصرتی نے بعض اشعار میں "علی نامہ" کو "فتح نامہ" کے نام سے بھی موسوم کیا ہے مگر صحیح نام "علی نامہ" ہے۔ قدیم رنگ کی مثنویوں کی طرح نصرتی نے مثنوی کی ابتدا حمد سے کی ہے۔ جو چھتر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مناجات کے ساٹھ اشعار ہیں پھر نعتِ رسولؐ اور منقبت علی کے بعد ذکر معراج وسببِ تالیفِ کتاب بیان کیا ہے۔ اس کے بعد شاعر اصل موضوع کی طرف بڑھتا ہے۔ اس مثنوی میں جو قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ بات ہے وہ یہ کہ اس کے ضمنی عنوانات نثر کی بجائے نظم میں لکھے گئے ہیں۔ ہر شعر نئے عنوان کا اشارہ ہے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ عنوانات کے ذیل میں درج تمام اشعار اگر یکجا کر دیئے جائیں تو ایک اہم قصیدہ رونما ہو جاتا ہے جس میں مثنوی کا مکمل موضوع جھلکتا ہے۔

نصرتی نے سب سے پہلے دکنی سلطنت کی مجموعی صورت کا نقشہ کھینچا ہے۔ کسی بادشاہِ وقت کی وفات کے بعد جب دوسرا فرد وارثِ تاج و تخت بنتا ہے تو اس وقت عموماً سلطنت کی حالت ڈانواں ڈول ہوتی ہے۔ اُمرا و وزرا میں اقتدار کی

---

۱؎ ہاشمی نصیرالدین اُردو مخطوطات، کتب خانہ آصفیہ، جلد اول ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۴۳

۲؎ ہاشمی نصیرالدین، یورپ میں دکنی مخطوطات، جلد اول شمس المطابع عثمان گنج حیدرآباد۔ ۱۹۳۲ء۔ ص ۲۸۷

Marfat.com

جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اگر وارثِ تخت جوان اور امورِ سلطنت سے واقف ہوتا ہے تو وہ سلطنت کی دگرگوں حالت کو سنبھال لیتا ہے۔ اگر حکمران بہادر دُور اندیش سیاست داں نہیں ہوتا تو اس کا کامیاب ہونا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور دشمنانِ حکومت کی بن آتی ہے۔ محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اور علی عادل شاہ کی تاج پوشی کے وقت، سلطنت کی جو حالت تھی اُسے خود نصرتی[1] کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے ؎

کہ القصہ یوں[2] پادشاہی کے کام — درست ہونے[3] لگ اد غنیماں تمام

مخطوطہ سالار جنگ میوزیم ص ۲۴

نکھنے ہور بڑے تھے سو سب بدنہاد — اچائے اد[4] چاروں[5] طرف تے[6] فساد

مخالف تو[7] اکثر منافق ہوئے — موافق بی کئی[8] ناموافق ہوئے

بڑے برج[9] کے شہ[10] اپنا[11] کم سنی منے — نوی پادشاہی نوے دن منے

کبل سخت بازیاں چہ بڑنے لگیاں — بڑیاں[12] شد تاں روز گھرنے لگیاں ایضاً ص ۲۴

دے شاہ[13] ہمت سوں کر دل[14] قوی — نوے کام پر کر تردد نوی

ماخوذ از علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید ص ۷۱

یک یک کام لک بل سوں ساندن لگیا — یک یک تہ تردّد سوں باندن لگیا ایضاً ص ۷۵

مگر فتنہ فساد کی آگ جو چاروں طرف بھڑکی ہوئی تھی وہ ابھی ایک طرف سے قابو میں نہ آنے پائی تھی کہ دوسری طرف سے بھی بھڑک اُٹھی۔ خانگی جنگی حالات قابو میں نہیں آئے تھے کہ بیرونی حملہ آور شواجی مرہٹہ نے بھی فتنہ برپا کردیا مگر عالی ہمت بادشاہ نے جواں مردی کا ثبوت دیا اور اس فساد کو فرو کرنے کے لئے ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں اپنے

---

۱ یہ مضمون مخطوطہ سالار جنگ میوزیم کے علاوہ نصرتی از مولوی عبدالحق اور علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید کے تقابلی متن کی امثال پر مرکوز ہے۔

۲ نصرتی از مولوی عبدالحق میں "تو" ۳ "ہوئیں" ۴ "وہ" ۵ "چاروں" ۶ "تھے" ۷ "متواہے" ۸ "کے"، ۹ "بڑی ارج" ۱۰ "کی" ۱۱ "اپنے" ۱۲ "بڑیاں" ۱۳ "شاہ" ۱۴ "لکر"

Marfat.com

سپہ سالار افضل خان کو مقرر کیا۔ لیکن افضل خاں شواجی کی مکاری کا شکار ہوا اور راہی ملکِ عدم ہوا۔ فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس کا انتقام لینے کی خاطر دوسرے سپہ سالار جوہر صلابت خان کو روانہ کیا گیا، جس نے سلطنت کے ساتھ غداری کی اور شواجی سے مل گیا۔ آخر کار علی عادل شاہ کو مہم کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینی پڑی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علی عادل شاہ نے قلعہ پنالہ بہت جلد فتح کر لیا۔ مُلّا نصرتی نے فتح کی تاریخ درج ذیل مصرعہ سے نکالی ہے ؎

"علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں"

جس سے ۱۰۷۱ھ نکلتا ہے۔

علی عادل شاہ سے منہ کی کھانے کے بعد شواجی مغلیہ علاقہ پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ جب اورنگ زیب نے جنرل شائستہ خاں کو شیواجی کے مقابلہ پر بھیجا تو اس نے اپنی دیرینہ مکارانہ چالوں سے مغلیہ فوج کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے جسونت سنگھ کو روانہ کیا گیا۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جسونت سنگھ کو بھی منہ کی کھانی پڑی۔ آخر کار اورنگ زیب نے علی عادل شاہ سے معاہدہ کیا جس کی رُو سے دونوں حاکموں کی فوجوں کو مل کر شیواجی کا مقابلہ کرنا تھا۔ مغلیہ فوج کی کمان اس وقت جے سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۰۷۵ھ کا زمانہ تھا، بیجاپوری فوج جنرل خواص خاں کی نگرانی میں شیواجی کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئی جس نے مغلیہ فوج کے آنے سے پہلے شیواجی کو شکستِ فاش دے دی تھی۔ مغلیہ فوج نے راجہ جے سنگھ کی سرکردگی میں شواجی پر حملہ کیا تو اُس نے صلح کی پیش کش کر دی جسے جے سنگھ نے منظور کر لیا۔ جے سنگھ اور شیواجی کی آپسی صلح سے دکن کی بساط اُلٹ گئی۔ عادل شاہی حکومت کو اس صلح سے زبردست سیاسی دھکا لگا۔ شیواجی نے علی عادل شاہ سے دیرینہ بدلہ لینے کی خاطر جے سنگھ کو عادل شاہی حکومت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور لڑائی میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ جے سنگھ نے اس

Marfat.com

عہد نامہ کو جو سلطنتِ بیجاپور اور سلطنتِ مغلیہ کے درمیان ہوا تھا بالائے طاق رکھ کر بیجاپور پر چڑھائی کر دی۔ ۱۰۷۶ھ میں جے سنگھ نے بیجاپور پر یکے بعد دیگرے پانچ حملے کئے مگر ہر بار منہ کی کھانی پڑی۔ ان شکستوں سے جے سنگھ کو اتنا صدمہ پہنچا کہ ۱۰۷۷ھ مطابق ۱۶۶۶ء میں بیجاپور سے مایوس لوٹتے پر راستے میں برہان پور کے مقام پر پیوندِ خاک ہوا۔

شیواجی مرہٹہ اور مغلیہ حکومت کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی نے کرنول، بدنور، تورگل اور رائچور کے راجاؤں اور قلعہ داروں کو بھی ان کی سرکشی کی سزا دی۔ علی نامہ کی شہرت ان تاریخی مہمات کی بنا پر تو ہے ہی اس کے علاوہ اس میں بیجاپور کی سیاست کے پیچ و خم، بادشاہ کی جاہ و حشمت، شاہی دربار کی رونق، امرأ و وزرائ کے آدابِ نشست و برخاست اور ان کی سلطنت سے وفاداری کے نمونے بھی نصرتی نے پیش کئے ہیں۔ جنگ و جدل کے ساتھ قدرتی مناظر کی تصویر کشی اس دلکش انداز میں کی گئی ہے کہ قاری شاعر کی فنکاری کا قائل ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں محاکات نگاری کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔ علی نامہ کے مطالعہ سے اس وقت کی تہذیب و تمدن کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس مثنوی میں اردو اور فارسی کی بہترین پیوند کاری کی گئی ہے۔ تاریخی واقعات و جنگ و جدل کا نقشہ خالص مؤرخانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود نصرتی میدانِ کارزار میں مصروفِ پیکار ہے یا آنکھوں سے دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔ اردو ادب میں رزمیہ مثنویوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور نہ ہی ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ پڑھنے والا ان پر فخر کر سکے۔ علی نامہ رزمیہ کا شاہکار نہ سہی، لیکن اردو کی رزمیہ مثنویوں میں علی نامہ جیسی شاید ہی کوئی دوسری مثنوی مل سکے۔ مولوی عبدالحق کا یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے:۔

"یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے"[1]

---

۱؎ مولوی عبدالحق۔ نصرتی۔ انجمن اردو (ہند) نئی دہلی۔ ص ۸۲

Marfat.com

علی نامہ کو نری شاعری کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کی تمام مثنویوں اور قصیدوں کو جو علی نامہ میں ہیں جذبات کا سمندر کہہ کر تنقید کا فرض ادا کیا جا سکتا ہے۔ علی نامہ دکن کا شاہنامہ ہے اور نصرتی کو اس پر بجا فخر ہے۔

کہتا ہوں سخن مختصر بے گماں　　کہ یو شاہ نامہ دکن کا ہے جان

جس نے بیجاپور کی بہت سی مشہور و معروف شخصیتوں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ اس طویل تعارفی بیان کے بعد چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے نہ صرف اوپر کے دلائل کو تقویت پہنچتی ہے، بلکہ نصرتی کی شاعرانہ قادر الکلامی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۵

سیوا کہ[۱] جو یک[۲] فتنہ انگیز تھا　　بڑا دزد[۳] موذی و خونریز تھا
دکن کی زمین بیچ[۴] تخم فساد　　جو پڑیا سو اوّل یہی بدنہاد
رعیت جتا خوار اس[۵] شوم تے[۶]　　ہوا ملک ویران اس[۷] بوم تے[۸]
جو بد اصل تھا سو بڑا یا نتھا　　سکیا اس تے صاحب سوں باغی بنیا
دکھاوے تو ٹک اپنی تلبیس کوں　　لگے ورد لاحول ابلیس کوں

ماخوذ نسخہ سالار جنگ ص ۲۵ اور ماخوذ علی نامہ، مرتبہ پروفیسر عبد المجید۔ ص ۴۶

اس طرح جذباتی انداز میں نصرتی بہا چلا جاتا ہے اور شیواجی کی سیرت اور فتنہ انگیزی کی قلعی کھول دیتا ہے۔ افضل خاں شواجی مرہٹہ پر چڑھائی کرتا ہے اور اس کی پر فریب چالوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ نصرتی نے اس حادثہ کی تصویر مندرجہ ذیل اشعار میں پیش کی ہے۔

یو خنزیر کوں مار کرنے کوں زیر　　دیے تس پہ چھوڑا افضل[۹] یک نرہ شیر
کہ جب شیر اوجا کہ نرغا کیا　　دہیں فن سوں روباہ بازی لیا
دغا کی پری لے کہ یکبارگی　　کیا سوچہ تس جیو کی آوارگی

---

نصرتی از مولوی عبد الحق میں۔ ۱ کہ ۲ ایک ۳ چور ۴ بیچ ۵ اس ۶ تھے ۷ تس ۸ تھے

۹ مراد افضل بیجاپوری مشہور جنرل۔

مسا پر یک وہیں لے کہ خنزیر کا | ولایت کھنڈ لتا چہ چوندھیر کا
دغا سو نسچہ یک چور مارک تے چڑ | کیا قبض جاکر پنا لے کا گڑ

نسخہ سالار جنگ ص ۲۵ اور علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبد المجید ۔ ص ۷۴

علی عادل شاہ سے شکست کھانے کے بعد شیواجی نے مغلیہ سلطنت کی طرف رُخ کیا اور مغلیہ سلطنت پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب نے اپنے جنرل شائستہ خاں کو بڑی کثیر فوج کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا[۱]

کہ تب یک مغل کا بڑا صوبہ دار | سیو یا کے اتھاموں پہ نت لیکہ بھار
بڑا جس کو شاہِ مغل مانتا | قوی بازوئے سلطنت جانتا
بڑا رائے زن دور اندیش تھا | بڑے کام پر تس قدم پیش تھا
بلند شان کا اس کی دہلی پہ داب | اتھا اس کو شائستہ خاں کر خطاب

ن بس ۔ م ایضاً ص ۶۳ اور علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبد المجید ص ۱۷۹

شائستہ خاں پونے کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ شیواجی نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں حملہ کیا اور مغل فوج کو بہت جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ اس موقعہ کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

کہ شائستہ خاں تب سہلیاں میں تھا | کہ نہار سکھ خوش رنگیلیاں میں تھا
جو تھے گھر کے چوندھر نگہباں کتے | ہر یک ٹھار انگے بنکر کتے درباں کتے
نہ اس ٹھار ابلیس کوں تھا مجال | گیا دہاں تلک بیس لہو کا کھلال
سوتا تھا سو تس نیند جانے اُچٹ | اچھایا کھرک آب ات موں پہ سٹ
نہ دشمن کو مقابل پہ آنے دیا | نہ ہتھیار پر ہاتھ بھانے دیا
کھپا کھپ کتے جلد داراں پہ وار | لگے گھاؤ پر گھاؤ سب تن منجھار

---

۱ شائستہ خاں امیر الامراء اورنگ زیب کا مشہور جنرل۔

نصرتی از مولوی عبد الحق میں اس طرح ہے۔ ۲ جو ۳ کہ ۴ کتے ۵ و ۶ کتے ۷ اوس ۸ کتے ۹ کہ گھاواں پہ گھاواں لگے تن منجھار۔

Marfat.com

وہیں شرق تے تا غرب لک دم منے[1] — یو ہوئی بات مشہور عالم منے[2]
شنایو خبر شاہ دہلی شتاب — رہیا خشک ہو اوٹ جا جیو کا آب
لئے باج اس کام کا انتقام — ہوا بادشاہی تصرف حرام

ایضاً۔ ن س م۔ ص ۶۴ اور علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید ص ۱۸۰، ۱۸۱

شہنشاہ اورنگ زیب نے انتقام لینے کے لئے جسونت کو بھیجا، لیکن نا اہل سردار میدانِ جنگ میں مقابلہ کی تاب نہ لاسکا۔ اورنگ زیب نے مصلحتاً علی عادل شاہ سے عہد نامہ کرلیا جس کی رُو سے مغلیہ اور بیجاپوری فوجوں نے مل کر شیواجی کا مقابلہ کرنے کو اترنا تھا۔ اس وقت مغلیہ فوج کی کمان جے سنگھ کے ہاتھ میں تھی اور بیجاپوری فوج خواص خاں کی سرکردگی میں روانہ ہوئی۔ مغلیہ فوج ابھی پہنچی بھی نہ تھی کہ بیجاپوری فوج نے پہلے شواجی کو شکستِ فاش دے دی تھی۔ نصرتی نے اس لڑائی کا منظر بڑے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے :۔

ہُوراس گھاٹ کے تل جو ہے کوہ کن — رہے[3] روز روشن کو واں[4] جیون رین
اندھارا ملیا یوں دسے نورسوں — کہ دِن جفت ہے شام دیجورسوں
اندھارے سوں تارے وسیں دن تمام — کریں نت رصد بند[5] واں بیٹ کام
اودے[6] زمیں گرچہ محبوب ہے — نظر میں سورج کی بھی محجوب ہے
زمیں استری ہے شو[7] صاحب جمال — رکھی[8] ہے یو قطعہ ایس مکھ پہ خال
اندھارا تو عالم کا ہے واں جمع — و لے یک اندھالے میں کئی لک[9] ہیں شمع

مخطوطہ سالار جنگ ص ۷، اور علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبدالمجید ص ۱۹۳-۱۹۴

کوہستانی ہیبتناکی کی جنگل کی پرشکوہ کیفیت، اندھیرے میں اُجالے کی قدر و قیمت کا بیان نہایت ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔ اس قدرتی مناظر کے بعد جنگ کا

---

۱۔۲۔ بمعنی میں

۳۔ رہوے ۴۔ ہو وہاں جو ۵۔ کریں بیٹھ نت وہاں رصد بند کام ۶۔ وو کے ۷۔ سوں کہے ۸۔ کا ۹۔ لکھ

Marfat.com

منظر ملاحظہ ہو ؎

کھنا کھن تے کھڑکاں کے یو شور اُٹھیا — جو تن میں پہاڑاں کے لرزہ چھوٹیا
ہویاں لہو کیاں چھینٹکاں ہوا پر بخار — سلے[1] تیغ جیباں سوں شعلے ہزار
فرنگاں پہ لہو کے کھلالے دسیں — انیاں پر تے دھاراں پنالے دسیا

م بس۔ ج ص ۷۶ – ۷۷، علی نامہ مرتبہ پروفیسر عبد المجید ص ۲۱۰ – ۲۱۱

ان چند اشعار سے نہ صرف نصرتی کے شاعرانہ مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس نے رزمیہ کیفیت دکھانے میں بھی کمال کیا ہے۔ جنگل میں جب غنیم کی فوج میں بھگدڑ مچ جاتی ہے تو اس بھیانک منظر کو کس ظریفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

لیا نہا ٹھیاں کا ہو ہر جھاڑ کال — منڈاسا چہ[2] کوئی کمرے[3] چینونٹی کے بال[4]
سٹیا آنک پر جس کے کانٹے کا ہات — لیا کار کیڑیاں کوں چنٹریا[5] سنگات
ہر یک[6] جھاڑ پہنیا دسیا اس گھڑی — زنگار رنگ مکڑیاں[7] کی خوش گودڑی

نسخہ سالار جنگ۔ ص ۷۹ علی نامہ مرتبہ عبد المجید ص ۲۱۲

نصرتی، سلطنتِ مغلیہ اور بیجاپور کی فوج کو برابری کا درجہ دیتے ہوئے شواجی کو پاسنگ قرار دیا ہے جو گا ہے ایک طرف جھک جاتا ہے گا ہے دوسری طرف جدھر پلڑا بھاری دیکھتا ہے ادھر جھک جاتا ہے یہ تشبیہہ کی ندرت ہے کہ پڑھنے والا شاعر کی فنکاری کا اسیر ہو جاتا ہے ؎

دو نوں[8] بھار ہم تول تھے یوں اگر — سیوا[9] ان میں پاسنگ کا تھا پتھر
جو یک دل کھڑا رہے پہ یک تک چلے — نوے یک طرف یک طرف ڈھلے

نسخہ سالار جنگ میوزیم ص ۷۹ اور علی نامہ مرتبہ عبد المجید ۲۸۲

تشبیہہ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ مغلیہ فوج کی توپوں کو زنجیر سے محسوس ہونے کو

---

[1] ئیس [2] یہ [3] کوئی سو چیونٹے کے بال [4] چنبڑی [5] جتیاں [6] کڑیاں [7] یک [8] دو نوں [9] سیوا

سانپ کی کنڈلی قرار دیا ہے ؎

کہ بیٹھا رچ ہے لگ کنڈل مار سانپ | سٹیگا رچ بے فکر چھیڑے تو چھانپ

علی نامہ مرتبہ:۔ عبدالمجید۔ ص ۲۸۳

مغلیہ فوج نے جے سنگھ کی سرکردگی میں بیجاپور پر یکے بعد دیگرے پانچ حملے کئے اور ہر بار منہ کی کھانی پڑی۔ تیسرے حملے کے وقت ضرور مغل سپاہ کا پلڑا بھاری رہا۔ بیجاپور کی فوج کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ نصرتی نے اس بار کے حملے کو بھی عادل شاہی فوج کی فتح بتایا ہے، جو ٹھیک نہیں۔ درحقیقت عادل شاہی فوج کو مغلیہ فوج نے مار بھگایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مغلیہ فوج کو بھی مالی و جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مغلوں کے لئے اس بار کی جیت کوئی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ چوتھی بار کے حملے کے بعد شرزہ خاں میدان سے لوٹ رہا تھا تو اچانک گھوڑے سے گر پڑا۔ اس حادثے نے اس کی جان لے لی۔ اس کی موت کی خبر سن کر جے سنگھ کو ڈھارس بندھی، اور پچھلی شکستوں کا بدلہ لینے کی خاطر پوری تیاری کے ساتھ بیجاپور پر ۱۰۷۶ھ میں حملہ کیا۔ شرزہ خاں کی موت کی تلافی اس کے دو لڑکوں خواص خاں اور بہلول خاں نے پوری کر دی تھی۔ جے سنگھ کو اس بار بھی منہ کی کھانی پڑی۔ اس ہار سے جے سنگھ کی ہمت ٹوٹ گئی۔ مایوس ہو کر بیجاپور سے خاندیس کو روانہ ہوا اور برہان پور میں پیوندِ خاک ہوا۔ آخری لڑائی کے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں، جس وقت جے سنگھ نے بہلول خاں پر دھاوا بولا ؎

سنیا بات خان خواص اس گھڑی | کہ بہلول پر سب لڑائی پڑی

کھیا تب کے دشمن کو لینا اتال | ملا بیگ دے مار دینا اتال

بھرانا ادل سانپ کوں دم کھنڈل | پچھیں سر کچلنا جیوں ہوئے بل

وزیراں یو سن بات اتادل ہوئے | سپاہی جتے رن کے بادل ہوئے

آٹھیا خاں شیراں کی لے فوج مست | خلف خاں شرزے کا تھا پیش دست

مغل ہور دکھنیاں میں آرنج پڑیا | رہے رنج کے ہم بھائے جیوں سیج پڑیا

Marfat.com

چلے کھا کے اُس دن تو ایسی شکست  لگے ملک دہلی تلک لگ ہو رست

نہ آب اُن کوں میداں میں پینے دیے  سراب اُن پہ جمنا کا پانی کیے

نسخہ سالار جنگ - ص ۱۸۳ - ۱۸۵ ، اور علی نامہ مرتبہ :- پروفیسر عبدالمجید - ص ۱۴۴ - ۱۴۵ - ۱۴۹ -

مثنوی کا اختتام بھی قابلِ تعریف ہے بادشاہ کی سرپرستی اور علم دوستی کی تعریف کرتے ہوئے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اہلِ کمال کی سرپرستی اور ہمت افزائی کرنے والے حکمران خوش قسمت ہوتے ہیں جبکہ اکثر شعرا بادشاہ کی علم دوستی کو اپنی خوش بختی خیال کرتے ہیں۔ مثنوی کا آخری شعر ہے

تلک جس سوں یو شہ مظفر اچھو  دندیاں پر سدا تیغ نس دراچھو۔ [۴۸]

کے پڑھنے کے بعد جو بات کھٹکتی ہے اور ذہن میں بار بار آتی ہے وہ یہ کہ مثنوی علی نامہ علی عادل شاہ ثانی کے ۱۰۶۶ھ سے ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۶ء کے صرف ابتدائی نو دس سالوں کے تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ نہ جانے نصرتی نے علی عادل شاہ کے آخری چھ سات سالوں کی تاریخ کے واقعات کیوں نہیں نظم کیے۔ اگر اس عہد کے مکمل حالات نظم کر دیئے ہوتے تو کم سے کم ایک بادشاہ کے عہدِ حکومت کی پوری منظوم تاریخ تو محفوظ ہو جاتی۔

مُلّا نصرتی نے اس مثنوی میں تاریخی واقعات ایسی ترتیب اور حقیقت بیانی سے نظم کئے ہیں کہ اس کے تاریخی اور ادبی مرتبے کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اس طرح مصنف نے نہ صرف بہترین شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے بلکہ مؤرخانہ عظمت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "علی نامہ" کے متعلق بڑی جچی تلی رائے دی ہے :-

"تاریخ سے واقعات کو ملا دیکھئے کہیں فرق نہ پایئے گا۔ بلکہ بعض باتیں شاید ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے" [۴۹]

---

نصرتی از مولوی عبدالحق میں یوں ہے ... (footnote partially illegible)

[۴۹] مولوی عبدالحق نصرتی انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی - ص ۸۲

پروفیسر عبدالمجید "علی نامہ" کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں :-

"لیکن نصرتی اپنی شاعری میں تاریخی صحت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا یہی تو اس کی شاعری کا کمال ہے اس وجہ سے علی نامہ کو ایک زندہ تاریخ کہنا پڑتا ہے اس میں ہر چھوٹا بڑا واقعہ اس قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ تفصیل دوسری تاریخوں میں نہیں ملتی کیونکہ تاریخ کے صفحات میں اتنی گنجائش کہاں کہ ہر چھوٹی موٹی چیز بیان کی جائے، علی نامہ کا مواد تاریخ کا بڑا ماخذ ہے"

مؤرخ کو جن اصولوں کا پابند ہونا چاہیئے نصرتی کو اس کا احساس ہے ؎

لیا ناؤں جس بختور کا نواز ۔۔۔ رھیا تا ابد جگ میں وہ سرفراز
بڑے کام اکثر رکھیا نہیں نہاں ۔۔۔ ضرور جو تھے سو کیا کر بیاں
میری بات میں لاف نیں ہے خلاف ۔۔۔ کہ نادان کا ہے تہنر عین لاف
کہ میں فتح نامہ لکھا ہوں سو آج ۔۔۔ نہ اکثر کیا بات مضمون باج

محمد ابراہیم زبیری مصنف بساتین السلاطین میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"مثل مشہور است درمیان مردم کہ چوں سر سلامت باشد دستار کم نیست" [۲]

یہ نصرتی کے اس شعر کا ترجمہ ہے ؎

منڈاسا گنوانا بھلا سر کی ٹھار ۔۔۔ کہ بانچیا تو یک سر منڈا سے ہزار

اور نور اللہ جیسے مؤرخین نے "علی نامہ" سے خوشہ چینی کی ہے۔ بشیر الدین "واقعات[۱] بیجاپور" میں تو علی نامہ عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت کے واقعات قلمبند کرتے وقت "علی نامہ" نصرتی کو پیش نظر رکھا۔ اپنی تصنیف میں نصرتی کا مصرعہ ع

"علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں"

کا حوالہ دیا ہے۔

---

[۱] بشیر الدین۔ واقعات بیجاپور حصہ اول مطبع مفید عالم آگرہ ۱۹۱۵ء۔ ص ۲۹۲

[۲] زبیری محمد ابراہیم بساطین السلاطین ص ۴۰۳ بحوالہ نصرتی از مولوی عبدالحق۔ ص ۱۴۵

Marfat.com

## تاریخ اسکندری[۱]

یہ مثنوی ۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے۔ جس کا ثبوت مثنوی کے اس مصرع سے ہوتا ہے ع

"سہس ہور اسی پہ جو تھے تین سال"

اس مثنوی میں پانچ سو چون اشعار ہیں۔ مکمل مطبوعہ یا قلمی دستیاب نہ ہو سکی۔ صرف ڈاکٹر عبدالحق کی تصنیف "نصرتی" میں اس مثنوی کا بیشتر حصہ تشریحی و تنقیدی تبصرے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہ مثنوی نصرتی کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں مختصر ہے۔ اس کا تذکرہ مرزا ابراہیم زبیری[۲] نے "بساطین السلاطین" میں بھی کیا ہے۔

"ملک الشعراء میاں نصرتی در تاریخ اسکندری کہ بزبان ہندی منظومہ پرداختہ است کہ بجنگ امراں مشہور گشتہ است داد تہور و شجاعت عبدالکریم خاں و سخنوری فصاحت و بلاغت خویش آنچناں دادہ است کہ سخنداناں انصاف کیش و ہنرشناسان معانی اندیش گوہرہائے تحسین و آفرین برآں نثاری کنند"

مولوی عبدالحق نے اس مثنوی کے صرف ایک نسخے کا ذکر کیا ہے، جو ان کے کتب خانے میں موجود تھا۔ مگر حال ہی میں اس کا دوسرا مخطوطہ[۳] بھی دستیاب ہوا۔ جس کو دیوی سنگھ چوہان نے مرتب کر کے مشکل الفاظ کی لغت کے ساتھ دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا اس کا ذکر بمبئی کے انگریزی رسالہ پی۔ای۔این میں نظر سے گزرا لیکن مطبوعہ مثنوی دستیاب نہ ہو سکی۔ مثنوی کے ابتدائی چند اشعار حسب ذیل ہیں ؎

سرانا جتا سو خدا کوں سرے　　　کہ وہ عین حکمت ہے جوں اُن کرے

---

۱ مولوی عبدالحق۔ نصرتی۔ ص ۲۱۸ - ۲۷۲

۲ مرزا ابراہیم زبیری بساتین السلاطین۔ بحوالہ مولوی عبدالحق نصرتی۔ ص ۲۲۳ - ۲۲۴

۳ P.E.N S.R.TIKEKAR BOMBAY 5/1971-7

Marfat.com

جو اچھتا سرج دن کونت برقرار — تو کیوں نس کو آنا چندر پر مدار
بڑے بادشاہ گر نہ ہوتے سلف — نہ پاتے شہی شاہزادے خلف
بہنہار ہے جس زمیں پر جو خوں — بہے کیوں نہ ہوئے سب کچھ زبوں
نا پاتا زبوں وقت گر کس تے کس — رہتا کیوں قیامت لگ اُس نو کا جس
جنم ہے اُسی مرد کا زندہ نام — پڑی جس تے ہے نیک نامی تمام
کہنا ریو تاریخِ اسکندری — لگے جس کی گفتار یوں سرسری

نُصرتی از عبد الحق - ص ۲۲۴ - ایضاً ص ۲۲۴، ۲۲۵

مندرجہ بالا اشعار میں پہلے دو شعر حمد کے ہیں، تیسرے شعر میں علی عادل شاہ کی وفات اور سکندر عادل شاہ کی تخت نشینی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر اگلے اشعار میں مثنوی کے موضوع کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس سرزمین پر قتل و غارت گری کے بادل منڈلا رہے ہیں، وہ بغیر کسی وجوہات کے نہیں، مگر اس خون خرابے سے نجات دلانے والا اگر کوئی شخص نہ ہوتا تو آج تک کسی شخص کا نام زندہ نہ ہوتا۔ اس لئے ظاہر ہے ہر نیک شخص کا نام ابد تک زندہ رہے گا، اور آخری شعر میں مثنوی کے نام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نُصرتی نے اس کے بعد ایک شعر میں مثنوی کا سنہ تصنیف تحریر کرتے ہوئے اصل واقعہ کا بیان کیا ہے۔ "تاریخ اسکندری" کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت عادل شاہی کا آخری حکمران سلطان سکندر عادل شاہ کے عہد ۱۶۷۲ء تا ۱۶۸۶ء کی تاریخ ہوگی۔ مگر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی میں ایک ایسی تاریخی لڑائی کا ذکر ہے جو صرف دو دن تک جاری رہی۔ ایک طرف شیواجی مرہٹہ کے سردار پرتاپ راؤ گوجر، اور دوسری طرف بیجاپور کے سپہ سالار نواب عبدالکریم بہلول خان تھا۔ نُصرتی نے اس معمولی جھڑپ کو گھمسان کی لڑائی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اس کے مطابق طرفین میں سے بہت سے آدمی موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ شیواجی کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ غصہ میں لال پیلا

Marfat.com

ہوگیا' اور اپنے سرداروں کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ یہ شکست تمہاری لاپرواہی کا نتیجہ ہے' ورنہ عادل شاہی نااہل سردار کبھی جنگ میں بازی نہ لے جاتے۔ چونکہ سکندر عادل شاہ کے تخت نشینی کے فوراً بعد لڑائی شروع ہوئی۔ اور بادشاہ کے عہد کی یہ پہلی لڑائی تھی اس لئے بڑی خوشیاں منائی گئیں اور گھروں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ علی نامہ میں علی عادل شاہ کے آخری ایام سلطنت ...... کے واقعات کا ذکر نہ ہونے کے متعلق یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ اس کے آخری ایام سلطنت میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہ ہوا ہو اور عوام و خواص کو پُرسکون زندگی گزارنے کا موقعہ ملا ہو۔ برعکس اس کے سکندر عادل شاہ کی کمسنی اور سلطنت کی باگ ڈور نااہل تجربہ کار اور خودغرض وزیر کے ہاتھوں میں تھی جس کی وجہ سے جوڑ توڑ کی پالیسیوں پر عمل ہونے لگا۔ خواص خاں کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور تھی، عوام جس سے رنجیدہ تھے۔ بادشاہ کی خوردسالی، اُمراء کی آپسی نااتفاقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ اس خانہ جنگی نے شیواجی کو دعوت دی کہ وہ سلطنت بیجاپور کے علاقے اپنے قبضے میں کرے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف علاقے آہستہ آہستہ سلطنت سے الگ ہونے لگے۔ آخرکار ۱۰۹۷ھ میں اورنگ زیب نے موقعہ پاکر بیجاپور کی سلطنت کو مغلیہ حکومت میں شامل کرلیا۔

نصرتی کی پہلی دو مثنویوں کے مقابلے میں یہ مثنوی مختصر ہے۔ علی نامہ کی طرح اس میں معرکہ آرائی کو موضوع بنایا گیا ہے مگر رزمیہ کی وہ شان پیدا نہ ہوسکی جو علی نامہ میں پائی جاتی ہے، نہ کلام میں وہ شگفتہ پن ہے نہ زورِ بیان، جس کی غالباً یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ سکندر عادل شاہ کے عہد میں نہ تو دربار کی وہ شان و شوکت رہی نہ وہ دبدبہ، نہ پہلے جیسے جنگجو اور مردِ میدان موجود تھے نہ علی عادل شاہ جیسے اہلِ کمال کے قدردان۔ جب شاعر کے دل میں ولولہ، جوش، امنگ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو مثنوی میں وہ رزمیہ شان کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ پھر بھی اس مثنوی میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں رزمیہ شاعری کا مکمل نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ درج ذیل اشعار سے

Marfat.com

شاعر کی شاعرانہ نیز فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے ؎

وہیں دیکھ خاصہ پکڑ ہٹ کمان | کیا ہاں اے ترکس ندراں ہو نہاں
جو دھرتے تھے تیراں چلانے کی لاف | کرو اویک تیر کی صف تے صاف
خدنگ جوڑ چلّے میں کھنچیا کماں | دیا بوسہ تس ہات اوپر آسماں
کماں اپنے قبضے میں پکڑیا جو دھس[1] | رگ و پے میں اوس کے بھریا آپ کس
نظر کی صفائی کر رکھ شست میں | دیکھا تیر کی راستی دست میں
چلایا یتے دور انداز تیر | کہ چھوٹتا سو نین اوس کیا جس اسیر

ماخوذ نصرتی از مولوی عبدالحق۔ ص ۲۴۲

بہلول خاں کی تیراندازی کے کرشمے نصرتی نے ماہر فن کی طرح پیش کئے ہیں۔ اس تیراندازی کے بعد اس کی شمشیر زنی اور گولا باری کرنے کا فن کا ذکر کر کے اپنی قادر الکلامی اور نواب کی جواں مردی اور بہادری کی تعریف کر کے پہلے دن کی لڑائی کے بیان کو ختم کرتا ہے۔ دوسرے دن کی جنگ دشمن کے تیروں کی بوچھار سے شروع ہوتی ہے ؎

ہوئی تھی ادک ریز جو ڈھل پہ یوں | برستا ہے برسات دونگر پہ جیوں (ایضاً ص ۲۴۴)

مذکورہ بالا شعر میں پہاڑ پر تیروں کی بارش کو شاعر نے مینہ برسنا بتایا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں گرمی اور پیاس کی شدت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ ؎

وجوداں میں روحاں دھڑی[2] چٹپٹی[3] | تنور آسماں تھا زمیں تھی بھٹی
لگے جوش کھا سر میں پکنے دماغ | ذرہ جل کے دینے لگی تن پہ داغ
گیا سوک سب امرت کا چشمہ جھن | پڑی جیب[4] بے آب ماہی نمن
ہوا خشک لہو لیا نہ محنت سوں تاب | کھڑک بن نہ تھا کس بی جاگے پہ آب
کھڑے جو دھریک تے یک دل ہیں جوگ[5] | ولے آب بن تلملیا سب ہی لوگ (ایضاً ص ۲۶۱، ۲۶۲)

رزمیہ واقعات کو شان و شوکت سے بیان کرنے کی اولیت کا سہرا نصرتی کے سر ہے۔ اس قسم کی شان بعد میں ہمیں میر ضمیر اور انیس و دبیر کے مرثیہ میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر نصرتی کے رزمیہ

---

[1] بہادر [2] رکھی [3] کھلبلی [4] زبان [5] لو لگائے۔

Marfat.com

شعر العجم کے مصنف شبلی نعمانی کی نظر سے گزرے ہوتے تو وہ ضمیر و انیس کو اس میدان میں اولیت کا درجہ نہ دیتے۔

درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔ نصرتی نے کس طرح دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ شیواجی مرہٹہ کی بے شمار فوج جب نواب بہلول خاں کی قلیل فوج کے مقابلے پر آتی ہے۔ دونوں فوجیں اس طرح پاؤں جمائے ہوئے ہیں کہ ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ اس واقعہ کو صرف دو مصرعوں میں سمونا نصرتی کا کام ہے۔

دزدی بہوت اچھے وہ تو ٹلتے نہ تھے    عجب یو کہ تھوڑے ہو ہلتے نہ تھے

اس کے بعد آخری عنوان "در فتح یافتن نواب بہلول خاں بر لشکر شیواجی وادر اہزمیت دادن" پر یہ مثنوی ختم ہو جاتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالباً اور ضمنی عنوانات بھی اسی طرح فارسی نثر میں لکھے گئے ہوں گے۔ ورنہ اس سے پہلے کی دونوں مثنویوں میں ضمنی عنوان نثر کی بجائے اشعار کی شکل میں درج تھے۔

مثنوی کا خاتمہ طربیہ ہے۔ چونکہ بادشاہ کی یہ پہلی فتح تھی اس لئے شہر بھر میں خوشیاں منائی گئیں اور عوام میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔

شہنشہ کی ہے فتح پہلی لگر    بٹیائے بہوت گھر یہ گاڑیاں شکر

ماخوذ از نصرتی از مولوی عبد الحق۔ ص ۱۷۲

آخری دو تین اشعار میں نصرتی لکھتا ہے کہ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اس کا نام دنیا میں قائم و دائم رہے اور یہی وجہ ہے کہ نصرتی نے بادشاہ کی فتح یابی کی خوشی میں ایسی قابل قدر مثنوی لکھی اور دعا کی کہ

الٰہی زمانے میں جم ٹھاؤں ٹھاؤں    اچھو مچ بچن تے یو مرداں کا ناؤں   ایضاً ۲۷۲

یہ مثنوی نصرتی کی پہلی مثنوی کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے اور "علی نامہ" کے پائے کی نہیں۔ یہ ایک معمولی سی جھڑپ تھی جبکہ "علی نامہ" میں شیواجی اور مغلوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نصرتی نے عہد پیری میں بھی کہیں کہیں وہ کمال دکھایا جو کسی طرح "علی نامہ" سے کم نہیں۔

Marfat.com

# غضنفر حسین

غضنفر حسین اورنگ آبادی کی علمی ادبی خدمات اور خاندانی حالات کے متعلق ہماری معلومات میں تاحال کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ موصوف عالم علی خاں کے متوسلین میں سے تھے۔ مثنوی کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی تصنیف کرتے وقت زندگی کا طویل حصّہ گزار چکے ہیں۔ مسٹر آردن اور مولوی عبدالحق مرحوم کی کوشش سامنے نہ آتیں تو شاید اُردو ادب کی تاریخ میں اس فن کار کا نام موجود نہ ہوتا۔ مسٹر اردن کو "جنگ نامہ سید عالم علی خاں" کا ایک ناقص الطرفین نسخہ دستیاب ہوا جس کو مکمل سمجھ کر اُس نے انگریزی ترجمہ[1] کے ساتھ شائع کیا۔ اپنے نسخے میں درج ذیل مصرعہ۔ ع

"سودشتا یہ کیا کیا ستم ہائے ہائے"

کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ "سودشتا" کا الف ندائیہ ہے۔ چنانچہ سودشتا شاعر کا تخلص ہوگا۔ مصنف کے وطن کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے پہلے بالائی دوآب کا باشندہ قرار دیا ہے اور مثنوی کے داخلی شواہد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شاعر کا وطن سرزمین دکن قرار دیا ہے۔ مثنوی کے سنہ تصنیف ۱۱۳۴ھ پر غور کرتے ہوئے مسٹر آردن کو خیال آیا کہ ولی دکنی ۱۱۳۴ھ میں دہلی میں موجود تھے۔ مثنوی کے سال تصنیف اور ولی کے قیام کی تاریخ کی مطابقت سے یہ نتیجہ نکالا کہ مثنوی "جنگ نامہ سید عالم علی خاں" ولی دکنی کی تصنیف ہے۔ جدید تحقیق کی روشنی میں ولی کا قیام دہلی تو درکنار ان کے سفرِ دہلی کے متعلق شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غضنفر حسین خاں کی علمی خدمات کے سلسلے میں دوسرا اہم کام مولوی عبدالحق[2] کا ہے۔ انہیں

---

[1] مسٹر ولیم اردن رسالہ انڈین انٹی کیوری بابت ماہ جولائی و مارچ ۱۹۰۴ء بحوالہ

[2] مولوی عبدالحق، مقدمہ جنگ نامہ سید عالم علی خاں۔ رسالہ اُردو، شمارہ ۱۹۳۳ء

Marfat.com

مثنوی مذکورہ کا ایک نسخہ ۱۱۳۲ھ دستیاب ہوا۔ جس کے درج ذیل اشعار سے مثنوی کی تاریخ تصنیف کی تصدیق کے علاوہ مصنف کے نام کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

ہزار اور سو تیس تھے دو اوپر — محمدؐ کی ہجرت کو سن کا ن دھر
پرا یا چاند ربیع الاول کا آیا نظر — ہوا آخرت کا یو حکایت خبر
اتھا دن عزیزاں جمعرات کا — ہوا شعر واختتم اس بات کا
نہ ہے دل کو راحت نہ خاطر کو چین — کہا ہے یو قصہ غضنفر حسین

مولوی عبدالحق نے یہ مثنوی پہلے "رسالہ اردو" بابت جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع کی۔ اور اس کے بعد کتابی صورت میں بھی چھپی۔ مثنوی کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں انہوں نے تین نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے جو خط شکستہ میں ہے۔ درج ذیل مثال نسخہ آصفیہ سے پیش کی گئی ہیں۔

## جنگ نامہ سید عالم علی خاں

اس مثنوی کا مختصر پس منظر اور نفس مضمون کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

سید عالم علی خاں دکن کا صوبہ دار تھا نور الدین علی خاں کا بیٹا اور سید عبداللہ خاں قطب الملک اور سید حسین علی امیر الامرائ سادات بارہ کا بھتیجا تھا فرخ سیر کے عہد حکومت میں سید برادران مغلیہ سلطنت کے سیاہ وسفید مالک تھے نظام الملک آصف جاہ اول جوان دنوں مالوہ کا صوبہ دار تھا اپنی نمایاں کارکردگی کی بدولت مالوہ میں بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ جن کی وجہ سے سید عبداللہ خاں قطب الملک اور سید حسین علی امیر الامراء کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ نظام الملک آصف جاہ کی مقبولیت اور دوسری سیاسی مصلحتوں کی بنا پر قطب الملک اور امیر الامراء کو گوارا نہ ہوا کہ نظام الملک آصف جاہ مالوہ کا صوبہ دار بنا رہے۔ لہٰذا اُسے لکھا گیا کہ ملتان برہان پور، اکبر آباد اور الہ آباد میں سے کسی ایک صوبہ داری کا انتخاب کرے۔ نظام الملک کو یہ تجویز ناگوار گزری اور جواب نفی میں دیا۔ پھر کیا تھا سید برادران جو اپنے

Marfat.com

اپنے آپ کو بادشاہ گر سمجھتے تھے۔ نظام الملک کا جواب ان کو شدید برہمی کا سبب بنا۔ اور دلاور[1] علی خان بخشی کو بارہ تیرہ ہزار پیادہ سپاہی دے کر نظام الملک کی سرکوبی کو روانہ کیا، اور اپنے بھتیجے عالم علی خاں کو بھی لکھا کہ مکمل تیاریوں کے ساتھ نظام الملک پر چڑھائی کرد۔ عالم علی خان تیس ہزار سوارے کر اورنگ آباد سے روانہ ہوا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ دلاور علی خاں جوں ہی نزدیک پہنچے تو متحدہ ہو کر غنیم پر لوٹ پڑیں۔ نظام الملک کو جب خبر ملی تو اس نے فتح جنگ کو عالم علی خان کے مقابلے کے لئے روانہ کیا جس نے دریائے تاپتی کے کنارے اپنا خیمہ استادہ کیا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ دلاور علی خاں بخشی بھی نزدیک آن پہنچا ہے تو پہلے اس طرف رُخ کرتے ہوئے محمد غوث خاں اور شیخ فاروقی کو اُس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ ۱۱ مئی کو گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دلاور علی خان بڑی بہادری سے لڑا مگر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور میدان جنگ میں مارا گیا۔ ابھی نظام الملک کے بہادروں نے چین کی سانس بھی نہ لی تھی کہ سید عالم علی خاں برہان پور کے قریب آگیا۔ نظام الملک خود عالم علی خاں کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا دونوں طرف کی فوجیں فرداپور کے مقام پر جو برہان پور اور اورنگ آباد کے درمیان ہے ۲۰ جولائی ۱۷۲۶ء کو آمنے سامنے صف آرا ہوئیں۔ سید عالم علی خاں نے اس جنگ میں انتہائی بہادری کا ثبوت دیا، چاروں طرف تیروں کی بارش اور بارود کی بھیانک آگ کے باوجود دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔ دشمن طاقت ور کم عمر نا تجربہ کار جواں مرد نظام الملک جیسے تجربہ کار کے سامنے کہاں تک آگے بڑھتا آخر کار میدانِ جنگ میں بہادروں کی طرح جوہر دکھاتے ہوئے جان قربان کردی۔ نظام الملک کو فتح حاصل ہوئی اور دکن پر قبضہ کرنے کے بعد آصفیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ بقول نصیر الدین ہاشمی :۔

---

[1] بعض تاریخوں میں مورخین نے یہ نام دلاور علی خان لکھا ہے بالخصوص تاریخ فتحیہ کے مصنف یوسف خاں جو اکثر نظام الملک کے ساتھ معرکوں میں شریک رہتا تھا صرف دلاور خان لکھا ہے۔

Marfat.com

"عالم علی خاں کے جنگ میں مارے جانے کے بعد یہ مثنوی لکھی اور اپنے چشم دید حالات اس میں نظمائے۔ شاعر کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرنی چاہئیے کہ اس نے نظام الملک آصف جاہ اوّل کے زمانۂ حکومت میں عالم علی خاں کی تعریف کی" لہ ۔ ص ۲۴۱

مولوی عبدالحق کی یہ شائع کردہ مثنوی ۱۹۱۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تیئیس ۲۳ اشعار حمد کے ہیں۔ پھر آٹھ اشعار نعت کے اس کے بعد کسی عنوان کے بغیر مثنوی کی ابتدا ہوتی ہے۔

عزیزاں! یہ قصہ ہے طوفان کا ۔۔۔ اوس عالم علی صاحب شان کا

نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔ ص ۶

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غضنفر حسین کی ہمدردی عالم علی خاں کے ساتھ ہے۔ عالم علی خاں کی صورت، سیرت اور بہادرانہ قوّت کے تفصیلی ذکر کے ساتھ نظام الملک کو حملہ آور کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ حملہ آور خود عالم علی خاں تھا۔ غضنفر حسین نے لکھا ہے ؎

یکایک خبر آشکارہ ہوا ۔۔۔ گھرے گھر یو غل کا پکارا ہوا
کہ لے کر نظام الملک فوج سات ۔۔۔ چل آتا ہے سیدا دکن سیع بات
سوا تیتے میں آ. کوئی خبر یوں دیا ۔۔۔ کہ اوترا نظام الملک نربدا
تمن سات جنگ ہے تیاری کرد ۔۔۔ لڑائی بیگی تیاری کرد
سُنا ہور کہا دل میں اپنے عجب ۔۔۔ لڑائی ہمن سات کیا ہے سبب ص ۷ ایضاً

شاعر حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکا۔ اور درج ذیل اشعار سے ثابت کر دیا کہ حملہ آور کون ہے۔ نظام الملک نے سید عالم علی خاں کو نصیحت کی کہ لڑائی کا خیال دل سے نکال دے۔

---

لہ ہاشمی نصیرالدین کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات جلد اوّل مطبوعہ ۱۹۶۱ء ص ۲۴۱

Marfat.com

نظام الملک پر ہوا جب یقین　　کہ اب جنگ ثابت ہے بے کاف شین
کہلا کر جو بھیجا سلام اور دُعا　　لڑائی مرے ساتھ کیا ہے نفا
کہتے ہیں دکن میں مجھے صوبہ دار　　لڑائی کا سٹ دیو دل سے بچار
چلے جاؤ سید مے ہندوستاں کوں　　چچا پاس اپنے آمان سوں
میں لڑ کے سوں کیا تیغ بازی کروں　　بھلا ہے جو کچھ کارسازی کروں

مثنوی کی تاریخی اہمیت کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعد کے مورخین نے جنگ کے واقعات قلم بند کرتے وقت کس قدر اس مثنوی کو ماخذ بنایا۔ جس کی کئی عمدہ مثالوں کی تصدیق مولوی ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" سے ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار کو زیرِ نظر رکھ کر "تاریخ ہندوستان" کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"الحاصل نظام الملک نے اصلاح خال اندیشہ مآل پر نظر کر کے عالم علی خان کو لکھا کہ تم مع اپنے قبائل کے دونوں چچا کے پاس چلے جاؤ تاکہ مسلمانوں کی خونریزی ناحق نہ ہو"[1]

مثنوی میں سید عالم علی خاں کے رفقا اور نظام الملک کے سرداروں کے ناموں کے علاوہ ماہ و سال کی ترتیب اور حقیقت بیانی کا ثبوت ملتا ہے جس سے مثنوی کی تاریخی اہمیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں سید عالم علی خاں کے رفیقوں کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ میدانِ جنگ میں صف بندی کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

بولائے لطیف خان عمر خان کوں　　محمدی بیگ کوں او میٹھے خان کوں
ہراول کیا ہے غالب خان کوں　　دیا ساتھ سلیم خاں میٹھے خاں کوں
دلیل خاں محمدی بیگ مرزا علی　　جہاں لگ تھے سردار جودھا بلی
کہا تم ہراول کے سب ساتھ جاؤ　　ہراول کو اُن سات بیگی مِلاؤ

---

[1] مولوی ذکاء اللہ۔ تاریخ ہندوستان۔ جلد نہم۔ شمس المطابع دہلی ۱۸۹۸ھ ص ۱۷۶
بحوالہ مولوی عبد الحق اردو رسالہ۔ شمارہ ۱۹۳۲ء

Marfat.com

امین خاں کو بولے کہ سن لیو بات	تمین فوج کا مل بے جاؤ سنگات

ان شخصیتوں کے علاوہ اور بھی مثنوی میں بہت سے سردار ہیں جن کے نام آئے ہیں، جو تاریخی اعتبار سے درست ہیں۔ اس لڑائی میں صرف راجپوت، مغل اور مرہٹی قوم کے سپاہی نہیں تھے۔ بلکہ لوہار۔ بڑھئی۔ قصائی۔ سبزی فروش۔ بہشتی۔ جولا ہے۔ کنجڑے وغیرہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان سب کے لئے عالم علی خان نے بیشمار سلطانی حرب و ضرب منگوا کر ان میں تقسیم کیا۔ اس واقعہ کو شاعر یوں نظم کرتا ہے ؎

کمانا و ترکش منگا	بے شمار	لگے بانٹنے فوج میں ایک بار
شہر میں ڈھنڈورا پھرایا تمام	جہاں تک سپاہی اچھے نیک کام
بنجارے قصائی و سبزی فروش	اٹھے دیکھ دل ہوا سب کوں جوش
کہ کنجڑے بھٹارے دھوبی حجام	بھڑائی بہشتی لہار گئے اسلام ۴۴-۴۵ ایضاً

جنگ کا منظر ملاحظہ ہو۔ طرفین سے تیروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ جب عالم علی خاں کے پاس تیر ختم ہو گئے تو وہ ان تیروں کو جو مخالفین کی طرف سے آ کر لگتے تھے انہیں دوبارہ استعمال کرتا ہے ؎

یکا یک لگے موں اوپر پنج تیر	ہوئے پار گالاں سوں پرے کو چیر
لیا کھینچ کر اور کیا خوب زور	آہستہ سٹیا تیر پیکاں مروڑ
لگے تیر پر تیر اس شیر کون	چلاوے پھر اکر اسی تیر کوں
لگا تیر چلتے کو کھینچی کماں	لگاوے جیسے سب گئے دو جہاں
لگا تیر پھر آ ینا گوش میں	سٹیا کاڑ بھی اس کوں آہوش میں ۸۴-۸۵ ایضاً

تاریخ ہندوستان کے مؤلف مولوی ذکاء اللہ خاں نے اس بیان کو یوں پیش کیا ہے:۔

"عالم علی خاں باوجود اس قتال کے اور خود زخمی ہونے کے مردانہ وار ثابت قدم رہا اور جب تک سانس چلتا رہا آگے قدم بڑھاتا رہا۔ کہتے ہیں کہ جب اس کے ترکش میں تیر باقی نہیں رہے تو جو تیر دشمن کی طرف

Marfat.com

سے اُس کے حوضۂ فیل اور جسم میں لگتا اس کو نکال کر دشمن پر چلاتا" [1]
غضنفر حسین کا مقصد ایک تاریخی واقعہ کو نظم کرنا تھا۔ پھر بھی اس مثنوی میں داستانوی رنگ آمیزی ملتی ہے۔ داستانوں میں اس بات کا ذکر ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ کے گھر میں اولاد نہ ہونے پر یا کسی شخص سے لڑائی کرنے کے موقعہ پر نجومیوں، رمّالوں اور فقیروں کو بُلا کر ان سے مستقبل کا حال پوچھا جاتا تھا۔ روایت کی یہ پابندی شاعر نے مثنوی میں برقرار رکھی ہے۔ عالم علی خاں جب نجومیوں اور فقیروں کو بُلاتا ہے تو اُن کی پیشین گوئی ملاحظہ ہو ؎

کہے تب نجومیوں نے سب خبر ہے — ستاروں کی گردش کا ٹک پھیر ہے
یقین ہے ہمن کو فتح پاؤ گے — فتح پا کے بیگی سوں پھر آؤ گے
پوچھا بات بعضے فقیراں بُلا — تمہاری ہے اس بات میں کیا صلا
کہے سب فقیراں سُن اے نواب — شہر چھوڑ جانا نہیں ہے ثواب
نجومی کہیں ہیں خوش آمد کی بات — کہاں علم کامل ہے ان ہیچ بات ایضاً ۱۵-۱۶

عالم علی خاں میدانِ جنگ کی طرف جانے سے پہلے اپنی ماں کے پاس گیا اور اجازت طلب کی ایسی مثالیں ہمیں راجپوتوں کی تاریخی لڑائیوں میں اکثر ملتی ہیں۔ بہادر راجپوت کو ماں بہن یا بیوی جنگ میں بھیجنے سے پہلے تلک لگاتی ہے آرتی اُتارتی ہے اور پھر جنگ میں شریک ہونے اور بہادروں کے جوہر دکھانے کے لئے ہنسی خوشی سے روانہ کرتی ہے۔ برعکس اس کے عالم علی خاں کی والدہ بہادر راجپوتوں کی طرح تلک یا آرتی جیسی رسوم کی پابندی نہیں کرتی، بلکہ لڑکے کی خواہش کو دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جس سادگی اور سچائی سے عالم علی خاں کی والدہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اُس کی مثالیں اُردو کے شعری ادب میں بمشکل ملتی ہیں۔ عالم علی خاں کی خواہش ملاحظہ ہو ؎

پکڑو بات سونپو خداوند کوں — رہو عیش و آرام آنند سوں ایضاً ص ۲۱

---

[1] مولوی ذکاء اللہ خاں، "تاریخ ہندوستان" جلد نہم۔ ص ۱۸۷

Marfat.com

اس خواہش پر ماں کی سادگی ملاحظہ ہو ؎

کہی ماں نے کیونکر رضا دوں تجھے | دکھن میں تیرے باج نہیں کوئی مجھے
خدا باج ہم کو سنگاتی نہیں | مجھے مصلحت یو کچھ بھاتی نہیں ہیں ۲۱ ایضاً

غضنفر حسین نے ماں کی مامتا کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ جب عالم علی خاں بضد ہو کر اور ماں سے اجازت لے کر جنگ کے لئے روانہ ہوتا ہے اور شہر کے باہر جا کر خیمہ نصب کرتا ہے تو اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے ماں کی بے قراری بے چینی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ محل چھوڑ کر جنگل میں اُسے دیکھنے چلی آتی ہے، اس وقت کا ڈرامائی منظر ملاحظہ ہو ؎

خبر سن مقاماں کی ماں مہرماں | تڑپنے لگی دیکھنے جیو پران
گئی شہر کے باہر جا کر ملی | نپٹ آرزو سوں لگائے گلی ۲۸ ایضاً

عارضی جدائی کے وقت جب ماں کی بے قراری کی یہ حالت ہے تو دائمی مفارقت کے وقت اس کا کیا حال ہوگا۔ ذرا ملاحظہ ہو ؎

ہوا گل بڑا گل محل میں تمام | جو کھانا و پانی ہوا سب حرام
کہی ماں نے فرزند میرے نونہال | ہوا دیکھنا مجھ کو تیرا محال
اُجالا مرے جیو کے ایوان کا | ستارا مرے ملکِ میدان کا
پکڑ ہات کوں میں نکالی تجھے | پھر آکر تو سکھ نہیں دکھلایا مجھے ۵۶ ایضاً
محل کے جتنے لوگ زیر و زبر | پڑے حیف کھا کھا کے ہو بے خبر ۵۰

مندرجہ بالا اشعار میں غضنفر نے "ورلاپ" کا منظر پیش کر کے مثنوی میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دی۔ جنگ کے بعد عالم علی خاں کی موت کی خبر اُس کی ماں کو پہنچتی ہے اور اس کا کوئی خدمتگار اور مددگار نہیں ہوتا تو کہتی ہے ؎

نہ فریاد کوں نہ کوئی داد کوں | بہر حال جانا دولت آباد کوں ۵۷ ایضاً

خافی خان کی تاریخ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جنگ کے بعد

Marfat.com

عالم علی خاں کی ماں کو دولت آباد میں مجبوراً ٹھہرنا پڑا تھا۔ [۱]

قدیم مثنویوں کی طرح اس مثنوی کا خاتمہ بھی نصیحت آمیز ہے ؎

عزیزاں جو کچھ ہے سو تقدیر ہے　　بغیر از رضا کچھ نہ تدبیر ہے

ایضاً ص ۶۵

اگر مال دھن لاکھ در لاکھ ہے　　سمجھ دیکھ آخر وطن خاک ہے

ایضاً۔ ص ۴۴

نہ گھر کام آوے نہ فرزند رہے　　نہ ما باپ آوے نہ دلبند رہے

مثنوی جنگ نامہ عالم علی خاں ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ مگر رزمیہ کا سا جوش و خروش، بلند آہنگی، اور شکوہِ الفاظ جو رزمیہ مثنوی کی جان ہوتی ہے وہ اس میں نہیں پائی جاتی۔ قدیم رنگ کی دکنی مثنویوں کے مقابلے میں اس مثنوی کی زبان آسان ہے اور اس میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔ مثنوی کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔

---

[۱] بحوالہ مولوی ذکاء اللہ خاں "تاریخ ہندوستان" جلد نہم۔ ص ۱۸۷

Marfat.com

# نیّر

مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ نیّر تخلص تھا۔ مصنف کے دو نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ جس کے تعارفی اشعار کے مطالعہ سے بھی ہماری معلومات میں اس کے متعلق کچھ قابلِ ذکر اضافہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاعر کی زندگی اور خاندانی حالات بھی پردۂ راز میں ہیں۔ جنوبی و شمالی ہند کے تذکرے بھی مصنف کے متعلق خاموش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر سیلانی طبیعت کا مالک ہو، ادبی لحاظ سے بھی مصنف کی شہرت بھی اتنی نمایاں نہ ہو۔ مثنوی "جنگ نامہ بہادر لاؤ" کا ادبی معیار بھی بلند نہیں ہے۔ بلکہ تیسرے درجے کی مثنوی ہے۔ اگر مثنوی مکمل صورت میں دستیاب ہو جاتی تو اس کی لسانی خصوصیت کی بناء پر مصنف کے وطن کے بارے میں کچھ قیاس لگایا جاتا۔ پھر بھی چند شعری اقتباسات کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی کی زبان ہمعصر دکنی شعراء کی زبان سے کچھ الگ ہے جس پر کچھ دکنی کے ساتھ پنجابی کھڑی بولی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ مصنف شمالی ہند کے کسی کھڑی بولی والے علاقہ کا رہنے والا ہو۔ اور کسی ہندو گھرانے کا چشم و چراغ ہو جو فکرِ معاش میں دکن چلا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کے نام اور تخلص کے بارے میں حتمی رائے رائے نہیں دی جا سکتی۔ مثنوی کے درجِ ذیل شعر کو سامنے رکھ کر نصیر الدین ہاشمی[۱] نے تخلص کا تعین کیا ہے۔

تیرا نو مکہ نیّر دیکھنے سب میں مردانہ
چاکر سے مالک ہوا ہماں اب نانا

اس شعر میں جہاں نانا فرنویس والی پونہ کی طرف اشارہ کیا وہاں پر دکنی کی مردانگی کی بھی تعریف کی ہے جس سے یہ احتمال گزرتا ہے کہ نیّر نانا فرنویس کے جنگ جو سپاہیوں

---

[۱] ہاشمی نصیر الدین "یورپ میں دکنی مخطوطات" جلد اول ۱۹۳۲ء ص ۵۰۱

Marfat.com

میں ہو اور شعر و شاعری کا شوق بھی رکھتا ہو۔

## مثنوی جنگ نامہ بہادر راؤ

یہ مثنوی ۱۱۸۷ھ میں تصنیف ہوئی جس کا ایک نسخہ بخطِ نستعلیق انڈیا آفس لائبریری[1] میں موجود ہے۔ دوسرے نسخہ کا تذکرہ کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹس میں ہے جو خطِ شکستہ ہے۔ نیز نے حمد کے بعد اصل موضوع کے بیان سے پہلے چند تمہیدیہ اشعار کہے ہیں جس میں محمد غوری کے حملے کا اور پرتھوی راج کی گرفتاری سے لے کر محمد شاہ رنگیلے کے عہد تک کے واقعات نظم کئے ہیں۔ تمہیدیہ اشعار ملاحظہ ہوں جس پر دکنی کے ساتھ ساتھ پنجابی کھڑی بولی کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے۔

گڑھ کنجیے کا بادشاہ چہند ہند پر آیا　　　　ہاتھے ہوئے مقابلہ دھا جنگ مچایا
ایک لاکھ اشی ہزار شہید کیا یا　　　　رائے تیورا پکڑ کے جن دین بدھایا
غوری زین العابدین نے انبہ لگایا　　　　بارا برسوں سیو کر پھل پکا کھایا
تیمورا ور بابر بادشاہ نے ملک بسایا　　　　ہمایوں گیا بلک بھاگ کے پھر ہند کو آیا
ماربراہیم بادشاہ سب ملک نو آیا　　　　جی مل کر اکبر شاہ سے دا جنگ مچایا
تورگڑھ چیتوڑ کا پھر تے بسایا　　　　شاہ جہاں سے امر سنگھ نے سار چلایا
جہانگیر جو عدلے بادشاہ نے پرچالایا　　　　شیر اور بکری ایک گھاٹ جن پانی پیایا
چڑا جو اورنگ شاہ جی دکہن پر دھایا　　　　تانا شاہ کو پکڑ کے لیا مال سوایا
اعظم شاہ بہادر نے دل بہت کھپایا　　　　موج الدین سے فرخ سیر راج تبایا
حسن علی خاں سورماں من میں گمرہایا　　　　فرخ سیر پکڑ کے جن فیل پھرایا
محمد شاہ رنگیلا بادشاہ جن تخت بتایا　　　　راج محمد شاہ کے سکھ بیٹھا پایا

یہ مختصر سی تمہید یہاں ختم ہوتی ہے اور مثنوی کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے جس کا مختصر تعارف یوں ہے :۔ جب نواب شجاع الدولہ والی اودھ پر

---

[1] ہاشمی نصیر الدین "یورپ میں دکنی مخطوطات" جلد اول ۱۹۳۲ء۔ ص ۵۲۳

Marfat.com

مرہٹوں نے چڑھائی کر دی تو نواب کی فوجوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا نواب نے اپنی مدد کے لئے قندھار سے احمد شاہ درّانی کو مدعو کیا۔ احمد شاہ درّانی کی دلّی آرزو پوری ہو گئی۔ دعوت نامہ منظور کر کے فوراً ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ اور نواب آصف جاہ نے بھی اپنی فوجیں نواب شجاع الدولہ کے لئے روانہ کیں۔ نانا فرنویس نے بھی بے شمار مرہٹہ فوج یکجا کر کے احمد شاہ درّانی کے مقابلے کے لئے پونہ سے روانہ کی ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں جانب کی فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوئیں۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ احمد شاہ درّانی اور شاہ شجاع فتح یاب ہو گئے۔ اور مرہٹوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

الف نام اللہ تو ہی دین ترا بسا یا ۔۔۔ سمرن کا ہے سرستی جن گیاں بتا یا

نگرہ پانی پت میں سکہ باسا پا یا ۔۔۔ لکھ چور دسی جیا جوں سب دمن ڈھلایا

احمد شاہ قندھار میں پونے میں نا نا ۔۔۔ دلی بیچ نجیب خاں کا بیٹا تھا نا

غازی الدین خاں وزیر نے صوبا تھا نا ۔۔۔ قلم دان منگوائی کر لکھا پروانا ایضاً

بانچو نانا راوجی عقل میں دانا ۔۔۔ ہم سے زیر نجیب خاں ہو گیا پہنا نا ص ۵۴۳

چاکر سے مالک ہوا مہاں اب نانا ۔۔۔ تیرا نو لکہ تیر د کھنے سب میں مردانہ ۵۴۳

اس مثنوی کے متعلق قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں ہر شعر کے بعد قافیہ نہیں بدلتا بلکہ پوری مثنوی صرف چند قافیوں کے تحت نظم کی گئی ہے۔ جو مثنوی کی تعریف کے خلاف بھی مگر قابلِ ذکر تجربہ ضرور ہے۔ ردیف قافیہ کی پابندی کے باوجود مثنوی کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ہی قافیہ میں کئی اشعار نظم کرنے سے یکسانیت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور شعریت مجروح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعر نے مستند تاریخی واقعات کو واضح تصویر میں پیش نہیں کیا۔ مجموعی طور پر مثنوی بلند پایہ کی نہیں ہے اسے تیسرے درجے کی مثنویوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹس میں صفحہ ۱۲ پر مثنوی جنگ نامہ بہادر راؤ کے آخری اشعار درجِ ذیل ہیں ؎

بسنت تھا راسی پہ ستر داں دن بدھ کا بار ۔۔۔ پوہ مہنا اشٹمی کھو کا ب سوار

بتاریخ ششم ماہ جمادی الثانی ۔۔۔ کہ ہارا مرہٹہ و جیتا درّانی

Marfat.com

# عزت

حسین علی نام عزت تخلص تھا۔ بلوم ہارٹ[1] نے غلطی سے حسین علی کا تخلص طرب پڑھا۔ غالباً بلوم ہارٹ کے بیان کو سند مانتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں کے مقدمہ میں شاعر کا تخلص عزت کی بجائے طرب، لکھا۔ سالار جنگ میوزیم[2] اور ایشیاٹک سوسائٹی میں مثنوی کے مخطوطے موجود ہیں۔ اس سے کتاب کی نام اور تخلص کی اس غلطی کی تصحیح ہو جاتی ہے۔ مثنوی کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

اے عزت اِتنا ختم کر یہ کلام　　رکھ از ضراب سُلطان تو اُس کا نام

از مخطوطہ سالار جنگ ص ۸۲

اس کے علاوہ عنوان " داستان پرسش نمودن اہلِ ضلال بازبانِ اشقیا کہ درزم شوہراں وغیرہ مردابو دند کہ بچہا دبچہ طور زائید اند و جواب دادن ایشاں " کے تحت ایک شعر میں اپنا تخلص نظم کیا ہے ؎

اے عزت کہاں تیں کرے گا بیاں　　قلم قاصر عجز ہوئی ہے زبان ص ۵۹ ایضاً

کریم الدین[3] نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے :-

"حسین علی اس مصنف نے ایک نظم میں فتوحات ٹیپو سلطان کے کارناموں پر لکھی تھی، اور اس لڑائی میں نظام علی خان (ثانی) اور مرہٹہ وغیرہ کی بھی صراحت ہے۔ اس کا نام فتح نامہ ہے۔ اس کی ایک جلد سرکار کمپنی کے کتب خانہ میں موجود ہے"

---

[1] ہاشمی نصیر الدین کتب خانہ سالار جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں وضاحتی فہرست ۱۹۵۷ء۔ ص ۸۰۳ - ۸۰۴

[2] " " یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ص ۸۰۴

[3] بحوالہ ہاشمی نصیر الدین۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ ص ۴۰۹

Marfat.com

اس مثنوی کے علاوہ حسین علی خاں عزت نے ۱۷۸۵ء میں "مفرح القلوب" بزبان دکنی لکھی، جس میں علمِ موسیقی کے قواعد و ضوابط درج ہیں۔ یہ کتاب ٹیپو سلطان کے حکم سے لکھی گئی تھی۔ عزت ان کے درباری شاعر تھے اور "ملک الشعراء" کہلاتے تھے۔ [1]

**اضرابِ سلطانی یا فتح نامہ ٹیپو سلطان** اب تک کی تحقیق کے مطابق اس مثنوی کے چار نسخے دستیاب ہو چکے ہیں۔ دو یورپ کے کتب خانوں میں، ایک کتب خانہ سالار جنگ میں ہے اور ایک ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ہے۔ آخری دونوں نسخے خط شکست آمیز نستعلیق میں ہیں۔ اور ان کا کاتب اسد اللہ ہے۔ ان مخطوطات کے عنوان سرخ سیاہی میں ہیں، سوسائٹی کے نسخہ کے صفحہ اول و آخر پر "کتاب فورٹ ولیم" کی مہر ثبت ہے۔ دونوں نسخے کرم خوردہ ہیں۔ نسخہ سالار جنگ کے صفحہ اول و آخر پر مستقیم الدولہ کی مہر ۱۲۲۱ھ ثبت ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں لکھی گئی ہے۔ ابھی تک مثنوی شائع نہیں ہوئی۔

اس مثنوی کا مختصر خلاصہ یوں ہے ۱۷۸۵ء میں ایک جنگ ہوئی جس میں طاقتیں نظام حیدرآباد، مرہٹے اور انگریزوں نے متحد ہو کر، میسور کے حکمران ٹیپو سلطان کے خلاف دریائے تنگ بھدرا کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ ایک رات ٹیپو سلطان کی فوج نے اتحادی افواج پر ناکام شب خون مارا۔ اس اچانک حملے کا مقابلہ اتحادی فوج نے جوانمردی اور دلیری سے کیا۔ مگر جب اس متحدہ محاذ کے سورماؤں کو پسپائی کا یقین ہو گیا تو بالاجی پنڈت اور ہری پنڈت مرہٹہ سرداروں نے میدانِ جنگ سے فرار ہونا زیادہ بہتر سمجھا۔ سلطان نے ان کا تعاقب کیا۔

---

[1] النسا بیگم ولی اللہ۔ ریاست میسور میں اردو کی نشو و نما مطبوعہ برقی پریس منگلور ۱۹۶۳ء کل صفحات ۱۴۴

Marfat.com

ادھونی نرگندہ اور بہادر بنڈہ کے علاوہ کئی قلعہ جات اپنے قبضے میں کئے۔
اس نیم شکست کے بعد متحدہ محاذ نے دوبارہ صف بندی کی اور دریائے کرشنا کے کنارے میدان کارزار بنا۔ ہزاروں جوان مارے گئے، لاکھوں کا نقصان ہوا، فتح نے سلطان کے قدم چومے۔ مرہٹے پہلے ہی خائف تھے اس ہار سے اور بھی ہمت ٹوٹ گئی۔ مجبوراً صلح کی درخواست کی جس پر عملدرآمد کے لئے سلطان نے بدرالزماں خاں بہادر اور احمد رضا کو بھیجا اور خود دارالخلافہ لوٹ آیا۔ مثنوی کی ابتدا سے پہلے فارسی نثر میں درج ذیل تحریر ملتی ہے:-

"کتاب احزاب سلطانی در ذکر جنگ مراہٹہ و نظام علی الطریق اجمال حسب الارشاد جہاں پناہ ٹیپو سلطان خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ۔"

جس سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی کا اصل موضوع کیا ہے اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتاب سلطان ٹیپو کے حکم سے لکھی گئی۔ مثنوی کے عنوانات فارسی نثر میں ہیں۔ مثنوی کی ابتداء اجزا ئے ترکیبی کی پابندی کے بغیر ہوئی ہے پہلا عنوان جو قائم کیا ہے وہ یوں ہے:-

"داستان آمدن مراہٹہ و مغل باعزم جنگ بر ادھونی وغیرہ"

عجائب سنو و دستاں داستاں | کہ جس کے بیاں میں ہے قاصر زباں
مراہٹہ مغل فوج سب جمع کر | خوشی سات سلطان کے سُن[1] یہ خبر
کئے سب نے یوں شرط سوگند ساتھ | لیوں ملک جلدی سوں اب ہات ہات
سبھی ملک و مال و دیار و حصار | دونوں مل لیوں بانٹ ہے یہ قرار
حجام للّی راستہ ہو کر | ہیں بالاجی پنڈت سیک پہ سیر
ہری پنڈت پسر[2] کئے فاخرہ | لے سنگات افواج سب باکرہ
پٹن بیچ پہنچی ہے جب یہ خبر | کہ لڑنے کو با ندھے ہیں دنداں کمر

---

[1] بلوم ہارٹ کے مخطوطہ میں "بد خبر" ہے۔ [2] لڑکے۔

Marfat.com

خوشی سات سُلطان سب فوج رے ملاقات خاطر اُنو کے چلے

مخطوطہ سالارجنگ میوزم ص ا-۲

سید میر حسین کرمانی کی تصنیف "نشان حیدری" تاریخ ٹیپو سلطان جو سلطان کے انتقال کے دس سال بعد لکھی گئی تھی کا ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار اور فاروقی کا ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

"مرہٹوں نے ناظم دکن نظام علی خان سے مشورہ کیا اور دونوں نے متفق ہوکر اپنے اپنے امراء کو فوج کشی کی تیاری کے احکام جاری کردیئے پونہ کے تمام مرہٹہ سردار جلدی جمع ہوگئے ادھر نظام علی خاں حسب اقرار اپنے امراء مشیر الملک سیف جنگ اور تیغ جنگ کے ہمراہ لشکر کو لے کر حیدرآباد سے روانہ ہوا۔"

مرہٹوں اور نواب نظام علی آصف جاہ کی اتحادی فوجیں ندی کے کنارے میدان جنگ میں پہنچنے کے بعد ابھی صف بندی بھی نہ کرپائی تھیں کہ ٹیپو سلطان کی بے شمار فوج دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ پھر سلطان کی فوج نے ایک رات کو موقع پاکر اتحادی فوج پر شب خون مارا تو اس وقت جو اتحادی افواج کی کیفیت تھی ملاحظہ ہو ؎

یہ کر بات لشکر کوں تیار کر
چلے آ کے ندی پہ لاکھوں بشر

پہاڑاں پو چڑکر نکل خاص دعام
دکھیں آ کے سلطان کا لشکر تمام

کہی سب نے یہ آگ کی موت ہے
یہ بندوق اور توپ کا کوٹ ہے

اگر رام و لچھمن ہی ہوتے یاں
نپٹ خوف سے جیو کی مگتے اماں (ایضاً ص ۳)

یہ لشکر کتیں دیکھتے عقل کھو
ایس زندگانی سوں ہاتاں کو دھو

حصار علم بیچ لیتے پناہ
کہاں تاب آتش کا لادیں نگاہ

ہولا چار یک رات شب خون کر
کیئے ان کے لشکر کو زیر و زبر (ایضاً ص ۴)

شہاباں و گولوں کا ہو کر ہجوم
پڑیا چو طرف ان کے لشکر میں دھوم

انکھیاں مل اُٹھے نیند ستین تمام
لگے ڈڈ کر کہنے ارے رام رام

Marfat.com

بلا کاں سو آئی ہے یہ ناگہاں　　　کہ گویا پڑیا ٹوٹ کر آسماں

"نشانِ حیدر"[1] کے مصنف نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے جس کا ترجمہ محمود احمد فاروقی نے یوں کیا ہے:-

"ٹیپو سلطان نے چار یا پانچ دن بعد ایک رات کو شبخون کے لئے اپنے قشون منظم کئے اور شیخ امام، شیخ عمر اور امان خان سپہداروں کو سامانِ جنگ توپوں کے ساتھ ـــــ غنیم کے لشکر پر حملہ کے لئے روانہ کیا ـــــ رات کو تیسرے پہر دشمن کے لشکرگاہ کے قریب پہنچ گئے، لیکن یہاں پہنچ کر وہ ایک غلط راستے پر پڑ گئے اور غنیم کے طلایہ داروں پر جو جا بجا آگ جلائے ہوئے پاسبانی کر رہے تھے جا پڑے شیخ عمر سپہدار نے جو سب سے آگے تھا اُن طلایہ داروں کو ہی اصل لشکر سمجھ کر دوسروں کو اطلاع دیئے بغیر گولہ باری شروع کر دی۔ توپوں کی آواز سُن کر دشمن کی ساری فوج خبردار ہو گئی اور ان کے بعض سرداروں نے حملہ آوروں پر یلغار کر دی ـــــ اس ناکامی پر سلطان کو غصہ آیا اور انہوں نے اسی وقت شیخ عمر کو معزول کر دیا۔ ص ۳۵۳

جب ٹیپو سلطان نے اتحادی فوجیوں پر دوسرا شب خون مارا اور اُسے شکستِ فاش دے دی۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خبر سُن کے سلطاں نے بند کر کمر　　　سرِ شام سب فوج تیار کر

چلے اُن کے لشکر پو جلد و شتاب　　　جو نزدیک پہنچے یکایک شہاب

چھوٹیاں منقلی سوں بھی توپ و تفنگ　　　لگی ہونے سر چو طرف بید رنگ

سمایا یہ دیکھیا سو لشکر تمام　　　لگیا چلچلانے سری رام رام

ہمارے پو کیسے تو ائی ہے آج　　　ہوئے سب طرح سوں ہمن لاجواب

ایضاً ص ۱۱

---

[1] سید میر حسین علی کرمانی مصنف "نشان حیدری" تاریخ ٹیپو سلطان جس کا ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا اور باہتمام شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر علمی پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۶۲ء میں چھپی۔ [2] مراد تباہی

Marfat.com

سنپر کئے اتاہم نے سلطاں کے بات — نہیں دن جو بھاگیں اندھاری ہے رات
پہاڑاں ہے چاروں طرف سب کبل — نہیں راہ دیتی جو جادیں نکل
تردد کریں کیا کہاں بھاگ جائیں — اِتا کاں شہر جا کو سر کوں چھپائیں
زمیں سخت اور دُور ہے آسمان — کہاں ہٹتے جا کر بچادیں گے جاں
مگر آج کی رات دیجور ہے — جہاں سب اندیارے سوں معمور ہے
ہر یک نے ایس دل میں کر یہ بچار — لگیا دوڑ نے چو طرف آہ مار
الیضاً ص "

اتحادی فوج نے وہاں سے بھاگ کر دریائے کرشنا کے کنارے پر مقام کیا' مگر ٹیپو سلطان اس سے بے خبر نہیں تھا اور اُسے یہ شک تھا کہ کہیں اتحادی فوج تازہ دم تیار ہو کر حملہ نہ کر دے۔ ٹیپو سلطان نے دریائے کرشنا کی طرف کوچ کیا اور قلعہ ادھونی اور بہادر بندہ پر قبضہ کر لیا۔ اتحادی فوج دریائے کرشنا کے کنارے اس لئے گئی تھی کہ وہ وہاں راحت پا سکے مگر وہاں وبا نے گھیر لیا ؎

جو کشنا کے نزدیک سب کافراں — گئے تھے کہ تا پادیں راحت وہاں
یکا یک چلیا اُنپو بارِ غضب — لگے مرنے مشرک وبا کے سبب
تپ محرق و مطبقہ و سحال — مفاصل بواسیر و جع الطحال
الیضاً ص ۲۷
یہ کیسی بلا آ پڑی چاروں طرف — گیا بیٹھ لشکر سبھی صف بصف ص ۲۸

ٹیپو سلطان نے غنیم کی فوج پر تیسری بار شب خون مارنے کے لئے چال چلی۔ کنجڑے دھیجڑے اپنی فوج کے آگے کر کے دشمن کے خیمے کی طرف روانہ کئے۔ ہری پنڈت مرہٹہ خفیہ طور پر سلطان سے رشوت لے کر اس سے مل چکا تھا۔ اس لئے ان کے سپہ داروں نے اپنے آقا کے اشاروں پر سلطان کی فوج کو نہیں روکا۔ سلطان کی فوج بے شمار مال غنیم لے کر اپنے خیمے میں واپس چلے گئے۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کنجڑیاں دھیجڑوں کیتی اپنے سات — لجاؤ لڑا نیکوں اُن کے سنگات
کیے حکم کو تواں لشکر کوں تب — کنجڑیاں دھیجڑوں کتیں جلد اب
گئے اُن کے لشکر کے نزدیک جب — ہوئی شام گزری جو یک پاس شب

Marfat.com

گئے بھاگ سب کو اسباب و مال | پہاڑاں و جنگل میں مثل شغال
سبھی مال و اسباب ہر خاص و عام | لئے لوٹ چپو و بیداں تمام
گئے اپنے لشکر کوں نہ ٹھہر (ے) کہیں | مگر یک کنجڑنی و بجبڑا وہیں
اندھاری جو شب گئے راہ بسر | رہے دنگ ہو کر ایسے تھل اوپر
صبح ہوئی یو ہو جمع مشرک تمام | لگے کہنے رو رو کے ہر خاص و عام

عزت کے مندرجہ بالا اشعار پڑھنے کے بعد جب ہم "نشانِ حیدری" کے مصنف کے درج ذیل اقتباس کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عزت کی مثنوی یقیناً ان کے پیش نظر رہی ہوگی۔

"سلطان نے ایک ماہ تک اسی جگہ قیام کیا اس اثنا میں مرہٹہ سرداروں کو نقد روپیہ خلعتیں اور قسم قسم کے تحفے عطا کر کے اپنا حامی بنا لیا وہ زبانی اور تحریری طور پر سلطان کو اشارتاً لشکر کے متعلق اطلاع بھیجتے رہتے تھے۔ ایک دن ان ہی لوگوں کی اطلاع و تجویز کے مطابق سلطان نے چاروں طرف فوجوں کو شب خون مارنے کے لئے روانہ کیا۔ اپنے لشکر کے تقریباً ڈیڑھ سو لکڑہاروں کو جمع کر کے رنگین ڈنڈے ان کے ہاتھوں میں دے کر فوج کے آگے رکھ چھوڑا۔ غنیم کے طلایہ داروں نے جو ہری پنڈت کے ملازموں میں سے تھے اپنے سردار کے اشارے پر ان کی طرف سے چشم پوشی کی، اور اُن کا راستہ نہیں روکا۔ یہ چاروں سپہ سالار بلا مزاحمت مرہٹہ لشکر کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت ایک سپہ سالار نے ان کی آمد سے واقف ہو کر ہولکر تک خبر پہنچا دی کہ سلطان لشکر گاہ میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ یہ وحشت ناک خبر سن کر ننگے پاؤں خیمے سے بھاگتا ہوا نکلا۔ فاتح لشکری صبح ہونے سے پہلے ہی سارا مال غنیمت ان کے جھنڈے، خیمے، ہاتھی، اونٹ، خزانہ اور چار توپیں لے کر لوٹ گئے۔" ص ۳۶۲[1]

اس شکست سے مرہٹے سردار اتنے خائف ہوئے کہ ان میں اب لڑنے کی طاقت نہیں

---

[1] سید میر حسن علی کرمانی "نشانِ حیدری" تاریخ ٹیپو سلطان، بہ ترجمہ محمود احمد فاروقی ۱۹۶۰ء

Marfat.com

رہی ان کے لئے ماسوائے صلح کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ صلح کی درخواست ٹیپو سلطان کی خدمت میں بھیج دی۔ اس پر سلطان کے تاثرات ملاحظہ ہوں، جو انہوں نے اپنے وکیل بدالزماں اور محمد رضا کو مرہٹوں سے صلح نامہ پر دستخط کرنے کے لئے روانہ کرتے وقت ظاہر کئے ؎

بھلا اب کے کر صلح ان سات ہم ۔۔۔ مجدد کریں ان پو لطف و کرم ایضاً

ہے اتمام حجت سراسر یہ کام ۔۔۔ در احسان بہتر ہے در انتقام ص ۷۸

جب انگریزوں کو سلطان کی فتح کی خبر ملی تو وہ بھی منفعل ہوئے ؎

یہ اخبار سن کر سب اہلِ فرنگ ۔۔۔ بنا در میں تصویر ساہو کے دنگ ایضاً ص ۷۸

رہے لکھو کے سب عقل و تاب و تواں ۔۔۔ خصوصاً کرستاں از خوفِ جاں

یہ مثنوی

داستان داخل شدن بدارالسلطنت پٹن بفتح و ظفر بعد مسلمان کردن مشرکاں کچن گرھ در خون بہائے عبدالکریم عملدار آنجا برطبق اجمال نوشتہ شدہ کے عنوان اختتام پذیر ہوئی ؎

گئے جب سگل مشرکین پا شکست ۔۔۔ وہاں کہ قلعہ ہا کا کر بندوبست

سبھی ملک دے قول آباد کر ۔۔۔ اودھر تنگ بھد لا بصد داب و فر ص ۸۰

پٹن کو کیئے قصد جانے کتیں ۔۔۔ نپٹ ہو فرخناک سلطانِ دیں ص ۸۱

ہوئے داخلِ شہر پٹن شتاب ۔۔۔ بصد شان و شوکت بصد آب و تاب

مثنوی کا اختتام دعائیہ پر ہے ؎

تو اب رہ دعا بیچ ہر صبح و شام ۔۔۔ بجز اس کے دوسرا نہیں تجھ کو کام

الٰہی ہے جب لگ مہ و آفتاب ۔۔۔ یہیں رکھو تو سلطاں کوں با آب و تاب ایضاً

مظفر و منصور پر مشرکیں ۔۔۔ بحشمت و اعزاز تا روزِ دیں ۸۳

مثنوی میں جہاں کہیں بھی جنگ کی تصویر کشی کی ہے۔ مصنف نے لڑائی کی ساری ذمہ داری مرہٹوں کے سر ڈال دی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عزت

Marfat.com

کی ہمدردی سلطان کے ساتھ تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان پر حملہ کی ذمہ داری متحدہ محاذ کے تمام ارکان پر عاید ہوتی ہے۔ نظام حیدرآباد اور انگریزوں کا بھی لڑائی میں اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا کہ مرہٹوں کا۔ پھر عزت نے صرف مرہٹوں کو ہی موردِ الزام کیوں ٹھہرایا۔

مثنوی کی ادبی حیثیت بھی کم بلند نہیں ہے۔ نہ اس کی سادگی اور دلکشی سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی مثنوی مستند ہے، اس میں جن افراد کا ذکر آیا ہے وہ تاریخ میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ انگریزی مؤرخ ڈف کے علاوہ سید میر حسین کرمانی نے ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کی لڑائی کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کا ماخذ بھی غالباً یہی مثنوی ہے:

کاتبوں کی لاپرواہی سے بلوم ہارٹ اور سالار جنگ کے مخطوطات کے اشعار میں جو معمولی سے اختلافات ہیں، انہیں نصیر الدین ہاشمی نے قابلِ نظرانداز قرار دیا ہے۔ جو لسانی نقطۂ نگاہ سے درست نہیں، دونوں مخطوطوں کے چند مصرعوں کے معمولی سے فرق کو غور فرمائیے۔

| | | |
|---|---|---|
| مخطوطہ سالار جنگ میوزم | ؏ | خوشی سات سلطان کے سُن یہ خبر |
| " بلوم ہارٹ | ؏ | خوشی سات سلطان کے سُن بد خبر |
| " سالار جنگ | ؏ | یہن رکھ تو سلطان کوں باآب وتاب |
| " بلوم ہارٹ | ؏ | بہویں رکھ تو سلطان کو بآب وتاب |
| " سالار جنگ | ؏ | بحشمت واعزاز تا روزِ دیں |
| " بلوم ہارٹ | ؏ | بحشمت واعزاز تا روزِ امن |

مثنوی کی لسانی قدر و منزلت کے متعلق "ریاست میسور[1] میں اُردو کی نشوونما" کے مصنف نے بڑی جچی تلی رائے دی ہے۔

---

[1] انسا بیگم ولی اللہ میسور میں اُردو کی نشوونما، مطبوعہ برقی پریس بنگلور اشاعتِ اوّل ۱۹۶۲ء

Marfat.com

"مثنوی کی زبان سے میسور کے دیہاتوں کی مروجہ
زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس وقت تک یہاں
بولی جاتی تھی۔ قریوں میں ابھی تک نہاٹ گیا، بمعنی دوڑ
گیا کہتے ہیں۔ اور "ہمناں کوں" بمعنی "ہم کو" مستعمل ہے۔
ادبیت کے لحاظ سے گو یا زبان اور تصنیف معمولی
چیز نظر آتی ہے لیکن لسانیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت
اہم ہے۔ یہ عہد سرکار خداداد کی بول چال کی زبان تھی
جو اس زمانے کی تحریروں میں بھی بے تکلف استعمال
کی جاتی تھی۔" ——— ص ۱۱۵

Marfat.com

# ہیم چند

نام اور تخلص ہیمؔ چند قوم کے کایست تھے۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی ۱۱۷۳ھ سے ۱۲۱۸ھ کے عہد کے غیر معروف شاعر تھے۔ حالاتِ زندگی پر کسی تذکرہ نویس نے روشنی نہیں ڈالی۔ اُن کی ایک مثنوی کے مطالعہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دیوگڑھ کے قلعہ دار برہان شاہ کے متوسلین میں سے تھے اور مثنوی میں تین جگہ نام کو بطور تخلص استعمال کیا ہے۔ جب مثنوی مکمل ہوئی تو اس وقت ہیم چند ناگپور میں تھے۔

## شاہنامہ

اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، جو خطِ نستعلیق عمدہ میں ہے۔ جس کی تاریخ کتابت ۱۲۰۷ھ ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ کو ہیم چند نے اختصار کے ساتھ اُردو نظم کے جامے میں پیش کیا ہے۔ مول چند نے بھی شاہنامہ کا ترجمہ کیا۔ جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اور ایک سالارِ جنگ میوزم کی زینت ہے۔ زیرِ بحث مثنوی کی ابتداء قدیم رنگ کی مثنویوں کی طرح حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ ایک ہندو شاعر کا حمد و نعت لکھنا حیران کُن بات نہیں، اس سے پہلے اور بعد میں بھی ہندو شاعر حسبِ روایت حمد و نعت لکھتے رہے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد "التماس از فضلائے روزگار و مدح راجہ برہان شاہ" قائم کیا ہے۔ اپنے مربی راجہ بُرہان شاہ والیٔ قلعہ دیوگڑھ کی مدحت سرائی کے بعد مثنوی کے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مدح کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدا تجھ کو شاہی سزاوار ہے　　صفت کو تری کچھ نہ آکار ہے
ترا نام روشن زبان پر دھرے　　تو باہر و بہتر آ جلا کرے

Marfat.com

جو صادق ترے نام پہ ہے ملام — تو ہے اس کنے رات دن صبح و شام

ماخوذ مخطوطہ کتب خانۂ آصفیہ۔ ص ١

مصنف نے اپنے مربی کی شجاعت، سخاوت، عدل و انصاف کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

جو ہیں اس زمانے میں دانش پذیر — خرد مند عاقل دروشن ضمیر

سخن سنج کامل و جوہر شناس — عرض ہے مری عجز سے اُن کی پاس

ہے دیوگڑھ ملک ہند میں آشکار — وہاں کا جو والی ہے اسلام یار

عدل خیر خوبی ہیں بخت بلند — شکل ہیچ ہے چاند سُلطاں پسند

سمجھ کر کے برتر بزرگی وجاہ — اسم حقی بخشا ہے برہان شاہ

شجاع شیر افگن ہے عالم پناہ — ہے خوش وقت جن سے رعیت سپاہ

عبادت، سخاوت، شجاعت آشکار — جمع ہیں اس شاہ میں آشکار

علم عاربی، فارسی، ہندوی — ہے ازبر جیسے دینی و دنیوی

رہا شاہ نے آن کر جس مکاں — سو دیوگڑھ میں ہے سنگ اکبر نشاں الیضاً

ملازم اسی شاہ کا مستمند — سری باس کایست ہے پیم چند ص ٣

مندرجہ بالا آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا نام و تخلص پیم چند تھا۔ قوم کے کایست تھے۔ اور ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے شاہنامہ فردوسی کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے ؎

کیا جو فردوسی طوس نے — اسی عہد تک شاہ نامہ منے

کیا اس کو ہندی زباں پیم چند — ہے اُمید جو ہوئے عالم پسند

اصل موضوع کا پہلا عنوان " ذکر بادشاہی کیومرث شاہ و جنگ نمودن با دیوان" قائم کیا ہے۔ عنوانات سرخ سیاہی میں اور فارسی نثر میں ہیں۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

سنو اے سخن سنج دانش پناہ — ذکر بادشاہ ہے کیومرث شاہ

Marfat.com

کیا جس نے بنیاد تخت اور تاج — نہیں تو جہاں میں نہ تھا یہ رواج
رہے کوہ میں سات انبوہ کے — چرم چار پایوں کی پوشاک سے
سیامک اسم اس کو فرزند تھا — شکل خوب محبوب دلبند تھا
تھا ایک دیو دشمن کیومرث کا — اُسے ایک فرزند مکار تھا
وہ آیا کیومرث کی جنگ کو — گراں فوج دیونکی لے سنگ کو
سیامک جو فرزند تھا شاہ کا — سو آکر مقابل ہوا باسپاہ
لڑا دیو بچہ ستے ذات سے — موا اس نکوں بخت کے ہات سے

مندرجہ بالا اشعار ملکِ ایران کے تخت و تاج کے بانی کیومرث شاہ کے فرزند سیامک کی لڑائی کا پتہ چلتا ہے جو دیوؤں سے ہوئی تھی علاوہ ازیں اس وقت کی تہذیب و تمدن اور زندگی کے رہن سہن کا پتہ چلتا ہے اس وقت آگ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی، بنی نوع انسان جانوروں کا کچا گوشت کھاتے اور اُن کی کھالوں کو بطور پوشاک استعمال کرتے تھے۔

بادشاہ ہشنگ کے عہد کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار سے جو روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہو ؎

سنو ماجرا بادشاہی ہشنگ — تھا حکمت میں بس تیز دانش فرہنگ
پتھر میں سے آتش نکالی اُنی — طرح روشنی جگ میں ڈالی اُنی

ایران کے بادشاہ ہشنگ کے عہدِ حکومت میں آگ کی ایجاد ہوئی انسانوں کو پکا کھانا میسر ہوا۔ بادشاہ فریدوں کے عہدِ حکومت میں ایران نے بہت ترقی کی ملک میں ہر طرح سے امن و امان تھا ؎

فریدوں نے پایتخت ایران بجائے — کیا ملکِ ایران کو دولت سرائے
عدل سے کیا جا بجا انتظام — امن پا کے عالم ہوا شاد کام
ایضاً ص ۱۰۹

مثنوی میں تسلسل اور بلا کی روانی ہے۔ لیکن رزمیہ منظر نگاری جو تاریخی مثنویوں کی جان ہوتی ہے نہیں ملتی۔ مثنوی کے اختتام پر صرف یہ معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

کہ شاعر نے اس تصنیف میں عمرِ عزیز کے پانچ سال صرف کئے ہیں۔ اور تاریخ تصنیف کے متعلق بھی پتہ چلتا ہے۔ ہ

نظم میں یہ تھا شاہنامہ تمام — دیا اسکو ہندی زباں انتظام
کیا بہت کاوش طبع جوڑ توڑ — مطالب لیا سب درازی کو چھوڑ
قدر اس کی ہے گی بزرگوں کے پاس — جو ہیں تیز دانش و جوہر شناس
ہے ان سے میری التجا کم و بیش — کہ پڑھ کر اسے داد دینا ہمیش
مجھے کچھ نہ لینا ہے کس کے کنیں — مگر نام باقی رہے دور میں
ہجری کی تھی بار اسے اور سات سن ۱۲۰۷ھ — بنایا نئی داستاں تھی کہن — ایضاً ۲۲۵
برس پانچ کر کی مشقت تمام — شہر ناگپور میں کیا اختتام

آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی شہر ناگپور میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ مثنوی کے اختتام پر ترقیمہ[1] موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی کا مخطوطہ مصنف کا خود نوشتہ ہے۔

کتاب ترجمہ شاہنامہ تصنیف لالہ ہیم چند
کایستھ کاتب الحروف خود بتاریخ نود ہم
ماہ ربیع الثانی ۱۲۱۲ھ زینت سطر یافت
تمت تمام شد کار من نظام شد

---

[1] ماخوذ از کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول۔ ص ۷۰۷

Marfat.com

# کمترؔ[1]

شاہ کمترؔ عہدِ آصفی کے صوفی بزرگ شاعر تھے۔ جسے نہ صرف سلوک و معرفت پر قدرت حاصل تھی بلکہ شعر و شاعری کے میدان میں بھی اچھی مہارت اور شہرت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے آصف جاہ ثانی نواب نظام علی خان ۱۷۶۱ء سے ۱۸۰۳ء تک اور نواب آصف جاہ ثالث کا عہد بھی دیکھا تھا۔ تذکرہ شعرائے[2] دکن کے کے مصنف عبدالجبار خاں نے شاہ صاحب کی سال وفات ۱۲۲۱ھ لکھی ہے۔ اور نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں[3] اردو" میں ۱۲۲۵ھ لکھی ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے نہ تو مصنف کے وطن کے متعلق اور نہ ہی ان کے خاندانی حالات کے متعلق روشنی پڑتی ہے۔

## داستان نواب نظام علی خاں

اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ کی زینت ہے جو خط نستعلیق عمدہ میں ہے جسے مصنف نے ۱۲۲۱ھ میں تصنیف کیا۔ اس مثنوی میں نواب آصف جاہ ثانی نظام علی خان کے عہد کے واقعات نظم کئے ہیں۔ مثنوی کا آغاز حمد و نعت و مناجات سے ہوتا ہے پھر شاعر اصل داستان کا آغاز کرتا ہے۔ مثنوی کے مختلف ابواب کے عنوانات سرخ سیاہی اور فارسی نثر میں ہیں۔ ہر ضمنی عنوان کے تحت کسی نہ کسی تاریخی واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ چند قابل ذکر عنوانات حسب ذیل ہیں:-

۱- "در بیان حسب حال و شروع نمودن داستان مینو نشان" - ص ۸

---

۱؎ ہاشمی نصیر الدین - یورپ میں دکنی مخطوطات - ص ۱۷۴

۲؎ " " " - کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات جلد اول مطبوعہ ۱۹۶۱ء ص ۲۴۶

۳؎ " " " - دکن میں اردو، طبع پنجم ۱۹۶۰ء - ص ۱۱۷

Marfat.com

۲۔ " دربیان آنکہ رفتن ناصر جنگ برائے عزم وزارت و بازگشتن و شہادت یافتن " ص ۲۲

۳۔ " دربیان آنکہ ریاست کردن ہدایت محی الدین خاں و باز کشتہ شدن از دستِ بہادر " ص ۲۷

۴۔ " دربیان آنکہ بر ریاست نشستن و تقسیم نمودن بپسران خود۔ جنگ شدن از مرشد ظفر یافتن " ص ۳۰

۵۔ " دربیان آنکہ کشتن حیدر جنگ را در خیمہ خود و ملاقات نمودن راجہ چندرسین وابراہیم خاں " ص ۳۱

۶۔ " دربیان ذکر کرامات دیگر ظاہر شدن نواب نظام علی خان بہادر ...." ص ۶۹

۷۔ " دربیان نواب علی خان را پیدا شدن مرض فالج کو بید " ص ۷۳

۸۔ " غلام سید خان از بلدہ پونہ آمدہ کہ ..... سکندر جاہ بہادر...... ص ۷۵

کہ فرزند کلاں نواب خورشید اشتہار نظام علی خاں بہادر بودند از دختر خود "

مثنوی کا یہ آخری عنوان ہے جس میں کمتر نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے انتقال کے واقعہ کے علاوہ کچھ اور حالات قلمبند کئے ہیں۔

پہلے عنوان کے تحت " سبب تالیف داستان " کے چند اشعار ملاحظہ ہو ؎

بنا ہے یہ جو قصہ بتوفیق رب ؎ سو اوس کے بنانے کا ہے یہ سبب
جو ہے بو بو سوسن وہ صاحب تمیز ؎ وہ ہشیار دانائے ہر دل عزیز
نظام علی خاں پہ تھی جاں نثار ؎ وہ نواب بھی اوسکو کہتے تھے پیار
جو دُنیا سے گزرے وہ عالم پناہ ؎ وہ بوبو جو تھی اون کی بس خیر خواہ

مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ۔ ص ۸

سو یہ داستاں انکا بنوائیں وہ ؎ کہ نام اون کا خوبی سے عالم میں ہو
کہی موجب اوس کے بخون جگر ؎ بنایا یہ قصہ کو کر مختصر
اگر اوس کی کوئی دوربینی کرے ؎ تو لازم نہیں نکتہ چینی کرے
یہ کمتر کو ایسی بلاغت کہاں ؎ کہ ہوئے ہم قرین زباں آوراں

الیضاً ص ۹

جب ناصر جنگ کو معلوم ہوا کہ انگریزی فوج لڑائی پر آمادہ ہے تو انہوں نے اپنے امرائے خاص کو صلاح و مشورہ کے لئے بُلایا اور بہت سی فوج اکٹھی کر کے انگریزوں کے مقابلے پر آگئے۔ لڑائی میں کمپنی کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

Marfat.com

جس کا بدلہ لینے کی مکارانہ چال چلی اور ناصر جنگ کے خاص نوکر کو اپنے ساتھ ملاکر اُسے قتل کروا ڈالا ۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اگرچہ وہ سب اُدن سے ماضی ہوئے　　ولیکن یہ نیرنگ بازی ہوئے
جو تھا اوس کا نوکر بڑا کوئی پٹھان　　وہ ہمت بہادر تھا نام جوان
ملائی اوسے اور کیئی یوں قرار　　کہ ہے تو بہادر بڑا نام دار
کیسے طور خاوند کو مار ڈال　　تجھے ہم بہوت دیوینگی ملک و مال
وہ بدبخت افغان مشہور ہیں　　وفا و مروّت سے وہ دُور ہیں
طمع کر کے وہ ملک اور مال کی　　خبر نار کھا اپنے احوال کی　ایضاً ص ۲۴-۲۵
قبولا وہ اس بات کو نابکار　　کہ نواب کو ہاں میں لیتا ہوں مار

جہاں کہیں بھی بہادری اور جواں مردی کا ذکر مثنوی میں آیا ہے، اشعار میں وہ توانائی اور حُسن نظر نہیں آیا جو تاریخی مثنویوں کے لئے ضروری ہے ۔

کمتر نے نواب نظام علی کی سلطنت کا نقشہ یوں پیش کیا ہے ؎

نظام علی خاں کو بفضلِ خدا　　نصیبہ اور اقبال رہبر ہوا
تو یوں سلطنت اون کے آئی ہے ہات　　ریاست کئے نیک نامی کے سات
عنایت سے بخشش سے فرخندہ حال　　کئے ادنیٰ اعلیٰ کتیں وہ نہال
شجاعت سے دشمن پہ باندھے کمر　　رکھے ہیں وہ عیش و طرب پر نظر
مرہٹوں کے سَر وہ کچلتے رہے　　مہم پر وہ کا ہے نہ سستی کیئے
نمک کھا کے جو انکا دشمن ہوا　　تو ہرگز وہ جینے نہ پایا موا
زبس تھے خردمند اور باشعور　　تو دشمن کو کرتے رہے اپنے دُور
مہم پر تھے یوں وہ شجاعت شعار　　کہ رستم تھا اور جیسا اسفندیار
عدالت میں نوشیرواں سار تھے　　خرد میں ارسطو سے ہشیار تھے
طرب سات جب مجلس افروز ہوئیں　　تو جمشید کے جشن کا نام کھوئیں

آخری نثری عنوان سے بیشتر شاعر نے نظام علی خاں کے ذیل میں ان کے کشف و کرامات کا

Marfat.com

عقیدت مندانہ ذکر کیا ہے جس سے شاعر کی قربت فطرت اور نواب کی عقیدت ظاہر ہوتی ہے ممکن ہے کمتر کا یہ بیان برائے بیت کی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو اور نواب کو خوش کرنے یا جانشینوں سے قربت پانے کا وسیلہ بنایا گیا ہو لیکن کسی تاریخی مثنوی میں حقائق کے بیان کے ساتھ کشف و کرامات کا ذکر بے محل ہوتا ہے جس سے مثنوی کی ادبی تاریخی حیثیت کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہماری ادبی داستانوں میں دیو پریوں کی کہانیاں اور ہزاروں مافوق الفطرت عناصر پائے جاتے ہیں لیکن تاریخی مثنوی میں اس رعایت سے اکثر پرہیز کیا گیا ہے۔ کمتر کے اس داستانوی انداز بیان کا جواز اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ خود مصنف اس تخلیق کو تاریخی مثنوی کی بجائے "داستان" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

تاریخی رزمیہ مثنوی کے لئے زور کلام، بلند آہنگی، اور پرشکوہ انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے اس لحاظ سے بھی یہ مثنوی محروم ہے۔ جہاں کہیں بھی مثنوی میں کوئی جنگی واقعہ آیا ہے یا جنگی مناظر کی تصویر کشی کی گئی، تو وہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا۔ ادبی لحاظ سے مثنوی کا درجہ معیاری نہیں ہے۔

آخری چند اشعار جس سے مثنوی کے سن تصنیف کا پتہ چلتا ہے غور فرمائیے۔

ہوا مختصر داستاں یہ تمام ۔ جہاں میں نظام علی خاں کا نام
کہ تا دور دورا قائم رہے ۔ درخشاں جیوں خورشید دائم رہے
یہ قصہ بنا ہے یہ خون جگر ۔ بہت سا دلاؤ یہ کمتر کو زر
جو گزرے جہاں سے وہ نیک و پیر ۔ بہتر برس کی تھی اون کی عمر
یہ قصہ ہوا جب کہ تیار بن ۔ تو بارہ سو اکیس تھے سال دس ۔ ایضاً ص ۱۸

دکن کے صفحہ عہد میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ جب دہلی اہل کمال سے خالی ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے فنکار دلی چھوڑ لکھنؤ اور رامپور جانے لگے تھے۔ مثنوی میں دکنی زبان کی خصوصیت اس قدر نہیں پائی جاتی جس طرح عادل شاہی قطب شاہی اور نظام شاہی عہد میں پائی جاتی تھیں۔

مثنوی کے آخر میں ترقیمہ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا چونکہ مثنوی کی تصنیف بھی اسی سال ہوئی ہے اس لئے نسخہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ترقیمہ

تمت، تمام شد بعون اللہ تعالیٰ این داستان نواب نظام علی مرحوم رحمتہ اللہ برمرقدہٗ بتاریخ شانزدہم شہر ذی الحجہ ۱۲۲۱ھ، رقمیہ نیازہ محمد طاہر تمام رسانید۔

Marfat.com

# باپو میاں فقیہ

باپو میاں نام۔ فقیہہ تخلص تھا۔ سنہ ولادت نیز خاندانی حالات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ بمبئی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اچھے شعراء میں کیا جاتا تھا۔ فقیہہ نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی میں ان کا منظوم کلام موجود ہے۔ "روضتہ البکا" ان کی بہت مشہور مثنوی ہے۔ جس میں اپنے عہد کے اہم شعراء کا بھی اختصار سے ذکر کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بیانیہ مثنویوں میں "برحادثہ آتش زدگی در بمبئی" اور "مثنوی مسمار گی شہر بمبئی" ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ ان مثنویوں کا قلمی نسخہ ممبئی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ فقیہہ کی وفات ۱۲۲۳ھ میں ہوئی۔

## مثنوی برحادثہ آتش زدگی در ممبئی

باپو میاں فقیہہ نے یہ مثنوی ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء میں لکھی۔ بمبئی میں ہیبت ناک آگ فورٹ ولیم کے علاقے میں لگی تھی۔ اگر اس پر بروقت قابو نہ پا لیا جاتا تو شہر بمبئی کا حلیہ ہی کچھ اور ہوتا۔ فورٹ ولیم کے متصل فوجی چھاؤنی تھی۔ انگلشیہ کمپنی کے بارود کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا جو آگ کے لگنے سے بچ گیا۔ اس مختصر مثنوی میں مصنف نے ابتداء میں شہر بمبئی کے بازار، گلی کوچوں اور قلعوں کی سجاوٹ کا بہت عمدہ اور اختصار کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ شہر کے رئیسوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نظر آیا عجب دُنیا کا بازار ۔۔۔ بھرا ہے ہر طرف حسرت کا بازار

عجائب شہر ممبئی ہے جہاں ہیں ۔۔۔ کہ جس کا نام ہے ہر ہر مکاں ہیں

کچھ اک تعریف اوّل کر دکھاؤں ۔۔۔ خرابی کا پیچھیں مذکور لاؤں

عجب ہے شہر ممبئی با قرینہ ۔۔۔ دھرا ہے جیوں انگوٹھی میں نگینہ

فقیہہ نے انگلشیہ قوم کی شاطرانہ، مکارانہ ہتھکنڈوں کا چند اشعار میں جس

Marfat.com

عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ تصویر کھینچی ہے اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔

ہیں حکمت میں بہت چالاک و باہوش  
کریں بقراط سے دانا کو خاموش

رسائی علم کے ہر فن میں شاطر  
کہ جیوں دریا کو تیر جاویں شناور

غرض ہر فن میں سب چالاک و ہشیار  
شہ گری میں سب شہ زور و طرار

پر یڈ سارے پیادوں کی بنا دیں  
قواعد اپنے مضموں کی سکھا دیں

کریں بندوق دے کر ان کو تیار  
صفاں کر کر چلا دیں باریکبار

آگ لگنے پر منظر نگاری ملاحظہ ہو

اناروں کی نمط چلتے تھے شعلے  
گویا سلگتے تھے سب آتش کے چولے

دھواں اس طرح ہر سو رواں تھا  
زمین و آسماں جس میں نہاں تھا

مثنوی مندرجہ ذیل اشعار پر اختتام پذیر ہوتی ہے

ابھی فضل خدا پھر گھر بنا دیں  
جلی بستی کو پھر زینت میں لا دیں

خداوندا فقیہہ کو خیر دکھلا  
بجز حق کے نہ روئے غیر دکھلا

ہیں ایک سو انچالیس ابیات  
ہمیشہ دور ہو عالم کے آفات

کیا پھر جگر پیوند آرقام  
درود اں پر محمدؐ باد مادام

فقیہہ نے اس مختصر مثنوی میں نادر تشبیہات کا خزانہ بھر دیا ہے۔ ان سب کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔ چند نادر تشبیہات ملاحظہ ہوں

دو رستہ تھیں دکانیں خوش آئیں  
کریں جوں شاعراں مصرعوں کو تضمین

عمارت گچ کی یوں باندھے تھے ہر سو  
کہ جوں بیٹھا ہو زیور پہن خوشرو

ملے تھے یو عمارت یک دگر سے  
کہ جوں عاشق ملے سیم بر سے

عجب ہے شہر بمبئی باقرینہ  
دھرا ہو جیوں انگوٹھی میں نگینہ

اس مختصر سی مثنوی کے مطالعہ سے شاعر کی قادر الکلامی کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ تذکرہ مخزن الشعراء میں فقیہہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

Marfat.com

وبمبئی کے باشندے ہیں اور بمبئی کے مشاہیر شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔"

## مثنوی مسمارگی شہر بمبئی

یہ فقیہہ کی ایک اور بیانیہ مثنوی ہے جو اس نے "مثنوی بر حادثہ آتش زدگی در بمبئی" کے ایک سال بعد ۱۸۰۴ء / ۱۲۱۸ھ میں لکھی۔ جس علاقہ میں آگ لگی تھی اس علاقے کے جلے ہوئے مکانوں کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کرنے کے لئے مالکوں سے مکان خالی کروائے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے شہر میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الا یا ساکنانِ شہر مسمار ۔۔۔ ظلم کا ہوا ہے گرم بازار
فلک کجرو نے اپنی کجروی کر ۔۔۔ اُٹھایا شور ماتم سب کے گھر گھر
کہوں کا حادثے کا ذکر یاراں ۔۔۔ ملے ہیں خاک میں سب خاکساراں

مثنوی کا اختتام مندرجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے ؎

جنوں کے پاس تھا کچھ نقد و زیور ۔۔۔ لگے فضلِ خدا سے باندھنے گھر
اسی موجب ہمارے تن کا خانہ ۔۔۔ کرے گا جگ متے جب آشیانہ
اُٹھا کر حق لیجا دے در قیامت ۔۔۔ حساب زر زمیں ہوئے خانہ غارت
نہ پھر اس کو ہوئے ٹھار و ٹھکانہ ۔۔۔ کبھی ہووے حشر کے غم میں دوانہ
اگر نیکی کا پایہ ہووے تجھ پاس ۔۔۔ تو گھر جنت میں باندھے غیر وسواس
الٰہی دے فقیہہ عاجز کو ایماں ۔۔۔ ملا در زمرۂ صاحب یقیناں

---

۱؎ بحوالہ ڈاکٹر میمونہ دلوی بمبئی میں اُردو۔

Marfat.com

# نادر

نام معلوم نہ ہو سکا۔ نادر تخلص تھا۔ نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کے عہد کے غیر معروف شاعر تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ نصیر الدین ہاشمی پہلے شخص ہیں جس نے نادر کا ذکر اپنی تصنیف "مدراس میں اردو" میں کیا ہے۔ نادر کی دو مثنویوں کی پتہ چلتا ہے ایک "رشک قمر و مہ جبیں" اور دوسری "مثنوی نادر" یا "سفرنامہ اعظم جاہ" ہے۔ مصنف اور اس کے خاندانی حالات کے بارے میں ہمیں جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ اس کی "مثنوی نادر" میں ہیں۔ نادر کے دادا نواب ارکاٹ کے ملازم رہ چکے تھے۔ والد بھی درباری شاعر کے علاوہ نواب کے استاد بھی تھے۔ نادر خود بھی نواب کا درباری شاعر تھا۔ اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں نواب نے اس کے والد کو پالکی کا اعزاز دیا تھا۔ جس سے نادر محروم ہے۔ نادر پہلے قید خانے کے داروغہ کے عہدے پر مامور تھا۔ بعد میں نواب ارکاٹ کا سفرنامہ لکھنے کے لئے جیل خانہ کی ملازمت چھوڑ دی۔ نادر نے نواب کے دربار کے مشہور و معروف شاعر اظفری سے سخن گوئی کی اصلاح لی اور اظفری کو اپنا استاد مانتے ہیں ؎

تھی ملک سخن کی جن سے خسروی | پر ان میں تھے شاعر عجب اظفری
اوسہی کا مجھے فیض امداد ہے | وہی شعر کا میری استاد ہے

ص ۱۷

**مثنوی نادر** مثنوی نادر کا دوسرا نام "سفرنامہ اعظم جاہ" ہے۔ جس کے ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلا ہے، جو بطور تحفہ کتب خانہ ادارۂ ادبیہ کو مولوی نصیر الدین ہاشمی نے دیا تھا۔ اس کا شمار اردو مخطوطات جلد اوّل از زور میں ہے۔ مثنوی نادر کا قلمی نسخہ خط نستعلیق اعلیٰ میں ہے۔ سن تصنیف ۱۲۳۳ھ ہے جس کی صراحت نادر کے مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے ؎

Marfat.com

کیا ہے سفر جب شہ نیک خو  کہ بارہ سو اٹھتیسواں سنہ تھا وہ
اوس ہی سن میں کو فکر نظم کلام  کیا اُس سفر نامہ کو اختتام

مثنوی نادر کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس کے حمد کے ابتدائی اشعار موجود نہیں ہیں۔ پھر بھی چند اشعار جو حمد کے رہ گئے ہیں کچھ ملاحظہ ہوں ؎

نہال اب ہیں تجھ فیض سے نونہال  گرہ میں ہے غنچے کی زر مالامال
مہ و مہر بخش سے تیری سدا  کہ شام و شفق کا دوشالہ لیا
عنایات تیری سے شام و سحر  صدف ہگا دریا میں نت پر گہر
تیری کم نگاہی کی مد نظر  دو جگ کا کرے صفحہ زیر و زبر
سنیں کم نگاہی کا تیری بیاں  تو مرسل کہیں الاماں الاماں  ص ۱

مثنوی کے عنوانات فارسی نثر میں ہیں " در مناجات حضرت محبوب سبحانی غوث الاعظم دستگیر سید عبد القادر" کے تحت مصنف اپنے متعلق دعا مانگتا ہے اور آرزو مند ہے ؎

قدیم ہگا نواب کا خانہ زاد  رہے ہے جو دو پشت سے اپنی شاد
میرے باپ کی پالکی مجھ کو دے  تصدق سے اپ میرے نواب کے  ص ۲

نادر کو اس بات کا شاید احساس اور غم ہے کہ دوسرے ہم مرتبہ شعرائ اور استادزادوں کے مقابلہ میں نواب کی عنایتوں سے محروم ہے۔

" شروع مدح امیر الہند والا جاہ نواب اعظم جاہ بہادر مد ظلہ " عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے نواب بیگم والدہ اور والد اور بھائی کی مدح علی خان عظیم جاہ کی مدحت سرائی کے علاوہ اعظم نگر یعنی مدراس شہر کی خوبصورت اور دلچسپ انداز بیان میں تعریف کی ہے ؎

نہایت ادب سے قلم سر جھکا  بدل وصف نواب بیگم لکھا
کب ہو وصف اُس حشمت و جاہ کے  کتاں قید کیوں روشنی ماہ کے

Marfat.com

الٰہی جہاں میں اُوسے شاد رکھ — خوشحال اوس کو باآل و اولاد رکھ
اور ایک اوس کا شہزادہ ہے دوسرا — کہ ثانی نہیں جس کا در دوسرا
رہے کیوں نہ اُس پر خدا کا پیار — محمد علی کا ہے وہ نامدار

مصنف نے نواب کے امراء و وزرا ممتاز الامرا، اعظم الملک حفیظ اللہ خاں شرف الملک، معتمد جنگ، عبد الحمید خاں وجیہ اللہ خاں اور وقار حسین کا الگ الگ مفصل تذکرہ کیا۔ جو بے شک بلا مبالغہ قدر دان، سخن فہم، مردم شناس، اور قابل اعتماد کے علاوہ نہایت بہادر اور بے نظیر سیاست داں تھے۔ علاوہ ازیں نادر نے اس عہد کے عالموں، فاضلوں، طبیبوں، شائخوں اور شعرار کی خصوصیات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مگر یہاں صرف ایک ایک شعر پر قناعت کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ ممتاز الامراء بہادر امیر — غریباں، فقیراں کا ہے دستگیر
ہے اس کے سوا ایک والاشاں — میرے شاہ کے پاس ذی عز و شاں
اُسے اعظم الملک ہےگا خطاب — وہی چہرۂ اخلاق کا آفتاب
حفیظ اللہ خاں جو کہ ہے نامدار — ہے حافظ ہر یک جنگ میں اوسکا مار
ہے شعر الملک اور بھی یک امیر — وہی علم و فضل میں ہے بے نظیر
سوا اس کے جو معتمد جنگ ہے — صفِ اعدا نت جس سے دل تنگ ہے
امیر ایک عبد الحمید خان ہے — خلف والا جہ کا وہ ذی شان ہے
وجیہ اللہ خاں اور قادر حسین — بہت پاک طینت اور نیک عین
عجب وہاں مشائخ ہیں عالی قدم — توکل قناعت سے ہے اونکا دم
کروں ذکر شعرار کا وہانکی ذرا — تو خاقانی شاگرد ہووے مرا
پر اون میں تھے شاعر عجب ظفری — تھی ملک و سخن کی جن سے خسروی

نواب اعظم جاہ کے ذی شان قصر اور باغ "ہمایوں محل" کی تعریف ملاحظہ ہو۔ جس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے ؎

Marfat.com

ہیں اوس باغ میں گرچہ لاکھوں گھراں　　پہ یک کونے میں ہیں وہ سارے گھراں

وہ بستی سے یوں باغ آباد ہے　　گویا باغ میں حیدرآباد ہے　ص ۱۸

مصفّا ہے اس طرح سے وہ محل　　ہر یک کی نظر جس تے جاوے پھسل

کلس سونے کے اوس پو ہیں تابدار　　ستارے فلک کے ہوں جس پر نثار

نواب کے سفر کا مقصد بزرگانِ دین کی درگاہوں وزیارت گاہوں پر نذریں پیش کرنا اور زیارت کرنے کے علاوہ مقامِ عقیدت پر عرس کا شان و شوکت سے انتظام کرنا بھی تھا۔ چونکہ مصنف نواب کے سفر میں شریک تھا اس لئے اس نے چشم دید واقعات بڑے عمدہ طریقے سے قلمبند کر کے نواب کے عہد کی تاریخ و تمدن کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے بڑی جچی تلی رائے دی ہے:-

"مثنوی کے مطالعہ سے اس زمانے کے شہر مدراس اور جنوبی ہند کی معاشرت اور سیاست کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ گویا یہ سفرنامہ ایک تاریخی ذخیرہ ہے"[1] ۔ ص ۱۴۲

قدیم رنگ کی دکنی مثنویوں کے مقابلے میں اس مثنوی کی زبان آسان ہے۔ دکنی زبان کی وہ خصوصیات بھی جو عادل شاہ، قطب شاہ اور نظام شاہ کے عہد میں پائی جاتی تھیں مثنوی نادر میں موجود نہیں ہیں۔ نسخے کے آخر میں ترقیمہ ہے۔

مالکہ حلیمہ بنت صبغۃ اللہ بن محمد غوث بن ناصر الدین محمد غفار اللہ عنہم۔ غلام محمد شرف الدولہ بہادر مالکہ عبد القادر بن شرف الدولہ۔

یہ نسخہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کا عطیہ ہے۔ سرورق پر ان کے دستخط اس طرح ثبت ہیں:- "تحفہ بر کتب خانہ ادارہ ادبیہ ہاشمی ۲۲ - ۹ - ۴۷ ف"

---

[1] زور، محی الدین قادری۔ مثنوی نادر، اردو مخطوطات، جلد اوّل

Marfat.com

# عنایت خان ناطق

عنایت[1] خاں دولت زئی نام، ناطق تخلص تھا۔ شاعر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ ان کی "مثنوی قصۂ شہیداں" کے دو اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں مصنف نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے ؎

۱۔ او سی گھر کا ہے خانہ زاد ناطق ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ رہے گا قبر میں بھی شاد ناطق

۲۔ یہاں موقوف یہ ناطق بیاں کر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تو ذکرِ مہدیاں اب عیاں کر

## مثنوی قصۂ شہیداں

مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ ہے۔ جو ناقص الآخر ہے۔ مثنوی کی تاریخ تصنیف کے بارے میں پتہ نہیں چلتا۔ مگر اندرونی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ناطق اسی عہد کا شاعر ہے اور غالباً چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔ سید محی الدین قادری زور نے مثنوی کا سالِ تصنیف سنہ ۱۲۴۰ھ تحریر کیا ہے۔ میاں سید مصطفیٰ تشریف الٰہی نے اپنی تصنیف مقدمہ سراج الابصار میں مثنوی کا سال تصنیف سنہ ۱۲۳۸ھ لکھا ہے۔ "اخبار شہیداں" کے نام سے ایک اور مثنوی عرفان نے سنہ ۱۲۶۹ھ میں لکھی جس کا ذکر بھی اگلے صفحات میں آئے گا۔ ان دونوں مثنویوں کا موضوع ایک ہے۔

نواب سکندر جاہ کے آخری عہد میں سنہ ۱۲۳۸ھ میں بمقام چنچل گوڑہ ایک ناخوش گوار حادثہ ہوا۔ یٰسین خاں مہدی نے جلو خانۂ میر عالم میں گھس کر مولوی عبد الکریم کو قتل کر دیا۔ یہ خبر حیدرآباد میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بے شمار علمائے بلدہ جامع مسجد میں ایک محمدی جھنڈے کے نیچے مسلح و مکمل تیاری کے ساتھ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ جب یہ خبر مہدیوں کو ہوئی تو وہ گھبرائے اور مہاراجہ چندو لال کے پاس اپنے ایک وکیل کو روانہ کیا اور یٰسین خاں مہدی جو

---

[1] میاں سید مصطفیٰ تشریف الٰہی۔ مقدمہ سراج الابصار مطبع مطبوعہ اعجاز شین پریس حیدرآباد طبع دوم سنہ ۱۹۶۳ء صفحات ۲۲۰

Marfat.com

جھگڑے کی بنیاد تھا اُسے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو گئے، مگر معاملہ طے نہیں ہوا اور ۳ محرم الحرام کو رعایا کے درمیان چنچل گوڑہ میں ایک جنگ ہوئی جس میں نواب سکندر جاہ کے سپاہیوں نے بھی حصہ لیا، کئی مشہور و معروف امراء افسران مارے گئے، نواب کی فوج کو بھی شکست ہوئی۔ مہدیوں کے ہاتھوں کچھ توپیں لگیں۔ مہاراجہ چندو لال نے سکندرآباد سے چار ہزار انگریزی فوج اور دس توپیں منگالیں۔ باریڈ صاحب، مارٹین صاحب اور سدرلین صاحب نے رات کے آخری پہر چنچل گوڑہ کو گھیر لیا۔ مہدیوں کو جب صبح یہ معلوم ہوا تو موقعہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے ایک سردار شاہ عالم خاں کو انگریزوں کے پاس معافی مانگنے کے لئے بھیجا۔ مہاراجہ چندو لال نے بھی سفارش کی اور مہدی خون خرابے سے بچ گئے۔ نواب نے مہدیوں کو بلدہ سے تین دن کے اندر نکل جانے کی مہلت دی۔

مثنوی کی ابتدا حمد، نعت سے ہوتی ہے اور بعد میں کچھ مہدی بزرگوں کی مدح کے بعد اصل موضوع کا بیان شروع ہوتا ہے، چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تھا یک صوفی میاں بے دین یارو — بھتیجا قاضی دھارور کا او
مصدق قاضی دھارور کے تیں — جہنم میں مگر پونچا دیئے ہیں
حسد اس بات کا صوفی رکھتا تھا — چچا جس روز سے اس کا موا تھا
او ملا ہر مہدیوں سے آشنا ہو — تھا رہتا رازدار خاں بیٹھیں او
کہا اک روز اس نے لعل خاں کو — مراد خاں بوڑھے اور لٹیین خاں کو

مثنوی کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لگے تھے زخم جو مسجد میں اوس کو — سو او دو روز کے کچے تھے سمجھو
سو اس پر گھاؤ یہ ایسے لگے تین — میاں محمود خاں غازی ہوئے ہیں

چونکہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس لئے آگے کے اشعار پڑھے نہیں گئے۔ مثنوی ناطق سے چنچل گوڑہ کے واقعات کے متعلق بیان ملاحظہ ہو ؎

سو ایسے میں شورپرشاد دانا — کیا ایک آدمی اپنا روانہ

Marfat.com

کہا چنچل گوڑہ کو جلد جا تو — اور انور خاں کو ایسا بول آ تو
دو والی بند سپہ شتر ہزار سب — مسلح آپ اوپر آئے ہیں سب
ہزاروں آدمی اجلاف مل کر — لٹارے لوٹنے آویں مقرر
یہ ساری قوم کا بلوہ ہے تم پر — غرض بلدہ یہ سب پلٹا ہے تم پر

## مثنوی اخبارِ شہیداں

اس مثنوی کا خالق عرفان ہے جس کے نام اور حالاتِ زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ اس نے بھی مولوی عبدالکریم کی شہادت پر ۱۲۶۹ھ میں واقعہ سے تین[1] سال بعد لکھی۔ جس کے چند مصرعے یا اشعار ناطق کی مثنوی سے کچھ ٹکرا گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ "مثنوی اخبارِ شہیداں" تصنیف کرتے وقت "مثنوی قصّہ شہیداں" ناطق، عرفان کے پیشِ نظر تھی۔ چند اشعار چنچل گوڑہ کے واقعہ کے متعلق عرفان کے بھی ملاحظہ ہوں ؎

اس ساعت شوپر شاد باہم — وہ بھیجا پاس انور خاں کے آدم — ص ۳۰۵
سلام اوّل کہا میرا تو کہنا — یہ کہنا پھر بہت ہشیار رہنا
لگا آدم سے پھر کہنے وہ خود — تمہیں ہم نے کیئے حق کے سپرد
ہزار ہفتاد دو والی بند سارا — چڑھا ہے قصد وہ کرکے تمہارا
سواراں کے لٹیرے چوڑے پول — تماشا میں نہایت باندہ کر غول
کیئے ہیں سب خیال خام ایسا — پھر آخر اس کا ہوا انجام کیسا
وہ آدم واں سے آیا دوڑ ایک بار — کیا سب آکے انور خاں سے اظہار
کہا سن کر کے انور خاں نے پرچا — اگر تو دیکھتا ہے تو ٹھہر جا
یہ سب تو دیکھ کر احوال وانفاس — خبر دے جاکے پھر مہراج کے پاس
کہا مہراج کا ہے حکم تعجیل — سنا کر آ نہ کر کچھ راہ میں ڈھیل

---

[1] میاں سید مصطفیٰ: تشریف الہٰی بمقدمۃ الاخبار، طبع مطبوعہ اعجاز شیس حیدرآباد طبع دوم ۱۹۳۳ء۔ صفحات ۲۰۔۱۰

Marfat.com

لکھا پھر اس قدر شقدہ خاں نے　　دلاور شیر اس رستم جواں نے
اگر ہم پہ یہ طوفان برسا　　گھڑی دو چار سے سُن لیجئے گا
خدا کے حکم سے سَر کاٹ ان کو　　ابھی کرتے ہیں بارہ باٹ ان کو[1] ص ۱۱۵

غلام حسین دہلوی کی تصنیف "تاریخ گلزار آصفیہ" سے بھی "عرفان ؔ ناطق" کے بیانوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

"قریب یک نک مسلح و مکمل با ساز و یراق و آلاتِ حرب و رسالہ نوائے مذکورہ جمع گشتہ برجنگ مستعد گردیدند"[2] ص ۱۱۶

علمائے بلدہ کے ساتھ ساتھ نواب کے سپاہی بھی تھے۔ انھوں نے چنچل گوڑہ کے مہدیوں پر توپوں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ مہدیوں نے جان کی بازی لگا دی اور حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے اور اُن سے توپیں چھین لیں۔ اس بیان کو عرفان نے یوں پیش کیا ہے ؎

سمت اتنے میں انور خاں جو جھپٹا　　وہیں ایک بار جا توپوں سے وہ لپٹا
لگے دکھنی بجانے ان میں دھوپان　　لے آیا کھینچ انور خاں نے توپاں

نواب سکندر جاہ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو انھوں نے مہاراجہ چندو لال کو بُلوا کر کہا کہ سکندر آباد کی چھاؤنی سے انگریزی فوج اور توپیں منگوا کر چنچل گوڑہ پر چڑھائی کر دو۔ اخبار شہیدان میں اس بیان کو یوں نظم کیا ہے ؎

جمعہ گزرا سو دوسرا روز آیا　　زحل بن کر جراحت دوز آیا
شہیدوں کو ہوا مدفون روزی　　کریں تھے نمازیاں کے زخم دوزی
فلک جو کجروی سے تیز آیا　　تو لے دو پلٹناں انگریز آیا

---

[1] میاں سید مصطفٰی شریفِ الٰہی مقدمہ سراج الابصار، مطبع مطبوعہ اعجاز مشین پریس حیدرآباد، طبع دوم ۱۹۶۳ء، ص ۱۰۲۰

[2] غلام حسین دہلوی "تاریخ گلزارِ آصفیہ" سن تالیف ۱۲۶۰ھ مطبع حیدری۔ بحوالہ ماخوذ مقدمہ سراج الابصار

Marfat.com

خرسن مہدی سب کہاٹ باندھے | دوبارہ جنگ کا پھر ٹھاٹ باندھے
نظر کر دور سے دیکھا فرنگی | کھڑے ہیں کر کے سب سامان جنگی

تاریخ گلزار آصفیہ کے بیان سے اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

"چہار ہزار جوانان بار معہ دہ ضرب جلوی و قلعہ شکن خورد و بزرگ و سرداران انگریز بارٹن صاحب[1]، مارٹن صاحب و سدر لین صاحب وغیرہ چہار گھڑی شب باقی ماندہ بر سرِ چنچل گوڑہ آمدہ" ۔ص ۱۱۸

اگرچہ اس واقعہ کے اسباب سُنی و شیعہ کے مذہبی اختلافات پر مبنی ہیں لیکن یہ حادثہ ریاست حیدر آباد کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے اس واقعہ کو جو تفصیل ناطق نے اور عرفان نے اپنی تصانیف میں دی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی۔ بلکہ کچھ مورخوں نے واقعات کی تفصیل ان مثنویوں سے لی ہے۔ اس جھڑپ میں جو جو امراء شہید ہوئے اور جن جن کے ہاتھوں شہید ہوئے ان کے نام کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ دونوں مصنف بھی غالباً مہدی ہیں، اس لئے ان کی ہمدردیاں بھی مہدیوں کے ساتھ ہیں۔ ان مثنویوں کے مطالعہ سے اس عہد کی طرزِ معاشرت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

---

[1] غلام حسین دہلوی، تاریخ گلزار آصفیہ تالیف ۱۲۶۰ھ در مطبع حیدری بحوالہ ماخوذ مقدمہ سراج الابصار ۔ص ۳۱۸

Marfat.com

# نذر علی

نام اور تخلص نذر علی ۔ نواب میر فرخندہ علی نصیر الدولہ آصف جاہ چہارم کے عہد کے غیر معروف شاعر تھے ۔ جس کے نجی اور خاندانی حالات کے بارے میں معلومات محدود ہیں ۔ مصنف نے اپنی تصنیف "سراج التواریخ" میں بھی اپنے متعلق کوئی روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی اس عہد کے کسی تذکرہ نویس نے نذر علی کا ذکر کیا ہے ۔ مثنوی سراج التواریخ " کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالارجنگ میوزم میں ہے ۔ جو ناقص الاطرفین اور کرم خوردہ ہے ۔ دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں مصنف نے اپنا نام قلمبند کیا ہے ؎

یہ بندہ ہے کمتر جو نذر العلی　　　نہیں علم سے رکھتا کچھ آگہی
اُدسی طرح نذر علی نے تمام　　　لکھا قصہ کوتاہ یہ داسلام

**مثنوی سراج التواریخ** نذر علی نے مثنوی "سراج التواریخ" ۱۲۶۵ھ میں لکھی جو سلاطین ایران کی داستان نما تاریخ ہے مصنف نے شاہنامہ فردوسی کے فارسی کا اردو نظم میں اختصار کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ۔ مثنوی کی ابتداء قدیم رنگ کی مثنویوں کی طرح حمد، نعت، منقبت سے ہوتی ہے ۔ بادشاہ آصف جاہ چہارم کی مدح سرائی نیز سراج الملک کی تعریف کے بعد مثنوی شروع ہوتی ہے ۔ حمد کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ستائش مُسلّم خدا ہی کو ہے　　　نیالِش سزاوار شاہی کو ہے
کہ جس کی نہیں سلطنت کو زوال　　　نہیں کوئی ایسا جز ایزد تعال

مثنوی کے عنوانات سُرخی میں " فارسی نثر" میں ہیں ۔ " سبب کتاب مسمّی سراج التواریخ می گوید " کے عنوان کے تحت چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔ جن سے مصنف کے نام، مثنوی کے نام اور سنہ تالیف کا پتہ چلتا ہے ۔ علاوہ اس کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے سامنے شاہنامہ فردوسی ہے ۔ جو

Marfat.com

ایک طویل داستان ہے۔ جس کا مطالعہ ہر خاص و عام کی طبیعت پر گراں گزرتا ہے اس لئے مصنف اس کا اردو نظم میں اختصار سے ترجمہ کرنے کے لئے مائل ہوا۔ تاکہ ہر ادنیٰ اعلیٰ شخص اس کے مضمون سے جلد آشنا ہو سکے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا ایک دن میں نے دل میں خیال — اگرچہ کہ تھا وہ خیال محال
پر اوس خدا نے کیا سہل تر — ہوئی نظم یہ داستاں سر بسر
میسر ہوئی بھی اگر مستعار — نہیں دیتا فرصت انہیں روزگار
کریں تا فراغت سے اوس کو نظر — خبردار مضموں سے ہوں سر بسر
انہیں استفادہ ہے اوس سے محال — مضامیں کی دریافت خواب و خیال ص ۱۶
ہزاروں بھی دیکھے ہیں ایسے بشر — نہیں شاہ نامے کی جن کو خبر
اور اکثر غنی بھی ہیں والا مقام — نہیں جن کو مرغوب طولِ کلام
طبیعت کو ہوتا ہے ان کی ملال — سراپا ہے ان کو بھی پڑھنا محال
مصنف نے کر بخشش تر حرص مال — بہت کئے اطناب کے قیل و قال
کہ سلطان محمود والا گہر — ہر بیت تا دیوے دینار زر
یہ بندہ ہے کمتر جو نذر العلی — نہیں علم سے رکھتا کچھ آگہی
ہے ملکِ سخن میں گم نام تر — ہے فیضِ سخن سے وہ ناکام تر
ہوا شوق ایجاز حالی کو تب — کیا مختصر شاہ نامی کو تب
جو تصنیف فردوسی طوس ہے — عروسِ سخن جس سے مانوس ہے
خلاصہ لکھا اوس کا مضموں تمام — کہ ہوں مطلعِ جلد تا خاص و عام
رہے مثنوی تا یہ روشن مدام — رکھا ہے "سراج التواریخ" نام
ہوئی مثنوی جس گھڑی یہ تمام — ہے سال تاریخ ختم کلام
خرد نے نظر کر کے یہ سب لکھا — ہوئی مثنوی خوب یہ ہے لکھا
ہیں اعداد یہ اُس کے اے نکتہ سنج — ہزار و دو صد بعد شصت اور پنج (۱۲۶۵) ص ۱۸

Marfat.com

اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے نذر علی نے پہلا عنوان "شروع کتاب ازداستان کیومرث شاہ کہ ابو الملوک واوّل بادشاہاں است" قائم کیا۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کیومرث شاہ ملک ایران کا پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد سے نہ صرف تاج وتخت کا رواج ہوا بلکہ اس کے عہد سے آئین سلطنت مرتب ہوئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پلا ساقیا وہ شراب کہن | کہ ہوں جوش دل سے میں گرم سخن
مئے ذکر شاہاں سے سرشار کر | مجھے نقل گفتار سے یار کر
کیا اس طرح راوی نے ہے بیاں | سلاطین پیش کہ یہ داستاں
کہ تھا شاہ اوّل کیومرث شاہ | مروّج ہوا اوس سے تخت و کلاہ
ہوا پادشاہی کا اوس سے رواج | نہ تھا پیش ازاوس سے کہیں تخت و تاج
مقدم ہے ساری سلاطیں پہ وہ | کسی کے نہیں رسم وآئیں پہ وہ
کیئے رسم شاہانہ سب اختراع | قرائیں کئے سارے جب اختراع
ہوا تب وہ شاہ بافروجاہ | فلک مرتبہ شاہ انجم سپاہ
نہ تھا اوس کا بستی میں مسکن کہیں | ہوا کوہ وصحرا میں، من گزیں

مثنوی کا خاتمہ نصیحت آمیز ہے۔ بقول مصنف سوائے ذات خداوندی کے کسی چیز کو ثبات نہیں۔ شاہ ہو، گداگر ہو، سب کو ایک نہ ایک دن اِس دارِ فانی سے کوچ کرنا ہے۔ نیک کاموں سے انسان کا نام مدتوں تک زندہ رہتا ہے۔ نیک نامی لازوال ہے۔ آخری اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ خسرو رہا اور نہ کاؤس ہے | تامّل سے دیکھو تو افسوس ہے
وہ افراسیاب صف آرائیاں | سکندر کہاں اور دارا کہاں
فلک پر تھا نخوت سے جن کا دماغ | مئے عجب سے پُر تھا جن کا ایاغ
کسی کا رہا ملک ومال اور نہ گھر | گئے سب جہاں کا وہیں چھوڑ کر
ولے ذات احساں کو ہے یاں بقا | معبود کرم کو نہیں ہے فنا

Marfat.com

کرم پہنچ کو ہے جہاں میں قیام — کرمتا نہیں جس کا نیک نام
نہیں نیک نامی کو اصلا زوال — کرم کی ہے دولت زہے لازوال
محیطِ کرم اور بحرِ سخا — کرم اوس کے احسان سے رائج ہوا
کرم کو اُسی سے مباہات ہے — کرم کی اوسی سے رہی ذات ہے
رہے جاری یہ فیض شاہی مدام — بحق محمد علیہ السلام

مثنوی میں ربط، تسلسل، روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے مگر رزمیہ شان اس کے لئے جو شوکتِ الفاظ اور بلند آہنگی وہ نہیں پائی جاتی۔

مثنوی کے آخر میں ترقیمہ ہے۔

"تحریر فی التاریخ ہفتم ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۶۴ھ" مگر مثنوی میں سنہ ۱۲۶۵ھ انظم ہوا ہے سیاہی کی سُرخی سے شک گزرتا ہے کہ بعد میں کسی نے دیدہ و دانستہ سنہ ۱۲۶۴ھ کر دیا ہے، یا اُسے سنہ ۱۲۶۴ھ سمجھ کر سیاہی سے دوبارہ جلی کر دیا ہے۔

Marfat.com

# سید باقر حسن ضیا

مولوی سید باقر حسن نام۔ ضیاؔ تخلص تھا۔ سنہ ولادت اور وفات کا پتہ نہ چل سکا۔ ضیاؔ کے خاندانی حالات کے بارے میں ہمیں جو کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ ان کی اپنی تصنیف "ضیاؔ دکن" میں درج ہیں۔ ضیاؔ کے جدِ اعلیٰ نواب اسلام خاں کا تعلق شاہ جہاں کے دربار سے تھا۔ شاہی دربار سے وابستگی آٹھ پشتوں تک قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد سید باقر حسن ضیاؔ کا دربار سے سلسلہ منقطع ہوا۔ بسرِ اوقات کے لئے قوانین کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد رائے بریلی میں اُنیس سال تک وکالت کی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد پورے ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ سے ادباء و شعراء دکن کا رُخ کرنے لگے تھے۔ ضیاؔ نے بھی رائے بریلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کیا۔ دوست، احباب و حکّام نے بھی روکنے کی کوشش کی، مگر مستقل مزاجی ضیاؔ کو آخر حیدرآباد لے گئی۔ یہاں کچھ مدّت بیمار رہے جب شفایاب ہوئے تو وکالت شروع کردی، خوب قدر و منزلت ہوئی امیرِ مجلس سے بھی سوا عزّت حاصل تھی۔ حیدرآباد میں نواب عثمان علی خان آصف جاہ سابع کا دورِ حکومت تھا۔ ضیاؔ کی دربار تک رسائی ہوئی، اورنگ آباد میں صدرِ عدالت کے منصب پر فائز ہوئے۔ شعر و شاعری میں انیس و دبیر کو اپنا اُستاد مانتے تھے۔ ان سے اصلاحِ سخن لی۔ اورنگ آباد میں کئی رسالے نثر میں لکھے۔ قیامِ اورنگ آباد کے دوران انہیں ریاست کی منظوم تاریخ تصنیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ حقیقت پر مبنی خوشامد اور تملّق سے مبرّا، تاریخی اعتبار سے مستند سچّے واقعات وقتاً فوقتاً نظم کرتے رہے۔ جب ان اوراق کو جمع کیا تو ایک عمدہ مثنوی وجود میں آگئی۔ جس کا نام "ضیاءِ دکن" رکھا گیا۔ جو چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے پہلے تین حصّے درمطبع برہانیہ بلدہ حیدرآباد دکن ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء میں

Marfat.com

شائع ہوئے ہمارے موضوع سے متعلق مثنوی ضیاء دکن کا پہلا حصہ ہے۔

## مثنوی ضیا دکن پہلا حصہ

مثنوی "ضیاء دکن" کے پہلے حصے کی ابتدا عنوان "دیباچہ" سے ہوتی ہے۔ جس میں مصنف نے اپنا تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد، حمد، نعت و منقبت وغیرہ عنوانات قائم کئے ہیں" دربیان دُعا و ثنا حضرت بندگاہ عالی متعالی مدظلہٗ العالی کے چودہ اشعار ہیں جس میں نواب آسمان جاہ آصف جاہ سابع کی تعریف و توصیف ہے اس کے بعد مصنف اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے اور ریاست کے ساتویں نواب آسمان جاہ کی "وزارت" کا عنوان قائم کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہیں خوف کچھ خصم بد خواہ کا — کہ اب دَور ہے آسمان جاہ کا

امیروں اعظم رفیع المکاں ۔ خجل فیض سے جن کے دریا و کاں ص ۲۱

امارت کی زینت ریاست کی زینت — اسی ذات سے وزارت کی زینت

میر عثمان علی خان کی ولادت کے دو ڈھائی سال کے بعد ان کے والد میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا انتقال ہوا۔ جب عثمان علی خاں نے ہوش سنبھالا تو تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ دستور کے مطابق ریاست کی نگرانی دیوان کیا کرتے تھے مگر اب برٹش گورنمنٹ دیوان کی بجائے کیبنٹ قائم کرنا چاہتی تھی تاکہ کوئی بااختیار دیوان ریاست کی سیاست پر نہ رہے۔ بظاہر ایک وزیر اور دو اس کے مشیر ریاست کا کام دیکھیں۔ یہ تثلیث کسی کو پسند نہیں تھی خصوصاً جو لائق و دانا شخص تھے، وہ اس کیبنٹ کے حق میں بالکل نہ تھے۔ ابھی یہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ سر آسمان جاہ انگلستان سے واپس تشریف لائے۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ یورپ میں جب آسمان جاہ تھے — اُن ایام میں یہ ہوئے مشورے ص ۲۲

کہ سرکار اک کیبنٹ دے قرار — نہ دیوان ہو کوئی بااختیار

Marfat.com

بظاہر رہے نام کو ایک وزیر — شریک اُس کے ہوں اور بھی دو مشیر ص ۲۴
یہ تثلیث سب کو ہوئی ناپسند — خصوصاً اُنہیں جو کہ تھے عقل مند
یہاں ہو رہی تھی یونہی ہائے وائے — کہ سرآسماں جاہ تشریف لائے ص ۲۶
کیا ضبط مطلق نہ تقریر کی — فقط پیر و مُرشد کو تحریر کی
ہوا پیش جس وقت یہ مسئلہ — تو اللہ نے فضل اپنا کیا ص ۲۷
کہ حضرت نے وہ عرض منظور کی — جو ٹھہرائی تھی کیبنٹ دور کی

" دربیان انتظام آبپاشی ملکِ تلنگانہ " کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ زراعت کی ترقی کے لئے عثمان علی خان نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا ؎

تلنگانہ کا مُلک مُلکِ دکن نام — سلف سے ہی واقف ہیں سب خاص و عام
بڑا حصہ ہے مُلک محروسہ کا — زراعت وہاں دھان کی ہے سوا
مگر سال میں اُس کی فصلیں ہیں دو — اِک آبی و دوم فصلِ تالی کہو
کہ زر نقد دس لاکھ سالانہ تک — کیا خرچ منظور بے وہم و شک

بے روزگاری کی بدولت ملازمین کی مجبوری کا فائدہ ہر وقت اُٹھایا گیا ہے۔ جیسے آج کل پرائیویٹ اداروں میں ملازمین کو تنخواہ کم دے کر زیادہ وصول یابی کے دستخط کرائے جاتے ہیں۔ نواب عثمان علی خان کے عہد میں بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ جس کی طرف نواب نے خصوصی دھیان دیا۔ ضیا نے مثنوی میں " دربیان تقسیم تنخواہ سپاہ با قاعدہ دست بدست سپاہیان " کے تحت فرماتے ہیں ؎

ہوا حکم اِک اور با قاعدہ — غریبوں کو جس سے ہوا فائدہ
وہ یہ ہے کہ بعض افسرانِ سپاہ — جسارت سے جن کی خدا کی پناہ
خزانہ سے تنخواہ کُل فوج کی — جو ماتحت اور پائے نام ان کے تھی
کیا کرتے تھے آپ ہی خود حصول — لکھا کرتے تھے خود ہی قبض الوصول
با اخفا یہ ہوتا تھا لیکن ستم — سپہ کے جوانوں کو دیتے تھے کم ص ۳۴

نواب کی روشن خیالی ملاحظہ ہو، اپنے عہد میں نواب نے یتیم خانے قائم کئے،

Marfat.com

جن میں بلا امتیاز مذہب و ملت بچوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔
انہیں سوئی سلائی کا کام بھی سکھایا جاتا تھا۔ اس کام کے لیے ہشیار اُستانیاں مقرر
تھیں ؎

پڑھا کرتے ہیں لکھتے ہیں لڑکیاں — ملازم ہیں ہشیار اُستانیاں
سکھاتے ہیں سب سوئی کے کام بھی — مشقت بھی کرتے ہیں آرام بھی
کسی پر نہیں جبر کچھ زینہار — ہے جو جس کا مذہب وہ ہے برقرار
نہیں قید یہ بھی کہ کیا وہ پڑھیں — زباں مادری جن کی جو ہو پڑھیں ص
ہے اُردو، مرہٹی، تلنگی زبان — یہ سب جانتی ہیں وہ اُستانیاں ۷۶

جس طرح آج کل بڑے بڑے شہروں میں پینے کا پانی نلوں کے ذریعے
مہیا کیا جاتا ہے، عثمان علی خاں نے اپنے عہدِ حکومت میں بیروں و اندرونِ بلدہ
حیدرآباد میں نلوں کے ذریعہ پینے کا پانی مہیا کرنے کے لئے حسین ساگر کا اجرا کیا ؎

دیا حکم سرآسماں جاہ نے — دکھایا کشش کا اثر ماہ نے
کہ تالاب مذکور سے شہر میں — دیا جائے پانی وہی سب پئیں
نلوں کے ذریعے سے زیرِ زمیں — رواں ہونا پانی کا مشکل نہیں
جو ہو صرف اس میں وہ منظور ہے: — دیئے جا دیں گے خرچ ہوں جو روپے
ہوا جو نہی صادر یہ حکم جناب — کیا کام کاریگروں نے شتاب

مثنوی کا پہلا حصہ صوبہ برار کی واپسی کی تمنّاء عامہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔
نواب مرزا خاں دہلوی متخلص بہ داغ نے مثنوی دکن کی منظوم تقریظ لکھی ہے۔
جس کے آخری شعر سے مثنوی کے سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے ؎

سُنیں اس کی تاریخ اہلِ سخن — منوّر مبیں ہے ضیائے دکن
۱۳۰۰ھ

مثنوی ضیائے دکن کے دوسرے حصے کی ابتدا بھی حمد و نعت سے ہوتی ہے
جس میں نواب عثمان علی خاں کی سواری کا جو ۱۵ ارجون ۱۹۱۶ء مطابق ۱۳۳۰ھ کی شام کو
سیر و تفریح کے لیے نکلی تھی کا ذکر ہے۔ اس روز ایک ناگہانی واقعہ ہوا۔ نواب کا ایک سردار

Marfat.com

محمد ننگی تلوار ہاتھوں میں لئے سواری کے آگے آگے گھوڑے پر سوار چل رہا تھا کہ اچانک اس کا رہوار بے قابو ہو گیا اور بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا کہ راستے میں لفٹیننٹ گیلی کے ٹانگے سے ٹکرا گیا، لفٹیننٹ گیلی کو معمولی خراش آگئی۔ مگر اس نے سمجھا کہ محمد جان بوجھ کر اس پر قاتلانہ حملہ کرنے آیا تھا۔ چنانچہ محمد پر مقدمہ چلائے جانے کا بھی اس میں ذکر ہے۔ اس مثنوی کی تاریخی حیثیت صرف اتنی ہے کہ ایک انگریز لفٹیننٹ کے ساتھ عثمان علی خاں کے عہد میں حادثہ پیش آیا۔ اور اس عہد کی تہذیب کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

مثنوی کے عنوان "ذکر مقدمہ سوار کمیشن" کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ جب کا ہے واقعہ اور حال ۔۔۔ وہ ہجری کے تھے تیرہ سو سات سال
مطابق تھی پندرہویں سے جون کی ۔۔۔ تھی اٹھارہ سو پر نود عیسوی ۱۸۹۰ء
کہ نکلی سواری حضرت نظام ۔۔۔ بتقریب تفریح ہنگام شام

مثنوی کا تیسرا حصہ ۱۳۰۹ھ میں تصنیف ہوا جس میں ایک لنگر کی تقریب کا ذکر ہے۔ جس کی ابتدا ۱۰۳۰ھ میں محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہوئی۔ مثنوی کی تصنیف کے وقت لنگر کی تقریب کا دو سو اکتیسواں جشن تھا۔ جس کو مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے اس زمانے کی تہذیبی معاشی طرز زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عیاں ہے جو مضمون تاریخ سے ۔۔۔ بیاں کرتا ہوں نظم میں، میں اُسے
کہ جس وقت گلکندہ تھا تخت کا ۔۔۔ تو سلطان محمد تھے اک بادشاہ
لقب قطب شاہ اُن کا مشہور تھا ۔۔۔ دکن اون سے اوس وقت پُر نور تھا
ولی عہد اُن کا تھا وہ رشکِ ماہ ۔۔۔ ہوا بعد اُن کے وہی بادشاہ
بعمر طفولیت اک روز وہ ۔۔۔ ہوا جلوہ گر فیل بر سیر کو

Marfat.com

ہزار اور سینتیس (سنہ ۱۰۳۷ھ) ہجری تھے سال — کہ جب کا ہے یہ واقعہ اور سال
مؤرّخ کی تحریر سے ہے یقین — کہ تھی ماہ ذی حجہ کی تیرہویں

شہزادے کی ماں نے دُعا مانگی کہ اس کا اکلوتا بیٹا جب خیریت سے جنگل کی سیر و شکار سے واپس آئے گا تو میں فیل کے برابر وزن میں سیبوں کا لنگر حضرت کی درگاہ پر چڑھاؤں گی۔ جب منت پوری ہوئی تو غریبوں میں خیرات بانٹی گئی، تب سے یہ لنگر کی تقریب ہر سال منائی جاتی ہے ؎

مہینہ وہ بے شک محرّم کا تھا — ہوئی جب کہ اس رسم کی ابتدا
ہوئے اس کو دو سو اکہتر برس — وہی رسم ہوتا ہے ہر برس

دُعائیہ اشعار پر یہ مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے ؎

رہے سلطنت اون کی قائم سدا — رہے پیر و مرشد کا حافظ خدا
میری زندگی کا نہیں اعتبار — رہے میری مثنوی یادگار

مثنوی فیسا دکن کا چوتھا حصہ سنہ ۱۳۰۹ھ میں تصنیف ہوا، جس میں نواب عثمان علی خان کے شیروں کے شکار کے شوق کا بیان ہے۔

Marfat.com

# اطہر

سید وزیر الدین نام۔ اطہر تخلص تھا۔ محلہ سلطان شاہی حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ اطہر کی زندگی کے حالات کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں۔ انہوں نے "طغیانی رودِ موسیٰ" پر ایک مختصر مثنوی لکھی۔ جس میں چشم دید واقعہ کو سپردِ قلم کیا ہے۔

## مثنوی طغیانی رودِ موسیٰ[1]

نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کے آخری عہد میں ۲۹ شوال مطابق ۲۶ ستمبر سے یکم رمضان مطابق ۲۸ ستمبر ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد میں لگاتار تین روز بارش ہوئی اور دریائے موسیٰ میں طغیانی آ گئی۔ یہ طغیانی شہر کے مغرب سے آئی تھی اور جنوب و شمال کی تقریباً ایک میل لمبے اور آدھ میل چوڑے گنجان علاقے میں پھیل گئی۔ جس میں تقریباً پچاس ہزار جانیں، اٹھارہ ہزار مکان تلف ہوئے۔ اور ایک لاکھ آدمی گھر سے بے گھر ہوئے۔ مالی نقصان بھی بہت زیادہ ہوا۔ اس دریا میں پہلے بھی ۱۷۴۸ء اور ۱۸۱۸ء میں طغیانی آئی تھی مگر اس بار سیلابِ عظیم سے ہولناک تباہی ہوئی۔ تباہی اور بربادی کا منظر دیکھ کر نواب کو بہت صدمہ پہنچا اور بچوں کی طرح رو پڑے۔ اُجڑے ہوئے لوگوں کے لئے روٹی، کپڑے کا نواب نے خوب انتظام کیا۔ شاعر نے مثنوی کی ابتدا بغیر کسی حمد و نعت کے "الحفیظ" کے عنوان سے کی ہے

کیوں ساکنانِ ہند کو رنج و ملال ہے
اے خوش بیاں جو کہتا ہے یہ کس کا حال ہے

آ گے خدا کے بات یہ ادنیٰ تھی اے جناب
یک دم میں سینکڑوں مرے ہو ہو کے غرقِ آب

دیدار ہونے پایا کسی کا نہیں کسے
کیا پنجۂ اجل میں گرفتار ہو گئے

کیا کچھ فنا ہو گئے ندی میں رشکِ حور
مرضی خدا کی اس میں کسی کا نہیں قصور

---

[1] اطہر وزیر الدین، مثنوی طغیانی رودِ موسیٰ" بفرمائش و اہتمام محمد شمس الدین تاجر کتب مطبع اعجاز المطابع حیدرآباد

Marfat.com

آفت ہو قہر کہ ستم ہے کمال ہے — موسیٰ کی ہمہمہ وہ قیامت کی چال
پیدا اٹھی آب موسیٰ آواز اس قدر — جس کی صدا سے پھٹتا تھا اے ہمدمو جگر
جس وقت اہلِ ہند پہ گزرا یہ حادثہ — سن ہجری تیرا سو پہ تھا چھبیس برملا [۲۶]
تاریخ پہلی تھی مہ رمضاں کی دوستو — اس روز دن تھا پیر کا وقتِ صباح کو

اطہر نے سیلاب موسیٰ کو دہلی کے غدر سے تشبیہ دی ہے ؎

کیا انقلاب آیا دکن میں میرے خدا — دہلی کے غدر سے بھی زیادہ یہ ہو گیا

دریائے موسیٰ میں لاشیں بہتی جا رہی ہیں، یا جن انسانوں میں کچھ جان باقی ہے وہ کس طرح بے بسی سے ہاتھ پھیلا رہے ہیں یہ منظر دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے ؎

کیا حال اُس گھڑی ہو کلیجہ کا دوستو — اہل و عیال رو رو کے پھیلائیں ہاتھ کو
پانی میں ڈوب ڈوب کے سب بہتی جاتی ہے — ماں باپ تکتے رہ گئے کچھ بن نہ آتی ہے

ایک نئی نویلی دلہن رودِ موسیٰ کا شکار ہوئی ہے اس کی منظر کشی کس افسوسناک انداز میں شاعر نے کی ہے ملاحظہ ہو ؎

اک حشر دوسرا یہ ہوا اوس جگہ بپا — یعنی کہ بہتی آئی وہاں ایک مہ لقا
چودہ برس کی عمر تھی اوس دل حزیں کی — مستی لبوں سے نکلی نہ افشاں جبین کی
مہندی لگی تھی ہاتھ پیر کو گورا تھا اوس کا رنگ — چادر بھی سرخ لپٹی جوانی کا تھا امنگ
زیور جو روز عقد بھی پہنی وہ مہ جبیں — وہ سارا اوس کے جسم میں تھا جان لو یقیں
جلوہ ہوا تھا گھر میں وہ آئی تھی دوستو — اک شب وہ گھر میں سو نے پائی تھی دوستو

میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے جب یہ منظر دیکھا تو برداشت نہ کر سکے اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے ؎

جب دیکھے اس تباہی کو محبوب بادشاہ — بس بیقرار ہو کے کئے دل سے ایک آہ
ہے ہے یہ میری ساری رعیت اجڑ گئی — یا رب یہ اودن پہ کیسی تباہی برس گئی

نجم الغنی تاریخ ریاست حیدر آباد دکن کے مصنف نے لکھا ہے۔

"نواب صاحب کو اس کا بہت صدمہ تھا۔ موٹر پر سوار ہو کر یکم اکتوبر

Marfat.com

کی شام کو ایوانِ فلک نما سے افضل گنج کے پُل تک آئے اور جو منظر پیش آیا اس کو دیکھ کر کھڑے رو دیا کئے" ص ۵۶۶

آخر یہ بندوبست کیا شاہ ذی حشم — کھانا اور نہوں کو پہونچے کس طرح بہم
پکوا کے کھانا روز غریبوں کو دیتے تھے — دو وقت ذات سے بھی خبر اپنی لیتے تھے
کیوں کر نہ شکر شاہِ دکن کا کریں ادا — بعد از خدا رسولؐ انہیں کا ہے آسرا

نجم الغنی نے تاریخ ریاست حیدر آباد دکن میں لکھا ہے :-

"پناہ گزینوں کے لئے دو ایوان دے دیئے تھے۔ دونوں میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ان کے لئے کھانا اور کپڑا بہم پہنچایا جاتا تھا۔ پانچ باورچی خانے مسلمانوں اور پانچ ہندوؤں کے لئے جاری کئے گئے تھے۔" ص۔ ۵۶۵

مثنوی کا اختتام نصیحت آمیز ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

روز جزا کا خوف تو کچھ دل میں تم کرو — توبہ کرو گناہ سے اب اپنے دوستو
اب بھی خدا کے خوف سے ڈرتے رہو سدا — ورنہ خدا کے کہر کا پھر ہوگا سامنا
روز جزا میں اطہرِ کمتر کو یا خدا — نارِ سقر سے بطفیلِ نبیؐ بچا

مثنوی کے آخر میں ترقیمہ ہے

مرقوم رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ

Marfat.com

# دلاور علی دانش

دلاور علی نام دانش تخلص تھا۔ سنہ ولادت و وفات نیز خاندانی حالات کا پتہ نہ چل سکا۔ دانش حیدر آباد کے منصب دار کتب خانہ سالار جنگ کے منتظم تھے۔ ایک اچھے شاعر کے علاوہ عمدہ خوش نویس بھی تھے۔ خوش نویسی کے موضوع پر ایک بہترین کتاب بخطِ نستعلیق اپنے شاگردِ رشید نواب سرتاج جنگ ابن نواب محبوب جنگ ناظم الدولہ کے لیے ۱۳۲۳ھ میں لکھی تھی جس میں فن خوش نویسی کے متعلق جملہ لوازمات بھی جمع کردی گئی ہیں۔ ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب و مؤرخ بھی تھے۔ ان کی ایک تاریخ ریاض مختار یہ چھپ چکی ہے۔ تذکرہ منظوم سلاطین دکن (تحفہ عثمانیہ) ۱۳۱۷ھ میں تصنیف ہوئی، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔ ہمارے موضوع سے متعلق تذکرہ سلاطینِ دکن ہے۔

## تذکرہ منظوم سلاطین دکن (تحفہ عثمانیہ)

دلاور علی دانش نے یہ منظوم تاریخ ۱۳۱۷ھ میں تصنیف کی جس میں آصفیہ خاندان کے پہلے نواب نظام الملک آصف جاہ سے لے کر محبوب علی آصف جاہ سادس تک کے تاریخی واقعات بہت اختصار کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ اس منظوم تاریخ میں میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی پیدائش کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔ دلاور علی دانش کا تاریخ آصفیہ کو نظم کرنے کا واحد مقصد شہزادہ عثمان علی خان کو اپنے آبا و اجداد کے تاریخی کارناموں سے روشناس کرانا تھا۔ مثنوی کے آخر میں کچھ بہترین اور کارآمد نصیحتیں بھی شہزادے کے لیے بطرز مثنوی نظم کی ہیں۔ مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے نہ کر کے شہزادہ عثمان علی خان کو خطاب کیا۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ای دُرِ یک دانۂ بحر شہی — ہو ہمایوں سایۂ ظلِ الٰہی ص ۱

آفتاب آسمان آصفی — راحتِ جانِ جہان آصفی

گل بن گلزارِ ریان نظام — نور عین و راحت جانِ نظام

Marfat.com

حق نے اس گھر میں بنائیں رئیس ‏ ‏ جدّ و آبا ہو تے آئے ہیں رئیس

دہر میں سرسلسلہ ہیں آپ کے ‏ ‏ شیخ ذی مرتبت شہاب الدین ہوئے ص ۱

بہ عنوان " ذکر نظام الملک آصف جاہ اولی مغفرت مآب " میں شہزادہ عثمان علی کو اپنے خاندان کے بانی سے یوں متعارف کراتے ہیں ؎

جدِ اعلیٰ آپ کے ای ماہ تھے ‏ ‏ جو نظام الملک آصف جاہ تھے ص ۲

مادری جد اون کے سعد اللہ خاں ‏ ‏ تھے وزیرِ اعظمِ شاہِ جہاں

جد تھے عابد خاں جو تورانی امیر ‏ ‏ ہند میں آکر ہوئے وہ جاگیر

عہدِ عالم گیر کے گلشن کا گُل ‏ ‏ ہفت ہزاری منصبی و صدر کُل

غازی الدین خاں جو تھے فیروز جنگ ‏ ‏ والد آصف جاہ کے باہوش و ہنگ ص ۳

آئے عالمگیر کو ایسے پسند ‏ ‏ کہتے تھے فرزند بلکہ ارجمند ص ۳

حاکمِ گجرات ہو کر بعد ازاں ‏ ‏ تا دمِ آخر رہے وہاں حکمراں

سب اعزہ اور امیران کرام ‏ ‏ مثل خورد ان کو کرتے تھے سلام

لیکن آخر زیر حکمِ محتشم ‏ ‏ آئے چھ صوبے دکن کے یک قلم

حُسن دو دنا ہو گیا اخلاق میں ‏ ‏ کیوں نہ شہرہ ہوئے پھر آفاق میں

" وصایائے مغفرت مآب " کے عنوان کے تحت نظام الملک آصف جاہ اول کی وصیت اور تعریف جن الفاظ میں دانش نے کی ہے، ملاحظہ ہو ؎

چاہیئے یعنی فقیروں کی دُعا ‏ ‏ تا ریاست پر ہو افضالِ خدا ص ۴

پس کریں حکام ایسے کام نیک ‏ ‏ جس سے رہ جائے جہاں میں نام نیک

اس دکن میں چھ صوبوں کا شمار ‏ ‏ اور ہے تاریخوں سے یہ آشکار ص ۶

رفتہ رفتہ پھر بفضلِ کردگار ‏ ‏ پا گئی وہ سلطنت مجھ پر قرار ص ۷

ہو مسلماں یا کہ ہندو کوئی ہو ‏ ‏ کام حسبِ حوصلہ ہر اک سے لو

مرد ادنیٰ کو نہ اعلیٰ کام دیں ‏ ‏ اور نہ ادنیٰ کام بھی اعلیٰ سے لیں

واقفِ احوال رعیت سے نہ ہو ‏ ‏ سب سے بڑھ کر یہ مضر ہے شاہ کو ص ۸

Marfat.com

ایسی نیک اور دوراندیشانہ وصیتوں اور نصیحتوں کی اُمید تو ایک اچھے حاکم سے کی جاسکتی ہے۔ ۱۱۶۱ھ میں نظام الملک کا انتقال ہوا۔ جس کے چھ فرزند تھے مگر حق نے نظام علی خاں اسد جنگ آصف جاہ ثانی کو حکمراں بنایا ؎

گرچہ تھے اون کے چھ فرزند جواں | ایک کو حق نے کیا پر حکمراں ص ۹
وہ اسد جنگ نظام الدولہ تھے | جو کہ آصف جاہ ثانی ہوئے

جب ۱۲۱۸ھ میں نواب آصف جاہ ثانی نے رحلت فرمائی تو سکندر جاہ آصف جاہ ثالث تخت پر بیٹھے جس کی وفات ۱۲۴۴ھ میں ہوئی پھر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع نواب ریاست بنے۔ جو عثمان علی خان کے پردادا تھے۔ ؎

پھر سکندر جاہ کے نورِ نگاہ | ناصر الدولہ ہوئے ہیں بادشاہ ص ۱۱
عدل میں بخشش میں آمادہ تھے وہ | آپ کے ای ماہ پردادا تھے وہ
عرض کرتا اے دکن کے پادشاہ | پہلے ہے بہرِ دکن لازم دُعا
تو یہ فرمانے بصد لطف و منن | ہے وسعا دراصل یہ بہرِ دکن
وہ رہے گی سلطنت آباد جب | نوجہاں کے واں رہیں گے لوگ سب
ورنہ وہاں کے آئین کے یہاں بد رنگ | روزگار اہلِ دکن کا ہوگا تنگ ص ۱۳

مندرجہ بالا اشعار شاہ دکن کی دور بینی کی بہترین مثال ہیں جنھوں نے اُنتیس سال ریاست دکن پر حکومت کی۔ ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔ افضل الدولہ آصف جاہ خامس ۱۲۴۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ناصر الدولہ کی وفات پر تخت نشین ہوئے۔ ۱۲۸۵ھ میں بارہ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اس وقت وارثِ تخت میر محبوب علی خاں دو سوا دو سال کے تھے۔ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو تخت نشینی کی رسمیں ادا ہوئیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب ہوا شہزادہ باعز و جاہ | میر محبوبِ علی خاں بادشاہ ص ۱۵

Marfat.com

بارا سو پر سن تراسی تھا سعید | جس میں اس شہ کے تولد کی تھی عید
جیتا طالع خوشا بخت شہی | عہد طفلی ہو گیا تخت شہی
سن دو سال و ہفت مہ شان الہ | ہو گئے ملک دکن کے بادشاہ
نوجوانی میں ہوئے گو حکمراں | عقل سے لیکن ہوئی پیری عیاں
فضل حق سے ساوس آصف جاہ ہیں | آپ جن کے نور چشم ای ماہ ہیں
قدر افزائے ہنرمندان ملک | پرورش فرمائی پا بنداں ملک
آفتاب آسمان عدل و داد | جس سے روشن ہے دکن کا سب سواد ص ۱۶۱
خوش رہیں یارب بحق پنجتن | ساوس آصف جاہ سلطان دکن
سلطنت آباد یہ دائم رہے | حکمرانی شاہ کی قائم رہے

اس کے بعد دانش، شہزادہ میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کو ترغیب علم کے لئے نصیحتیں دیتا ہے "صفت خلق و احسان و رحم" کے عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہے یہ قول حضرت روح الامین | کرتا انسان گر سمجھے جان آفریں
کارسازی خلق کی کرتا سدا | ہے یہ افضل طاعت رب العلا
رحم خواہی رحم کن بر اشکبار | رحم خواہی بر ضعیفاں رحم آر
گر برآری حاجت محتاج را | بر سر اقبال یابی تاج را

مذکورہ بالا اشعار کی زبان مفرس ہے۔ مثنوی کا آخری عنوان "در دعا علی حضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ" قائم کیا ہے۔ جس کے مندرجہ ذیل اشعار پر مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ ؎

گرچہ دانش کیا دعا اوس کی ہے کیا | پر لیا نام اوس کا جس کو ربنا
تو نے اپنے نور سے پیدا کیا | کر کے پیدا پھر اوسے شہدا کیا
جس کی خاطر یہ بنے افلاک سب | رحمت اللعالمین جس کا لقب
ہر دم از ما صد درود و صد سلام | بر رسول و آل و اصحابش تمام

Marfat.com

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے۔ کہ مصنف کا اصل مقصد شہزادہ کو اُسے آباؤ اجداد کی تاریخ سے روشناس کرانا تھا، اس لئے مصنف نے اختصار کے ساتھ آصف جاہ اوّل سے آصف جاہ سادس تک کے نام، اُن کی ذاتی نیک خصوصیات کی طرف اجمالاً اشارہ کیا ہے اور رعایا کے ساتھ اُن کے مساویانہ سلوک کا ذکر نیز اُن کی تعریف و توصیف کی ہے۔ کسی بھی نواب کی فتوحات اپنے ہمعصر راجے یا نوابین کے ساتھ جنگی کارناموں اور رفع عام کے لئے کارہائے نمایاں کا تذکرہ کہیں نہیں ہے نہ عوام کی بہبود کا ذکر ہے۔

مثنوی کے بعد طویل ترقیمہ ہے۔ جس کے آخری الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"......... فدوی میر دلاور علی دانش المرقوم ماہ ربیع الاوّل ۱۳۱۷ھ" سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ مصنف کے اپنے ہاتھوں سے لکھا گیا جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

حال ہی میں اس قلمی نسخہ کی نقل لی. جاکر کے تحفۂ عثمانیہ موسوم کر کے طبع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

# مولوی محمد حبیب اللہ وفا

مولوی محمد حبیب اللہ نام، وفا تخلص تھا۔ والد کا نام اسد اللہ تھا۔ ۹ اکتوبر ۱۸۸۹ء؍۱۲۹۹ھ میں بمقام حیدر آباد پیدا ہوئے۔ بڑی طویل عمر پائی۔ ۱۹ جولائی ۱۹۶۲ء میں وفات پائی، چنچل گوڑہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے چچا محمد میراں تنہا سے حاصل کی۔ وفا کے دادا منشی حبیب ذکا بھی اپنے زمانے کے مشہور انشا پرداز و شاعر تھے۔ مرزا غالب نے ذکا مرحوم کی جن الفاظ میں تعریف کی ہے، قابلِ غور ہے:۔

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ کا نہیں میرے ایک دوست روحانی کا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اُٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ داں یکتہ لفظ طرازِ معنی آفریں صد آفریں ہزار صد آفریں" لہ

وفا نے ایسے تعلیم یافتہ روشن خیال خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ منشی فاضل مولوی فاضل کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں حاصل کی، انگریزی زبان سیکھنے کی طرف رجوع کیا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ فارسی کا ذوق و شوق ورا ثتاً ملا تھا، ابتدا میں فارسی کی طرف میلانِ طبع رہا، بعد میں اُردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ تقریباً ہر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی جو اس دور کے موقر جرائد ہفتہ وار، ماہناموں میں بکھری ہوئی ہے۔ مگر افسوس کلیات کی صورت میں اس کا کلام آج تک شائع نہ ہو سکا۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں بیدل سہارنپوری سے اور بعد میں مائل دکنی سے مشورۂ سخن کیا۔ وفا کو نظم

---

لہ زور محی الدین قادری مقدمہ آصف نامہ۔ ص ج

Marfat.com

طبا طبائی سے بھی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ جناب جلیل سے بھی اصلاح سخن لی۔ ہمارے موضوع سے متعلق وفا کی منظوم تاریخ "آصف نامہ" ہے۔ جو انہوں نے نواب میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع کی پچیس سالہ عہدِ حکومت کی تاریخ ۱۳۴۵ف میں نظم کی۔ وفا آصفیہ خاندان کی تاریخ سات حصّوں میں نظم کرنا چاہتے تھے۔ مگر سب سے پہلے انہوں نے ساتویں جلد تصنیف کی۔ حضرت وفا نہایت ذہین اور بے حد حاضر جواب و حاضر دماغ تھے۔ فی البدیہہ اشعار موزوں کرنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ خواجہ حسن نظامی اپنے روزنامچہ میں وفا کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :-

"میں نے ہندوستان کا چپہ چپہ گشت کیا، شاعر تو بہت نظر آئے لیکن وفا سا حافظ شاعر نظر نہیں آیا۔ اِن کا خداداد حافظہ بلا کا ہے۔ ہزاروں شعر نوکِ زبان ہیں، مسلسل سُنائے جاتے ہیں" [1]

حضرت وفا بیدر زہائی سکول کے مددگار و معاون تھے۔ بیدر اور حیدرآباد میں ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ مثنوی کے مندرجہ ذیل شعر سے مثنوی کے سن تصنیف کا پتہ چلتا ہے ؎

بسالِ سیزدہ صد چہل و پنجم ۱۳۴۵ف بنظم آرم صفات شاہ ہفتم ص ۱۲

"آصف نامہ" مولوی محمد حبیب اللہ وفا نے آصفیہ خاندان کی تاریخ سات جلدوں میں نظم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ سب سے پہلے جلد ہفتم دفترِ عثمانی ۱۳۴۵ف ۱۹۳۶ء میں بتقریب جشن سیمیں نواب عثمان علی خان کے موقعہ پر شائع ہوئی۔ یہ جشن بمقام جوبلی حال باغ عامہ میں منعقد ہوا تھا۔ آصف نامہ کی ابتدا حمد نعت سے ہوتی ہے۔ مثنوی میں چھوٹے چھوٹے عنوانات نثر میں قائم کئے ہیں " فخر و تعلی " عنوان کے تحت اپنے بارے میں فرماتے ہیں ؎

---

[1] بحوالہ رہنمائے دکن روزنامچہ جلد ۲۶ ۔ ص ۶ ۔ کالم نمبر ۵

Marfat.com

تھی طفلی میں بھی دُھن شعر و سخن کی | تھی جست و خیز میدان خالی
جوانی عالم معنی میں گزری | قیامت خیز مستانہ گھڑی تھی
سخن کی فکر اور پیری کا عالم | جوانی کا ابھی باقی ہے دم خم
میری گھٹی میں ہے صہبائے معنی | میری آنکھوں میں ہے لیلائے معنی
ہر اک صنفِ سخن جاگیر میری | قصیدہ بھی، غزل بھی، مثنوی بھی ص ۵
سخن کی وراثتاً آئی ہے دولت | مجھے حضرت ذکا سے خاص نسبت ص ۶

عنوان" مقدمہ آصف نامہ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے عہد کے پہلے پچیس سالوں میں تعلیمی عدالتی اسکیموں، حکومت کی تنظیم نو، طبابتِ فوج، تعمیرات، صنعت، آبپاشی کے شعبوں میں ترقی ہوئی، چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوں زرّیں کارنامے اس سے روشن | ہو تاریخ دکن بدرجہ احسن ص ۸
ہے پہلی جلد سے تا جلد ہفتم | دکن کا ایک تاریخی ہے قلزم
"ترقیات" دورِ شاہ عثماں | مثالِ آفتاب اس میں درخشاں
تقویم جلد ہفتم کو ہے زیبا | ہے اس تصنیف کا یہ اصل منشا
بہارِ جشنِ سیمیں ہے گل افشاں | زہے اقبال عثماں ہے درخشاں ص ۹
یہ موقعہ ہے کہ دورِ حاضرہ کے | ہوں موزوں آج زرّیں کارنامے
یہ ہے اک دورِ عثماں کا مرقع | ترقیاتِ نَو سے ہے مرصّع ص ۱۰
ہے تعلیمی ترقی اس سے روشن | اساسِ جامعہ ہے جلوہ افگن
عدالت کی عظیم الشان اسکیم | خوشا بابِ حکومت کی جو تنظیم
طبابت، فوج، صنعت آبپاشی | غرض ہر محکمے کی ہے ترقی
ہے فہرست اس کی مختصر سی | وقائع اور ہیں ان کے سوا بھی
نظر جس کی پڑے اس مثنوی پر | ترقیات عثماں ہو اظہر

"وزرائے امرائے دکن" کے عنوان کے تحت کشن پرشاد، حیدری، مہدی یار جنگ،

Marfat.com

معین الدولہ، امیر ابن امیر یوسف علی خان کی توصیف، ان کے محکموں کی کارگزاری نواب عثمان علی خان سے اُن کی وفاداری، کمالِ علم و دانش اور شجاعت کے تفصیلی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

امیرانِ دکن وزرائے سلطان — ستارے مہرِ عالم تابِ عثمان
کشن پرشاد عالی مرتبت ہیں — وزیرِ شہ یمین السلطنت ہیں
ہیں صدرِ اعظمِ بابِ حکومت — وفاداریٔ مالک جس کی خدمت
قلم محوِ ثنائے حیدری ہے — تعالی اللہ یہ بھی خیبری ہے
مسلم حیدری کی شان و شوکت — ہے تیغ ذو الفقار اقبال و نصرت
مِلا عہدہ پریوی کونسلر کا — ستارہ ان کا مغرب میں بھی چمکا ص ۱۵
ہیں مہدی یار جنگ اک خرد یکتا — کمال و فضل و دانش کا ہے دریا
یہ ہیں صدر سیاست صدر تعلیم — یہ ہیں مہرِ فراست بدرِ تعلیم
معین الدولہ ذی اقبال و حشمت — ہے جس کی آسماں جاہی امارت
یہ ہے شیرِ نیستانِ شجاعت — نشانہ جس کا برقِ قہرِ قدرت
امیر ابنِ امیرِ حیدرآباد — دکن فیض و کرم سے جن کے آباد
خوشا یوسف علی خاں ذی امارت — ہے جس کے گھر کی موروثی وزارت
بکثرت ہیں امیر اور راجگاں بھی — نہیں ممکن یہاں تفصیل اُن کی

نواب عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی تخت نشینی و تاج پوشی کے وقت جشن کا منظر ملاحظہ ہو ؎

مبارک تیرہ سو انیس ہجری — کہ جس کی ہر گھڑی عہدِ طرب تھی ص ۲۰
مبارک ظلِ حق کو یہ خلافت — مبارک باپ دادا کی حکومت
یہ وہ شہ جس پہ نازاں بادشاہی — ہے زینت بخش تخت و کج کلاہی
جلوسِ میمنت مانوس ہے آج — فلک بھی شاہ کا پابوس ہے آج
جلوسِ شہ کی ہے کیا شان برتر — فلک قرباں تصدق ماہ اختر

Marfat.com

مبارک باد کی گونجیں صدائیں ۔۔۔ چلیں باغِ مسرت کی ہوائیں
بہارِ گلشنِ اُمید آئی ۔۔۔ دکن والو مبارک عید آئی

قیامِ جامعہ عثمانیہ سے علم وفن کو ترقی ملی۔ فارسی زبان اب آخری سانسیں لینے لگی۔ اُردو زبان میں از سرِ نو علمی جوہر پاروں کی چمک اور حکمت وفن کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ ۵

دکن میں آج زندہ علم وفن ہے ۔۔۔ شہ عثماں مسیحائے زمن ہے ص ۲۵
علوم وفن کے سرچشمے ہیں جاری ۔۔۔ برستا ہے سحابِ فضلِ باری
بڑھی عثمانیہ سے شانِ اُردو ۔۔۔ اُسی سے ہے بقاءِ جانِ اُردو
گزشتہ دور کی اُردو میں کیا تھا ۔۔۔ فسانے، تذکرہ شعروسخن کا
نہ علمی جوہروں کی کچھ چمک تھی ۔۔۔ نہ اُس میں حکمت وفن کی جھلک تھی
جمارہتا یونہی گر اس کا نقشا ۔۔۔ مبادا مِٹ ہی جاتا نام اس کا
اسی اُردو کا ہے عثماں شاہ برتر ۔۔۔ بہت موزوں ہے معنی اس کے لشکر ص ۲۵
نئے سر سے کیا اُردو کو زندہ ۔۔۔ دکھایا شاہ نے اعجازِ مسیحاہ

جہاں دوسری دیسی سلطنت کے نمائندوں نے لندن میں جا کر گول میز کانفرنس میں شرکت کی وہاں عثمان علی خاں نے حیدری کو شرکت کرنے کے لئے بھیجا۔ حیدری کی سیاسی سوجھ بُوجھ کسی ہمعصر سلطنتوں کے نمائندوں سے کم نہیں تھی۔ ۵

ہزار و نہ صد و ہم سی و یکم ۔۔۔ ہے اس سنہ میں سیاست کا تلاطم ص ۴۶
ہوا لندن میں اک اجلاس ذی شاں ۔۔۔ سیاست داں مدبّر جمع تھے واں
ہوا ہے راونڈ ٹیبل سے وہ موسوم ۔۔۔ سیاسی مسئلے طے ہوں یہ مفہوم
نمائندے بھی دیسی سلطنت کے ۔۔۔ گئے لندن کو شرکت کی غرض سے
شہ عثماں نے بھیجا حیدری کو ۔۔۔ تدبّر کی ہے جس کے دھوم ہر سو

عثمانیہ دور کی بے شمار برکتوں میں سررشتہ آثارِ قدیمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔

Marfat.com

جس کے تحت قدیم آثاروں کا تحفظ ہوا۔ اس سررشتہ نے یورپ، جاپان، امریکہ میں اجنتہ ایلورا کی طرف توجہ منعطف کرادی جس کا خاطرخواہ نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار سیاحوں کو آنے کی دعوت ملی۔ ؎

یہ فیض دورِ عثماں ہے سراسر — ہے آثارِ قدیمہ کا بھی دفتر
وہ آثارِ قدیمہ ہیں دکن کے — ہوا امتیاز ہندوستان جن سے
ایجنتہ اور ایلورا کے دو غار — روایاتِ کہن کا جن سے اظہار
وہ جھن دولت آباد اور پانگل — وہ بیدر اور اضلاعِ ورنگل ص۳۲

ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی عثمانی دور میں خوب ہوئی بے شمار کارخانے اور برقی مشینیں چلنے لگیں ؎

خوشا اے دورِ عثمانی کی برکت — ترقی پر ہے صنعت اور حرفت
وہ دارالسلطنت سرکارِ عالی — کہ جس نے اک بنا صنعت کی ڈالی
ہزاروں کارخانے بھی ہیں جاری — مشینیں چل رہی ہیں جن میں برقی ص۴۹

ریاست میں بیسوں پل بڑی بڑی ندیوں اور سینکڑوں پلیں ندی نالوں پر تعمیر ہوئیں۔ درجنوں بڑے بڑے کارہا آبپاشی مثلاً نظام ساگر اور اس کی نہریں۔ عثمان ساگر، حمایت ساگر، جن سے آبپاشی کی تجدید و توسیع عمل میں آئی۔ لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہونے لگی ؎

خوشا وہ آبپاشی کا ہے دفتر — کہ پانی بھر گیا ہے ابر تر پر ص۱۴
زمیں ہے ملک کی سیراب اس سے — زراعت جا بجا شاداب اس سے
عظیم الشاں بنا عثمان ساگر — ترقی ملک کی جس سے سراسر
خوشا سنہ تیرہ سو چھبیس فصلی — پڑی اس سنہ میں ہے بنیاد اس کی
بنا پینتیس فصلی میں بھی تالاب — کہ جس کے فیض سے ہے ملک سیراب
حمایت ساگر اس کا نام مشہور — ہے اک دریائے فیضِ عام مشہور
ہزار و سہ صد و ہم چہل و یکم — بنا اس سنہ میں ہے یہ رشکِ قلزم

Marfat.com

صدر دواخانہ نظامیہ کا قیام عثمانیہ ہاسپٹل، عثمانیہ دواخانہ یونانی اور سررشتہ طبابت کی از سرِ نو تنظیم عثمانیہ دور کے ایسے کارنامے ہیں جو نہ صرف ریاست کے لئے مایۂ فخر و ناز ہیں بلکہ مدتوں تک یادگار رہیں گے ص۴۵

خوشا مخزن طبابت کا دکن ہے — شہ عثمان مسیحائے دکن ہے
شفا خانے نئے ہر جا کھلے ہیں — بہم سامان صحت کے ہوئے ہیں
طبیبِ کامل و حاذق مقرر — ہیں صدہا ڈاکٹر بھی نام آور
ترقی پر ہے طبِّ انگریزی — قدیمی طبِّ یونانی و مصری
اِک انگریزی شفا خانہ بنا ہے — بلندی میں فلک سے بھی سوا ہے
وہ یونانی شفاخانے کی تعمیر — بلندی کی ہے اک سرتاپا تصویر ص۴۶

سررشتہ، بٹہ خانہ (ڈاک خانہ) کی بڑی وسعت ہوئی جن کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا۔ منی آرڈر، پارسل اور سیونگ بینک کے کام کا قابلِ ذکر اضافہ ہوا ؎

سلاطین ہیں جو خود مختار حاکم — ہے نظمِ ملک جن کے دم سے قائم ص۶
خصوصیات شاہی ٹپہ سکہ — بلند ان سے حکومت کا ہے پایہ
دکن کا ضلع ہو صوبہ کہ قصبہ — جدھر دیکھو ادھر جاری ہے ٹپہ
منی آرڈر بھی بھنگی پارسل بھی — خوشا بے کھٹکے گھر بیٹھے ہی پہنچی
سیونگ بنک اس کی ہے اک شاخ قائم — ثمر ور ہے رعیت جن سے دائم

۱۸۵۳ء میں برار کا علاقہ انگریزی عملداری میں چلا گیا تھا۔ مگر جب ولنگڈن وائسرائے ہندوستان میں آئے تو برار کا مسئلہ طے پایا اور آصفیہ پرچم وہاں لہرانے لگا ؎

برار اک ہے عظیم الشان صوبہ — ہے ملک ہندی زرخیز خطہ
ہے اس صوبے کا رقبہ بھی فزوں تر — ہے اکثر ہند کے ملکوں سے بڑھ کر
دکن کا حکمراں ہے اس کا والی — تھا اس پر قبضۂ سرکارِ عالی

Marfat.com

ہوا تفویض برٹش کے یہ صوبہ — کہ پورا فوج کا ہوا اس سے قرضہ
عملداری تھی جب برطانیہ کی — تھا سنہ اٹھارہ سو تریپن مسیحی
تھی شہ کو ملک استرداد اُس کی — تھی کوشش ابتدا سے اس کی جاری
ولگنڈن وسرائے ہندوستاں کا — ہوا ملکِ دکن میں رونق افزا
ہے زیرِ پرچمِ آصف براز آج — دکن میں ہو گیا اس کا شمار آج

عنوانِ "دُعا" پر مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دعا ہے دودمان آصفی کا — رہے یارب ابد تک بول بالا
رہیں یارب بہی خواہ اُن کے خوش حال — ہوں بد خواہ ان کے خستہ خوار پامال[۱۸]

المختصر عثمان جاہ کے دورِ حکومت میں ہر میدان میں خوب ہی ترقی ہوئی اگر وفا نے آصفی خاندان کے تفصیل سے تاریخ کے احوال نظم کر دیئے ہوتے تو کم سے کم ایک خاندان کی اچھی اور مستند تاریخ وجود میں آجاتی۔ تاریخی اعتبار سے آصف نامہ مستند ہے۔

Marfat.com

# ذوقی

سید حسین نام، ذوقی تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام سید احمد حسین تھا۔ حیدرآباد میں ۱۳۱۳ھ بروز سہ شنبہ سات صفر مطابق ۲۳ جولائی ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۶۲ء کو ساڑھے ہینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اپنی پیدائش کے متعلق مثنوی ذوقی میں "میری دنیا" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں ؎

تیئیس تاریخ تھی جولائی کی دیکھئے شان کبریائی کی

میرے ماں باپ بامراد ہوئے سن تھا اٹھارہ سو پچیانوے

اور تیرہ سو تیرہ ہجری تھی سات تاریخ وہ صفر کی تھی

یوم سہ شنبہ صبح کا تھا وقت گود میں ماں کی جاگے میرے بخت

گا یا ماں باپ نے ترانہ مرا لایا دنیا میں آب و دانہ مرا[^1]

ذوقی نے اردو فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ والد کی نگرانی میں خوش خطی بھی سیکھی۔ والد کے اصرار کے باوجود تلگو اور انگلش کی تعلیم حاصل نہ کی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مثنوی کے علاوہ غزلیں رباعیات اور دیگر اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی۔ راقم الحروف کو ۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء کو ذوقی مرحوم کے دولت خانہ "آستانہ ذوقی" میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ذوقی کے صاحب زادے میر احمد صادق نے اپنے والد مرحوم کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام دکھلایا جو لاپروائی کا شکار ہو رہا تھا۔ ذوقی نے حصول تعلیم کے بعد ڈاک خانہ میں ملازمت اختیار کی۔ ملازمت میں ترقی کرتے کرتے چیف پوسٹ ماسٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں، جب حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو سرکاری دفاتر کا کام انگریزی زبان میں ہونے لگا۔ ذوقی

---

[^1]: ذوقی سید حسین مثنوی ذوقی موسومہ شاہنامہ احمدیت مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان حیدرآباد ۱۹۶۰ء صفحات ۲۸۶

Marfat.com

کو انگریزی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر نوکری کرنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا ملازمت ملازمت چھوڑ دی۔

**مثنوی ذوقی** مثنوی ذوقی، موسومہ شاہنامہ احمدیت کے تین حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں "فروغ اسلام" حصہ دوم میں "عروجِ احمدیت" اور حصہ سوم میں "ابنی کائنات" کا ذکر کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں مثنوی مکمل ہوئی پہلی مرتبہ یکم رجب مطابق یکم جنوری ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ جو تین سو چھیاسی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بہت سے عنوانات قائم کئے ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق اس مثنوی میں چند نامور تاریخی شخصیتیں اور چند تاریخی واقعات ہیں جنہیں ذوقی نے نظم کیا ہے۔ چند عنوانات اس طرح ہیں "بابا نانک" "سر سید"، "سر ڈگلس" "طغیانی" "رد موسیٰ" "قیامِ پاکستان"، "سر ظفر اللہ"، "پولیس ایکشن"، "آثارِ تنظیم" ان اشخاص و واقعات کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ مستند، مگر کسی بھی تاریخی شخصیت کا واقعہ تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔

مثنوی کے پہلے دو حصوں کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ پہلے حصے کی حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حمد و تعریف کیا کروں میں رقم — لوح پر جب کہ سرنگوں ہو قلم
میرے اللہ! تیری شان اور حمد — میں لکھوں! یہ میری زباں اور حمد
میری طاقت بھلا یہ میری مجال — کہ خیال ثنا ہے خام خیال
ادنیٰ بندہ تیری کرے توصیف — ربِّ اعلیٰ کی مجھ سے ہو تعریف

مثنوی ذوقی ص ۱

مثنوی حصہ دوم میں "بابا نانک" اور "سر سید احمد خاں" کے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بابا نانک تھے اک بزرگِ قوم — دل سے تھے عاشقِ صلوٰۃ و صوم
اہلِ باطن تھے نیک اہل اللہ — وقت کے اپنے ایک اہل اللہ

Marfat.com

گو تھے مذہب کے اپنے وہ ہندو — اُن میں اسلام کی تھی کُل خُو بُو
ہے گروہ اُن کا قوم سِکھ مشہور — اُن میں اہلِ شعور بھی ہیں ضرور
وہ ہے پڑھ لیں جو بابا نانک کے — تو ہوں واقف وہ سب حقیقت سے

اور سرسید احمد خاں کے متعلق یوں فرماتے ہیں ؎

تھے جو مشہور ایک سرسید — وہ زمانے کے اپنے اہلِ خرد
اور علیگڈھ کے رہنے والے تھے — تھے وہ بانی وہاں کے کالج کے
دل پہ گزرے گا ایک ایسا بار — جینا ہو جائے گا بہت دشوار
اللہ والوں کی بات ٹلتی ہے؟ — منہ سے اِن کے جو کچھ نکلتی ہے
سُنئے جب پیش آیا وہ منظر — بانیٔ کالج علی گڑھ پر
کچھ دنوں بعد ہی پھر ایسا ہوا — غبن مال کا پڑا جھگڑا
صدمہ پہنچا کچھ ایسا اُس بد سے — غم کی تکلیف اُٹھی نہ سیّد سے
مال کا ایسا کچھ ملال ہوا — اسی صدمہ سے انتقال ہوا

## پولیس ایکشن

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ ہند کی سبھی ریاستوں نے اپنی خود مختاری ختم کردی اور ایک ترنگے جھنڈے تلے آگئیں۔ صرف ریاست حیدرآباد کے نواب میر عثمان علی آصف جاہ سابع نے اپنی خود مختاری ختم نہیں کی۔ ایک سال بعد دسمبر ۱۹۴۸ء میں حکومت نے فوج روانہ کی اور حیدرآباد کا محاصرہ کرلیا۔ حیدرآباد میں فوجی راج قائم ہوا۔ پھر بھی ۱۹۵۰ء تک نواب کی خود مختاری قائم رہی۔ ۱۹۵۰ء میں نواب حیدرآباد اور گورنر جنرل آف انڈیا کے مابین عہد نامہ ہوا۔ جس کی رُو سے ریاست حیدرآباد کی خود مختاری ختم ہوئی اور حیدرآباد ہندوستان کا صوبہ بن گیا۔ اس تاریخی واقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا لکھوں پولیس ایکشن کا حال — سرزمینِ دکن کا ہائے زوال
زندگی شہ کی قابلِ عبرت — شانِ امراء کی لائقِ حسرت
کل وہ کیا تھے اور آج وہ کیا ہیں — اپنی دُنیا کے اک تماشا ہیں

Marfat.com

مال و دولت کہاں ہے اُن کی آج — شان و عزت کہاں ہے ان کی آج
حیدرآباد کے بڑے اُمراء — کر گئے ایکشن سے پہلے قضا
لے گئے ساتھ میں وہ اپنی شان — یعنی رکھ لی خدا نے اُن کی شان
ایسے دور سے میں وہ اگر ہوتے — اپنی عزت بُری طرح کھوتے
آصفِ سابع شاہ عثماں نام — کرے قارون جن کو جھک کے سلام
وقت کے اپنے ہیں وہ حاتم بھی — دل کا ان کو کہتے ہیں رستم بھی
کل تھے شہ آج ہیں رعایا وہ — ہیں عجیب حال میں خدایا وہ
لائق حسرت ان کا بیٹا ہے — قابلِ عبرت آنا جانا ہے
گئی شاہی اور ریاست بھی — اور رعایا پہ آئی نکبت بھی

## آندھرا تنظیم

۱۹۵۶ء میں صوبہ کی از سرِ نو تنظیم ہوئی۔ حیدرآباد تقسیم ہوا۔ ریاست حیدرآباد کا نام آندھرا پردیش پڑا۔ فدوی کو بھی اس کا ملال ہے کہ دکن کا نام دکن نہیں رہا۔

ہے دکن اپنا آندھرا پردیش — ہے وطن اپنا آندھرا پردیش
از سرِ نو ہوئی ہے جو تنظیم — حیدرآباد ہو گیا تقسیم
پنجشنبہ یکم نومبر کا — قوم میں دن ہے ایک محشر کا
غم وطن کا الم قرابت کا — قوم میں اک ستم ہے فرقت کا
ایک غم سلطنت کا شہ کو ہوا — ملک میں پولیس ایکشن ہوا
پہلا سن[1] شاہ کے جگر کی ٹیس — یعنی اُنیس سو پہ سینتالیس
دوسرا[2] قوم میں عجب سن تھا — جو کہ اُنیس سو پہ چھپن تھا
آندھرا نے کیا مقامِ دکن — مٹ گیا اب دکن سے نامِ دکن
اب کہاں تاج اور کہاں ہے تخت — اقتدارِ نظام رفت گزشت

---

۱؎ پولیس ایکشن، جس سے نوابیت جاتی رہی — جو حقیقت میں ۱۹۴۸ء میں ہوا
۲؎ مراد ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد تقسیم ہوا۔

Marfat.com

سن فصلی کا لٹ گیا اب بخت　　　حیدر آباد پارہ پارہ گشت

۱۳۶۶ ف

ذوقی نے مثنوی میں سادہ سلیس، روزمرہ اور با محاورہ زبان کا استعمال استعمال کیا ہے، جو نہایت عام فہم ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہیں معلوم بھاگا سانپ کدھر　　　اب تو اُس کی لکیر پٹیا کر
پھر ارض و سما کی جب چکی　　　گیہوں کے ساتھ پس گیا گھن بھی
بیل ان کی منڈھے چڑھے مولا　　　باغ پھولے پھلے سدا ان کا

مثنوی ذوقی ایک ادبی، مذہبی، علمی اور تاریخی ورثہ ہے جس پر ذوقی کو بجا طور پر ناز ہے۔ مثنوی کے چند اختتامیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پائی تکمیل مثنوی میری　　　اور ہوئی پوری دل لگی میری
ناتمام اس کو سمجھو یا کہ تمام　　　کام ہونا جو تھا ہوا وہ کام
میں نے پانی کیا ہے خون اپنا　　　اور پورا کیا جنوں اپنا
ادبی، مذہبی اور علمی　　　مثنوی بن گئی ہے تاریخی
مبتدی کے لئے یہ تعلیمات　　　منتہی کے لئے ہے یہ سوغات
ہے مہینہ جو یہ دسمبر کا　　　ہو گیا کام ختم دفتر کا
سن ہے اُنیس سو یہ اٹھاون　　　رہی اب سوچ سے نہ کچھ اَن بَن

ذوقی نے آخر میں "شکر گزاری" کا عنوان قائم کیا ہے جو مثنوی کے انداز میں منظوم شکریہ اپنے ان احبابوں، دوستوں کا کیا ہے، جو مثنوی کی اشاعت میں مددگار و معاون رہے۔

Marfat.com

# میر جعفر زٹلی

میر جعفر نام، جعفر تخلص تھا۔ زیب النساء نے اسے زٹلی لقب دیا تھا۔ جو دھیرے دھیرے تخلص کا جزو ہو گیا۔ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" گیان چند جین نے بلوم ہارٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جعفر اورنگ زیب کے سال جلوس ۱۶۵۸ء کے کچھ سال بعد پیدا ہوئے۔ سال پیدائش کے تعین میں اختلاف ہے "محمود شیرانی" نے پنجاب میں اردو[1] میں سال ولادت ۱۰۶۵ھ لکھا ہے۔ اردو شہ پارے[2] کے مصنف نے ۱۰۶۰ھ بتایا ہے۔ وطن نارنول ضلع گوڑگاؤں تھا۔ ان کے والد پیشے کے لحاظ سے دوکاندار تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ابواسحٰق اطعمہ سے پائی۔ فطرت نے شاعرانہ مزاج عطا کیا تھا۔ مدرسے کے ماحول نے اس ذوق کو اور ہوا دی۔ فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تعلیم گاہوں میں بھی اس کا بول بالا تھا۔ میر جعفر نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے کلام میں اردو فارسی زبان کی آمیزش کا عمدہ نمونہ ملتا ہے۔ کلام میں دکنی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ جو دکن میں کچھ دن رہنے کا نتیجہ ہیں۔

انتقال کے بارے میں ان کے کلیات میں یہ سرخی ملتی ہے "سکہ فرخ سیر کہ میر جعفر را قتل کنانیدہ بود" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ فرخ سیر نے قتل کرایا تھا۔ اس کی وجہ شاہی سکہ پر کندہ شعر کی تضمین کر کے اس کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کرنا تھا۔ شاہی سکہ کا اصل بیت ملاحظہ ہو ؎

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر     بادشاہ بحر و بر فرخ سیر

اس پر میر جعفر کی مضحکہ خیزی پر غور فرمایئے ؎

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر     بادشاہ پشمہ کش فرخ سیر

---

[1] محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" ص ۱۹۹    [2] زور ڈاکٹر محی الدین "اردو شہ پارے" ص ۱۳۶

فرخ سیر ۱۱۲۵ھ میں تخت نشین ہوئے۔ اس لئے ڈاکٹر زور کی رائے ہے کہ میر جعفر کا سال وفات بھی یہی ہے جو قرین قیاس ہے۔ میر جعفر نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی۔ شہنشاہ ہو یا شہزادہ، سردار ہو یا کوئی عام آدمی، جس سے بھی ذرا دل برداشتہ ہوئے فوراً اس کی ہجو لکھ ماری۔

کلیات زٹلی کے چار نسخے انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ جن میں تین خط نستعلیق اور ایک خط شکستہ میں ہے۔ راقم الحروف کو ایک نسخہ ایشاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں بھی ملا۔ جس پر "کتاب کالج فورٹ ولیم" اور "ہنری بابلیو" کی مہریں ثبت ہیں۔ یہ نسخہ بھی خطِ شکستہ میں ہے۔ کلیات جعفر پہلی بار ۱۸۶۷ء میں بمبئی سے چھپا۔ اس کے بعد لکھنؤ اور بجنور سے بھی اس کی اشاعت ہوئی۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر کا رجحان ہزل گوئی کی طرف زیادہ تھا۔ اس سے بڑھ کر نہ پہلے کوئی ایسا ہزل گو پیدا ہوا اور نہ بعد میں۔ گویا ہزل گوئی ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلیات میں تہذیب و متانت، پند و اخلاق، رشد و ہدایت کے نمونے نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہزل گوئی کی کثرت نے اخلاقی اور سنجیدہ شاعری کے مطالعہ اور اس کے مرتبہ کے تعین کے سلسلے میں دبیز پردے کا کام دیتی رہی۔

لچھمی نرائن شفیق نے "چمنستان شعراء" میں حوالہ دیا ہے کہ محمد اعظم شاہ کا کہنا تھا کہ میر جعفر کی رذلیت نے انہیں ملک الشعراء نہیں بننے دیا۔ کلیات میر جعفر کا نصف اوّل نثر میں ہے اور نصف آخر نظم میں۔ میر جعفر نے شاعری کی تقریباً ہر صنف مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ہجو، رباعیات، قطعات، مخمس وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں مثنویوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سب سے طویل مثنوی "ظفرنامہ اورنگ زیب شاہ عالمگیر بادشاہ غازی" ہے جو ۱۰۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کلیات میں "در صفت پیری گفتہ"، "سپس نامہ"، "طوطی نامہ گفتہ"، "در صفت تنزل حسن و جوبن گفتہ"، "در بیانِ دلا دری" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا مثنویوں کے علاوہ کچھ ہجویہ مثنویاں بھی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے میر جعفر کے قصیدے "صفت جلوسِ اعظم شاہ بعد عالم گیر" کو جعفر کی مثنویوں کی فہرست میں شمار

Marfat.com

کیا ہے جو درست نہیں۔

## مثنوی ظفرنامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی

میر جعفر کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ یہ ایک تاریخی مثنوی ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق شمالی ہند میں اُردو کی تاریخی مثنوی کا موجد میر جعفر زٹلی کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کسی تاریخی مثنوی کا ذکر نہیں ملتا۔ اس مثنوی میں میر جعفر نے اورنگ زیب کی فتح دکن کا ذکر کیا ہے۔ اورنگ زیب نے ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور کو فتح کیا اور اپنی سلطنت میں ملایا۔ اس سے پہلے دوسری دکنی سلاطین قطب شاہی، نظام شاہی اور برید شاہی فتح ہو چکی تھیں۔ بیجاپور کو فتح کرنے میں جے سنگھ جیسے جنرل کام میں آئے۔ مغلیہ فوجوں کو بار بار شکست کھانے کے بعد آخر ۱۰۹۷ھ میں کامیابی ہوئی جب دکن کی خبریں دہلی پہنچیں تو میر جعفر کے دل میں جوش و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انہوں نے ظفرنامہ اورنگ زیب لکھ کر اورنگ زیب کو پیش کیا۔ اورنگ زیب جیسے کٹھ ملا کیا دادِ سخن دیتے۔ شاعر نے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے اورنگ زیب کی ہجو لکھی اور اس طرح دل کو تسکین دی۔

قدیم مثنوی کے لوازمات میں حمد، نعت، منقبت، مدح شاہ، نفسِ مضمون اور خاتمہ سب کچھ آجاتے ہیں۔ مگر میر جعفر نے کسی مثنوی میں بھی ان اجزائے ترکیبی کی پابندی نہیں کی۔ وہ سیدھے ہی اصل موضوع کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ مثنوی ظفرنامہ اورنگ زیب کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زہے شاہ اورنگ دھانگ بلی  کہ در ملکِ دکن پڑی کھل بلی
دریں پیر سالی و ضعف بدن  مچائی دھما چوکڑی در دکن

کیا خوبصورت رزمیہ اندازِ بیان ہے۔ شاعر شروع سے ہی شہنشاہ اورنگ زیب کی بہادری کی تعریف کرنے لگتا ہے کہ بڑھاپے میں دہلی سے دور دکن پر چڑھائی کی اور آہستہ آہستہ دکنی صوبوں کو زیر کیا۔ دکنی سرداروں کو اپنی شاطرانہ سیاسی چالوں سے آپس میں لڑایا۔ سکندر عادل شاہ اور اس کے ہمعصر ابوالحسن تانا شاہ کو شکست

Marfat.com

دی۔ علاوہ ان کے جتنے چھوٹے بڑے مرہٹے سردار تھے اُن کی اورنگ زیب کے سامنے کوئی حقیقت نہیں تھی۔ مرہٹہ سردار کھوساجی، باباجی، کانھوجی، مدناجی پنڈت، داناانکئی مرزا خلیل وغیرہ تو کسی گنتی میں نہیں تھے۔ اورنگ زیب کے بیٹوں نے اپنے والد سے دکن کی مہم کے وقت غداری کی اور بغاوت کردی، یہاں تک کہ ایک شہزادے نے تو اپنے بادشاہ ہونے کا سکّہ بھی جاری کردیا، جس سے اورنگ زیب کے لئے کافی مشکلات پیدا ہوگئیں۔ جعفر کی رائے ہے کہ اگر ان کے بیٹے بغاوت نہ کرتے تو کیا مجال تھی کہ سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ سر اٹھاتے۔ مگر بادشاہ نے اپنی شاطرانہ چالوں اور سیاسی سوجھ بوجھ سے دکن کو فتح کرلیا۔

چونکہ شہزادہ کام بخت نے وفاداری کا ثبوت دیا تھا اس لئے میر جعفر نے مثنوی کے آخر میں اس کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد بادشاہی لشکر کی مدح سرائی پر مثنوی ختم ہوجاتی ہے۔ مثنوی کے سنہ تصنیف کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر داخلی شواہد سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مثنوی ۱۰۹۸ھ کے آس پاس لکھی گئی ہوگی، کیونکہ اس مثنوی میں بیجاپور اور سکندر عادل شاہ کا ذکر بار بار آیا ہے اور سکندر عادل شاہ نے ۱۰۹۷ھ میں اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔

میر جعفر کے شاعرانہ مرتبے کا اندازہ لگائیے کہ اس نے کن الفاظ میں اورنگ زیب کا تعارف کرایا ہے ؎

| | |
|---|---|
| زہے شاہ شاہاں کہ گا ہے وغا | نہ ہلدّ نہ ٹلدّ نہ جنبد ز جا |
| کمر بستہ ہشیار میدان پر | شب و روز تیار گھمسان پر |
| زہے پادشاہ فلک اقتدار | چو سیماب یکجا ندارد قرار |
| زہے حکمتِ شاہ اورنگ زیب | کٹادے لڑادے بفنِ فریب |
| بہ بیجاپور آمد دھڑلا وہیں | برافواج اعدا چڑ ہلا کہیں |

مندرجہ بالا اشعار میں اُردو فارسی اور ہندی کے الفاظ کی آمیزش ایک لطف پیدا کررہی ہے اور طبع پر گراں نہیں گزرتی۔

اورنگ زیب کے بیٹے بغاوت پر اُتر آتے ہیں تو سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کو بھی سرکشی کا موقعہ مل جاتا ہے اس واقعہ کو میر جعفر نے بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا۔ اس موقعہ پر مثنوی میں زبان بھی زیادہ مفرس ہو جاتی ہے اور طبع پر گران گزرتی ہے علاوہ ازیں جذبات نگاری رنگ ہزلیت اختیار کر لیتی ہے ؎

ازیں تین بیٹے نپٹ ناخلف — پسر خود خلف بہ دگر نہ تلف
دگر یک پسر بر سرِ زد شود — شہنشاہ از بسکہ برمہ شود
وگرنہ چہ یارا حسن شاہ را — کہ گرداند اُمرئے شہنشاہ را
کجا بر فروزد چراغ منیر — بہ پیش دم اژدہا شیر گیر
مگس را چہ طاقت کہ باشاہباز — بہ ہیجا درآید بود کینہ ساز
چہ پشہ کہ باشیر پہلو زند — چہ پستو کہ با اژدہا پہلو زند
چہ بیجاپور است وچہ کرناٹک است — چہ آں گولکنڈہ کہ یک پھانک است
چہ باباجی پنڈت چہ راوت حمیر — چہ کھوساجی دہادت چہ غیر شریر
چہ کانہوجی شہ کی چہ مناج شان — بہ یک دم شود فکر اخراج شان
چہ مدناجی پنڈت چہ مرزا خلیل — بیک دہار پیشاب گردد ذلیل

اس جذباتی رَو میں شاعر بہا چلا جاتا ہے اور کسی بھی سردار کو اورنگ زیب کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا۔ پھر بادشاہ کے چار ناخلف بیٹوں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے بغاوت کر کے مہم سر کرنے میں مشکلات پیدا کر دیں۔ ورنہ سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کی شان کب کی زیرِ زمین ہوتی ؎

اگر اتفاقِ جوانان شود — بیک لحمہ سِن مسانہ شود
ولیکن دو ناکس مخالف پسر — نمودند ابتر ہمم پدر
وگرنہ سکندر چہ ابوالحسن — کہ تا حال شان می شد اندر کفن

---

ے مراد سکندر عادل شاہ۔ عادل شاہی کا آخری فرمانروا۔ ٭ ے مراد ابوالحسن تاناشاہ قطب شاہی کا آخری فرمانروا۔

Marfat.com

آخر میں بڑی خوبی سے شہزادہ کام بخش کی مدح کرتا ہے جس نے اورنگ زیب سے غداری نہیں کی تھی ؎

مگر شاہ والا گہر کام بخش ۔۔۔ دداند جہاں در یں دشت رخش

بیک دم کند دور کیتی تمام ۔۔۔ بحق محمد علیہ السّلام

زہے شاہ والا گہر بے نظیر ۔۔۔ پسر چشم آفتاب سریر

زہے فضل و لطفِ خداوندگار ۔۔۔ کہ بر تو عطا کرد گوہر دو چار

وفاؤ بقاؤ عطاؤ حیا ۔۔۔ مروّت فتوت دیا ومیا

باین حسن و سیرت چو تو دلنواز ۔۔۔ ندیدیم دریں سیر گاہ مجاز

پھرا ہیں بہت سورت ودوار کا ۔۔۔ نہ دیکھا دیا ونت تجھ سار کا

بیا جعفر از مدح او لب بہ بند ۔۔۔ کہ سوزد دلِ حاسداں چو سپند

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر دوار کا اور سورت تک ہو آئے تھے اور اس شعر میں "تجھ سار کا" مراد تر سے جیسا دکنی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ میر جعفر کی سیلانی طبیعت انہیں دکن بھی لے گئی تھی۔

مثنوی، اورنگ زیب کے لشکر کی مدح پر اختتام پذیر ہو جاتی ہے ؎

زہے لشکرِ شاہی عالی تبار ۔۔۔ مددگار ہر لشکرِ شہریار

زہے لشکرِ شاہ گردوں قباب ۔۔۔ بہر فوج چوں پرتو آفتاب

زہے لشکرِ شاہ عالی نسب ۔۔۔ بہ تقویٰ وطاقت ہمہ منتجب

بہر سو کہ فتح و ظفر یاور است ۔۔۔ طفیل قدوم ہمیں لشکر است

الٰہی ازیں شاہ والا نثار ۔۔۔ نگاہِ بد چشم بد دور باد

مثنوی کی زبان کافی مفرّس ہے اور بعض مصرعے تو بالکل فارسی میں ہیں کہیں کہیں تو صرف ایک آدھ لفظ بدلنے سے سارا شعر فارسی کا ہو جاتا ہے۔

مثنوی میں فحش نگاری اور سوقیانہ الفاظ جذبات نگاری کے تحت راہ پا گئے ہیں جس سے تاریخ جیسا سنجیدہ مضمون گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہندی کے الفاظ بھی اشتقاقی

Marfat.com

انداز میں استعمال ہوئے ہیں جیسے

مثنوی: بلند نہ طلند نہ جنبد ز جا

بلند آہنگی اور زورِ کلام رزمیہ مثنویوں کی جان ہے جو اس مثنوی میں آغاز سے انجام تک برقرار رہتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے مثنوی کا پایہ بلند نہیں اس وقت کے تاریخی واقعات اور اشخاص پر ذرا بھی روشنی نہیں پڑتی۔ شاعر نے چند تاریخی کردار وہ مسلمان ہوں یا ہندو یا مرہٹہ سردار مثنوی میں صرف ان کے نام درج کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اورنگ زیب کے مقابلہ میں ان کی حیثیت اتنی ہے جتنی سورج کے مقابلے میں ذرّے کی ہوتی ہے۔

ان کے کلام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے "علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو" میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔[1]

"جعفر کی اکثر نظموں میں قافیہ کی پابندی نہیں ہے صرف ردیف پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ظرافت اگرچہ عموماً فحش گوئی تک پہنچ جاتی ہے لیکن ان کے کلام میں بے تکلفی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی اور اردو دونوں میں عبور رکھتے ہیں اور دونوں کو اس اسلوب سے سموتے ہیں کہ بعض اوقات جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ غرض کہ اس زمانہ کی زبان کا اندازہ جتنا ان کے کلام سے ہوتا ہے، اتنا کسی دوسرے کے کلام میں ملنا مشکل ہے۔"

---

[1] ہاشمی نورالحسن، علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو، جلد اول، ۱۹۶۲ء۔ ص ۵۰۱

Marfat.com

# کبیر

شاعر کا نام کیا تھا پتہ نہ چل سکا۔ تخلص کبیر تھا۔ کبیر کا ایک قلمی دیوان خط نستعلیق ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے شاعر کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ خاندانی حالات کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ حالاتِ زندگی اور وطن کے متعلق اس کی اپنی مثنوی سے جو کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ یہ کہ روہیل کھنڈ کے رہنے والے تھے۔ پیشہ طبابت تھا۔ شاہی نوکر ہونے کے ناتے غالباً نواب روہیل کھنڈ کی طرف سے انہیں کئی گاؤں جاگیر میں ملے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کبیر کے متعلق مثنوی کا سے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔ چند اشعار جو شاعر نے اپنے بارے میں لکھے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

جب پٹھانوں کا دور قائم تھا     تھا علاقہ وہاں ایک عالم تھا
الغرض میں بھی ان میں نوکر تھا     بلکہ نوکر نہ تھا میرا گھر تھا
کچھ طبابت کر اُن سے لاتا تھا     بیٹھ کر اپنے گھر میں کھاتا تھا
جب گئی ان سبھوں کی سرداری     سرد ہوئی میری گرم بازاری

دیوانِ کبیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ مثنویات کے غزل، مخمس، ہجو، قصیدہ اور مختلف موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ عنوانات اور تخلص سرخی میں ہیں۔ ایک ہجو کے مطالعہ سے ...... معلوم ہوتا ہے کہ کسی آشنا نے کبیر کی تین کتابیں چرائی تھیں، چند اشعار ان کے متعلق ملاحظہ ہوں ؎

کیا کی تھی میں تجھ ستی بُرائی     تھی مجھ سے تو تجھ سے آشنائی
ظالم تجھی شرم بھی نہ آئی     تین میری کتاب کیوں چرائی
میں بھی تو نہ تھا بخیل اپنا     گر یوں ہی تو مجھسی مانگ لیتا
کیا تجھکو کتاب میں نہ دیتا     تیں میری کتاب کیوں چرائی

مثنوی مذکورہ دیوان کے آخر میں ہے، جو صرف اٹھتر اشعار پر مشتمل ہے۔ ذاکر نعیم

Marfat.com

کی مرتبہ کتاب "شہر آشوب"[1] میں اس مثنوی کے بینتیس[35] اشعار دیئے ہوئے ہیں۔ اس مثنوی کے آخری شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے ؎

دیکھیں انجام کار کیا ہو کبیر　　یہ تو بارہویں صدی کی ہے جاگیر

شاعر مثنوی کے اجزائے ترکیبی کا پابند نہیں ہے۔ بغیر حمد و نعت یا منقبت کے کسی بادشاہ کی نواب کی مدح کے فلک کی کجروی کا ذکر کرتے ہوئے مثنوی کی ابتدا کرتا ہے ہر شخص گردش وقت کا غمّاز رہے ؎

ہے عجب چرخ سفلا کا احوال　　ایک ڈھیرہ پہ نہیں چلے ہے چال
آدمی اوس کے ہاتھ سے ہیں تنگ　　دن میں دکھلاتا ہے سو سو رنگ
دے ہے ایک آن میں شہنشاہی　　دم میں کرتا ہے شاہ درگاہی

حافظ خاں اور ضابطہ خاں روہیلہ کو پہلے فلک نے تاج و تخت جاہ و حشمت عطا کی اور پھر انہیں خوار و تباہ کر ڈالا۔ اس کے بعد مصنّف اجمالاً اپنا ذکر کرنے کے بعد آخری اشعار میں اپنے عہد کا سرسری نقشہ کھینچتا ہے کہ سرکاری اہلکار رشوت خور ہیں جنھیں حلوے مانڈے سے کام ہے۔ شاہوکار غریبوں کو اُدھار دے کر سود کے ذریعے ان کا خون چوس رہے ہیں۔ دنیا کی تکالیف ناقابل بیان ہیں۔ جاگیردار ہوں یا معمولی عوام سب زمانے کے ہاتھوں نالاں ہیں۔

مثنوی کی تاریخی اہمیت صرف اتنی ہے کہ اس میں دو تاریخی شخصیتوں ضابطہ خاں اور حافظ خان روہیلے کا ذکر آیا ہے جو روہیل کھنڈ کے نوابین میں سے تھے۔ حافظ خاں کا نام آتے ہی ہمارا ذہن نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے عہد کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں جو افسردگی اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ حالات روہیل کھنڈ میں نواب شجاع الدولہ اور حافظ خاں روہیلہ کی لڑائی ۱۷۷۴ء کے فوراً بعد کے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر نعیم احمد: "شہر آشوب" مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی طبع اوّل ۱۹۶۸ء ص ۸۷ — ۹۰

Marfat.com

مثنوی میں اس جنگ کا واقعہ نظم نہیں کیا گیا، بلکہ اس میں جنگ کے بعد جو نتائج رونما ہوئے ہیں اس کا پس منظر ملتا ہے۔ ابتدائی تیرہ اشعار میں اس مصیبت کو جو لڑائی کے بعد سارے روہیل کھنڈ پر آئی تھی کا شاعر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد پانچ چھ اشعار حافظ رحمت اللہ خاں روہیلہ اور ضابطہ خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ملک وجاہ وحشمت کے مالک تھے لیکن بعد میں اس کے سب یار و مددگار دھوکہ دے گئے، اور زمانے نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ملک حافظ[1] کو جب دیا سارا — پھر وہیں اس کو کھیت میں مارا
فتح اس پر جبھی وزیر[2] کو دی — اس بچارے کی جان ہی لے لی
ضابطہ خاں کو دی وہ حشمت جاہ — وہیں کر ڈالا ہے کے خوار و تباہ
چھوڑ سارے رفیق بھاگ گئے — اپنے اپنے ٹھکانے لاگ گئے
باقی جو غوث گڈھ میں ٹھہرے ہیں — ان پر ضبطی ہے اور پہرے ہیں

ان اشعار کے بعد چند اشعار اس وقت کے انتظام سلطنت کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ عوام زندگی سے بیزار ہیں، ان کا جینا دو بھر ہو رہا ہے، اس پر نواب شجاع الدولہ کے اہلکاروں کی رشوت ستانیاں ناقابلِ بیان ہیں۔ اہلکار جب لگان وصول کرنے آتے ہیں تو کیا کیا مصائب ڈھاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

کئی جاگیر کے تھے اپنے گاؤں — سو گئے گذرے جن کا ناؤں تھا نہ ٹھاؤں
جب ربیع یا خریف آتی ہے — ڈرستی جان سہمی جاتی ہے
صبح آوے گا قسط کا پیادہ — یہیں پکڑ کر کسی کو ٹانگے گا
اچھا کھانا اگر نہ پاوے گا — سینکڑوں دھمکیاں بتاوے گا

لگان کی قسط بر وقت ادا نہ ہو سکے تو اس کی وصولی کے لئے والیٔ اودھ کی پلٹن موجود ہے اس کے ہتھکنڈے ملاحظہ ہوں کس طرح سختی سے لگان وصول کرتے ہیں ؎

---

[1] حافظ سے مراد، حافظ خاں روہیلہ — [2] وزیر سے مراد، نواب شجاع الدولہ

Marfat.com

اس میں ہوگا جو قسط کا وقفا — اپنے حاکم کو لکھ (کر) بھیجے گا
سُننے کا جب یہ ماجرا بھڑوا — بھیج دے گا نجیبوں[1] کا پہرہ
پھر نجیبوں کی وہ جو شدّت ہے — قہر ہے ظلم ہے قیامت ہے
پوچھتے ہیں کسی کے دل کا سوز — یہاں محرّم ہے ان کے گھر نوروز
کھانے کے لئے پلاؤ کی ہے طلب — پینے کو شیر گاؤ کی ہے طلب
دن کے تئیں کھانے پینے کی خواہش — رات کو مطربوں کی فرمائش

اس کے بعد شاعر اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بناتا ہے اور ادبی خدمت کو مالی مصائب کا اصل سبب بتاتا ہے۔ کیونکہ شعر و شاعری کی لعنت نے اصل پیشے طبابت سے بھی دور کر دیا جس سے خاص و عام میں عزت کے ساتھ مالی فائدہ بھی پہنچتا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گئے اس مخمصے میں حکمت بھول — جس سے تھے خاص و عام میں مقبول
یہ ہمارے اوپر مثل ہے یارو — کیا ہی پھبتی ہے کان رکھ کے سنو
ایک کوّا چلا تھا ہنس کی چال — اپنی ہی کھو بیٹھا بیت المال

ساہوکار سے قرض لے کر فوری طور پر مشکلات سے دامن چھڑایا جا سکتا ہے، مگر اسے ادا کیسے کیا جائے گا۔ غور کیجئے ؎

ایک جو پیدا ہوا ہے ساہوکار — پانچسو کے مانگتا ہے ہزار
اس اذیت کا کچھ ٹھکانہ نہیں — اپنے گھر میں تو ایک آنہ نہیں
دیکھیں انجام کار کیا ہو کبیر — یہ تو بارہویں صدی کی ہے جاگیر

آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی بارہویں صدی ہجری میں لکھی گئی، مگر جن تاریخی شخصیتوں کا ذکر آیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی ۱۱۸۸ھ یا اس کے فوراً بعد لکھی گئی ہوگی، کیونکہ اسی سال نواب شجاع الدولہ

---

[1] مراد، اودھ کی پلٹن کا نام۔

Marfat.com

اور نواب حافظ رحمت خاں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔

اس مثنوی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس دور کے سماجی اور معاشی حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ حافظ رحمت خان اور روہیلوں کی معرکہ آرائیوں کے متعلق ہم عصر تاریخی کتب میں کافی مواد موجود ہے لیکن خوفناک جنگ کے نتیجہ میں پریشان حالی اور طوائف الملوکی کی دکھ بھری کہانی اس پُراثر انداز میں بہت کم بیان کی گئی ہے۔

ادبی لحاظ سے مثنوی کا پایہ بلند نہیں ہے۔ دوسرے درجے کی مثنویوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

# میر تقی میر

خدائے سخن میر تقی میر ۱۷۲۲ء ۱۱۳۴ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ دس سال کے تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ احباب کی بے مروتی اور معاشی پریشانیوں نے دہلی کا سفر کرنے پر مجبور کیا۔ زمانے کی ستم ظریفی نے یہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ سوتیلے ماموں خان آرزو نے میر کے ساتھ کچھ دنوں تک اچھا سلوک کیا جس کا اظہار میر نے نکات الشعراء میں کیا ہے۔ نکات الشعراء کی تصنیف کے بعد خان آرزو اور میر کے تعلقات میں کشیدگی بڑھتی گئی اور آخرکار میر کو خان آرزو کا دولت خانہ چھوڑنا پڑا۔ اس پرآشوب دور میں دہلی خانہ جنگیوں اور بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ تھا۔ میر نے اس پرآشوب ماحول کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ ایک فرد کی حیثیت سے انہیں بھی کارزارِ حیات کی ان تلخیوں کو برداشت کرنا پڑا۔ یہی وہ تجربات ہیں جنہوں نے میر کو زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا بلکہ میر نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا۔ درد و غم کے اس مجموعہ جس کو میر نے دیوان کہا ہے دراصل آپ بیتی ہے۔ آصف الدولہ والیٔ اودھ نے جب میر کو دہلی سے بلا بھیجا اس وقت ان کی عمر تقریباً پچپن ساٹھ سال کی تھی۔ اب میر زندگی کی تلخیوں کو گوارا کرتے ہوئے تھک گئے تھے۔ نواب کے دعوت نامے کو غنیمت سمجھ کر لکھنؤ آ گئے۔ اور ۱۸۱۰ء ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

میر نے غزلوں کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی مثنویوں کی تعداد سینتیس ۳۷ ہے جن کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند جین کی تصنیف "اردو مثنوی شمالی ہند میں"[۱] موجود ہے۔ اس طویل فہرست میں ہمارے موضوع سے متعلق دو مثنویاں "در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ" اور "جنگ نامہ" ہیں۔ پہلی مثنوی دیوانِ اوّل میں ہے۔ ہم اس کا مختصر ذکر میر حسن کی "مثنوی شادی" کے تنقیدی مطالعہ

---

[۱] جین ڈاکٹر گیان چند "اردو مثنوی شمالی ہند میں" انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ طبع اوّل۔ ص ۱۹۹-۲۰۲

کے وقت کریں گے، کیونکہ مثنوی شادی کا موضوع بھی نواب آصف الدولہ کی شادی کا واقعہ ہے۔ میر کی دوسری مثنوی "جنگ نامہ" میر کے دیوانِ چہارم میں موجود ہے۔ اس مثنوی کو سب سے پہلے عبدالباری آسی نے دریافت کیا ہے۔

**جنگ نامہ** میر تقی میر کی یہ مثنوی پچپن اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی میر کی دوسری مثنویوں کی طرح نہ حمد ہے نہ نعت نہ منقبت نہ کسی بادشاہ یا وزیر کی مدح ہے۔ بلکہ شاعر شروع ہی سے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ابتدائی دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب کے نواب رام پور آیا — ناگہاں اس طرف خدا لایا
آگے آتا تھا بہر سیر و شکار — بازی یکسر رد ہلی ہے اس بار

ان دو اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ سیر و شکار کی بجائے روہیلوں پر چڑھائی کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔

مثنوی کا سن تصنیف اس کے آخری دو اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال — لطف کی رُو سے کی ملک نے مقال
کا ے سخن گستر و جہاں اُستاد — فتح نواب سے کر اب دل شاد

۱۱۷۹
۳۰
۱۲۰۹

نواب آصف الدولہ اور روہیلوں کی اس جنگ کا پس منظر حسب ذیل ہے۔

۱۲۰۸ھ میں رام پور کے نواب سید فیض اللہ خاں کا انتقال ہوا اور اس کے بیٹے سید محمد علی خاں نے عنانِ حکومت سنبھالی، ان کی کثرت مے نوشی اور بدمزاجی نے فوجی افسروں کو بہت جلد ان کا مخالف بنا دیا۔ چنانچہ ایک ماہ بعد انہیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور چھوٹے بھائی غلام محمد خاں کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیا۔ مسئلہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ کسی سازش کے تحت بعد میں محمد علی خاں کو قتل کروا دیا۔ انگریز کمپنی کو یہ امر ناگوار گزرا۔ کیونکہ ریاست رام پور کے نواب کا تقرر انگریز کمپنی کی رضا مندی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گورنر جنرل نے روہیلوں کی سرکوبی کے لئے سر ابرٹ ابر کرامبی کو فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ نواب آصف الدولہ کو بھی اس لڑائی میں شریک ہونا تھا۔ یہ لڑائی ۱۲۰۹ھ میں روہیلوں کے خلاف انگریزوں اور

Marfat.com

آصف الدولہ کی اتحادی فوجوں نے لڑی ۔ مگر میرؔ نے فتح و کامرانی کے ساتھ نواب غلام محمد خان کی گرفتاری کا سہرا بھی نواب آصف الدولہ کے سر باندھا ہے جو تاریخی حقائق پر مبنی نہیں ۔ اس فتح میں انگریزوں کا ہاتھ تھا جن کی چالاکی سے نواب رام پور کی گرفتاری عمل میں آئی اور اسے جلا وطن کر کے مکہ بھیج دیا گیا ۔ سید احمد خان مسند نشین ہوئے اور نصیر اللہ خاں کو اُن کا نائب مقرر کیا گیا ۔

" مثنوی جنگ نامہ رزمیہ خصوصیات سے معرّیٰ ہے اس مثنوی میں مؤرخانہ ذمہ داری کو پوری طرح سے برتا نہیں گیا ہے ۔ اپنے محسن آصف الدولہ کے سر پر فتح کا سہرا باندھ کر نہ صرف طرف داری کا ثبوت دیا بلکہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ لڑائی کے وقت انگریزی فوج آگے تھی جس نے روہیلوں کو شکست دینے اور صلح کرنے پر مجبور کیا ۔ جب نواب آصف الدولہ کو فتح کی خبر ہوئی تو ان کی فوجیں بھی انگریزوں کے ساتھ جا ملیں ۔

میرؔ نے مثنوی میں یہ ظاہر کیا ہے کہ روہیلہ فوج جنگی طریقوں سے نا آشنا تھی ۔ اودھ کی فوجوں کے آگے کیا رک سکتی تھی ۔ میدان چھوڑ کر پہاڑی حصار میں پناہ لینے کے لئے بھاگ گئی اور جب نواب آصف الدولہ کی فوج نے پہاڑی حصار تک تعاقب کیا تو روہیلوں نے شکست تسلیم کر لی ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روہیلوں نے صلح اس لئے کی تھی کہ وہ موسم کی خرابی اور بیماری کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے ۔ ورنہ پہاڑی حصار میں وہ محفوظ تھے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

| | |
|---|---|
| لی پناہ اُن نے جا کہ زیرِ کوہ | واں بھی تھا ساتھ کوہ کوہ انبوہ |
| تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی | وہیں نا کہ یہ تھا یہ دنگل بھی |
| وہاں روہیلے ہوئے اکٹھے سب | بعد دو چار پنج روز شب |
| عجز کی راہ سے کیا پیغام | ہم ہیں نواب کے کمینے غلام |
| بندے رہتے ہیں با وجودِ خطا | تم سے صاحب امیدوار عطا |
| لطف کرے امیدواروں پر | رحم کرے گناہ گاروں پر |
| ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر | اب نہ خدمت سے ہوویں گے قاصر |

Marfat.com

کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم | موجب طوع وہ ہے دور سے حکم
که مجھے اپنے ہاتھ لے جاوے | پاؤں گنتے کے عاجز آ پاوے۔ کلیات میر ص ۶۵

روہیلوں کا یہ عاجزانہ پیغام ملنے کے بعد نواب نے ایک مصاحب کو روانہ کیا جو نواب غلام محمد خاں کو ان کے خزانے کے ساتھ لایا۔ لیکن نواب کے سامنے پیش ہونے کے بعد محمد خان احمقانہ حرکتیں کرنے لگا۔ ؎

لایا صاحب چنانچہ خود جا کر | پاس کرنا ہے تا نفر پا کر
سر میں اُس کے خیال باطل تھا | آپ بھی وہ جوان جاہل تھا
گفتگو میں کبھی لگا کرنے | ہوا موجود مارنے مرنے
چاہتا تھا کہ آپ کو مارے | بارے ہتھیار چھن گئے سارے
عاقبت اس کو باندھ کر بھیجا | کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا۔ کلیات میر۔ ص ۶۶

مگر حقیقت یہ ہے کہ غلام محمد خاں بے قصور تھا۔ انگریزی کمپنی نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی، اور نواب کو دھوکے سے بلا کر قید کر لیا۔ ساری دولت جو بطور امانت انگریزوں کے پاس تھی وہ سب کی سب آصف الدولہ کو مل گئی۔ اور آصف الدولہ ؎

لے کے اب ملک و مال سب نواب | راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب

مثنوی کی تاریخی حیثیت اتنی ہے کہ میر نے ایک جنگ کا واقعہ روداری میں بیان کیا ہے اور کسی بھی تاریخی حیثیت کی واضح طور پر تصویر کشی نہیں کی۔ رزمیہ مثنوی میں رزمیہ بیان اور بلند آہنگی لازمی عنصر ہیں مگر "مثنوی جنگ نامہ" میں ان دونوں خوبیوں کی کمی پائی جاتی ہے، بلکہ میر کی عشقیہ مثنویوں کی مجموعی خوبیاں بھی "جنگ نامہ" میں نہیں پائی جاتیں اس کی غالباً یہ وجہ ہے کہ میر کو فطرتاً بیانیہ شاعری سے کم لگاؤ تھا۔

**مثنوی در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر**

کلیات میر تقی میر مطبوعہ نول کشور ۱۹۰۷ء میں یہ مثنوی اس عنوان سے شائع ہوئی اور شاہ محمد سلطان نے "انتخاب مثنویات میر"[۱] میں اس مثنوی کو "شادی نامہ" کے عنوان

---

۱؎ شاہ محمد سلمان: انتخاب مثنویات میر مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۰ء ص ۸۲ – ۸۴

Marfat.com

سے شائع کی، بقول گیان چند جین[1] یہ مثنوی کدخدائی بشن سنگھ کی ترمیم شدہ شکل ہے جو ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں تصنیف ہوئی۔ عماد السعادت کے مصنف اور مورخ ڈاکٹر اے۔ ایل سری واستو کے حوالے سے "جین" صاحب لکھتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کی شادی تورانی سنّی وزیر انتظام الدولہ کی صاحب زادی اور محمد شاہ کے وزیر قمر الدین خاں کی پوتی شمس النساء بیگم سے ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں ہوئی۔ گو دلہن کے باپ دادا اس وقت انتقال کر چکے تھے پھر بھی تاریخی اور سیاسی اعتبار سے شادی کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ تورانی سنّی اور ایرانی شیعہ میں جو ایک عرصہ سے حریفانہ چشمک چلی آرہی تھی اس شادی سے ایک مضبوط رشتۂ اتحاد قائم ہو گیا مثنوی کی تاریخی اہمیت صرف اتنی ہے کہ ایک نواب کی شادی کا ذکر ہے۔ میر حسن نے غالباً آصف الدولہ کی اس شادی کے واقعہ پر "مثنوی شادی" لکھی ہے۔ جس کا اگلے چند صفحات پر ذکر کیا جائے گا۔

مثنوی کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں آصف الدولہ کی شادی کا ذکر ہے ؎

ہے جہاں کہیں تماشا گاہ — آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ
آؤ ساقی کہ کدخدائی ہے — طبع نواب ادھر آئی ہے
نئے سرے جواں ہوا ہے جہاں — عیش و عشرت کے محو خورد و کلاں
ہر طرف شہر میں ہے آرائش — رہرواں کی نہیں ہے گنجائش

آخری اشعار پر غور فرمایئے ؎

پھینکتے ہیں جو رستہ رستہ گل — رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل
ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے — شادی ایسی بھی اتفاقی ہے
ہو مبارک یہ جشنِ خوش انجام — دور گردوں بکام عیش مدام

تاریخی اعتبار سے مثنوی کا مرتبہ بلند نہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی میر کی طویل عشقیہ مثنویوں کے مقابلہ میں کمزور ہے۔

---

۱۔ جین ڈاکٹر گیان چند، اردو مثنوی شمالی ہند میں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ص ۲۴۸-۲۴۹

Marfat.com

# میر حسن

میر حسن غالباً ۱۱۴۰ھ[۱] میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی۔ ان کے کلیات میں دوسری اصناف کے علاوہ مثنویاں بھی ملتی ہیں جن کی تعداد "ڈاکٹر گیان چند جین نے، اردو مثنوی شمالی ہند میں' گیارہ بتائی ہے۔ ان کی ایک مثنوی "شادی" ہے جس کا موضوع آصف الدولہ کی شادی کا واقعہ ہے۔ اس مختصر مثنوی کی تاریخ تصنیف کے متعلق محمود فاروقی صاحب لکھتے ہیں:۔

"تاریخ تصنیف کا تعین ممکن نہیں ہے مگر داخلی وخارجی شہادتوں کی بنا پر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فیض آباد میں تصنیف ہوئی"[۲]

قاضی عبدالودود صاحب نے اس مثنوی کے متعلق معاصر ۱۹۵۱ء میں ایک مضمون بہ عنوان "ایک انگریز کا سرقہ" کے تحت تحریر کیا ہے:۔

"اڈورڈ ہنری پامر گزشتہ صدی کے مشہور مستشرقین میں تھے۔ اور اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں ان کی نظم، نثر موجود ہے...... پامر ہندوستان نہیں آئے لیکن ہندوستانیوں سے ان کے تعلقات تھے، اور اردو کے اخباروں میں ان کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ ۳ اپریل ۱۸۷۴ء کے اودھ اخبار میں ان کا ایک طویل مضمون ہے جس میں ڈیوک آف ادنبرا اور دختر زار روس کی شادی کا مفصل حال قلمبند کیا ہے۔ اس مضمون میں جا بجا اشعار بھی ہیں...... ایک جگہ شعر میں پامر کا نام بھی آیا ہے۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اشعار میں ایک کے سوا کوئی پامر کا نہیں ہے۔ باقی ماندہ اشعار میر حسن کی مثنوی کے ہیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں"

---

[۱] میر حسن کی ولادت از ڈاکٹر وحید قریشی ادب لطیف ستمبر ۱۹۵۶ء بحوالہ گیان چند جین "اردو مثنوی شمالی ہند میں"

[۲] میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء۔ طباعت اوّل۔ ص ۱۲۵

Marfat.com

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر حسن کی یہ مثنوی ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء سے بہت پہلے نہ صرف تصنیف ہو چکی تھی بلکہ شہرتِ عام بھی حاصل کر چکی تھی اور کسی نہ کسی طرح سے پامر تک پہنچی جس نے بعد میں چند الفاظ بدل دیے اور کچھ اشعار کی کمی کر کے اپنے نام سے ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء میں اودھ اخبار میں شائع کرا دی۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے سنہ تصنیف ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء لکھا ہے۔ صاحب تاریخ اودھ کے مطابق آصف الدولہ کی شادی ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے مثنوی کا سال تصنیف ۱۱۸۰ھ ہونا چاہیئے جو قرین قیاس ہے۔ یہ نواب آصف الدولہ کی پہلی شادی تھی۔ آصف الدولہ نے ایک شادی پر اکتفا کیا ہوتا تو مثنوی کے سال تصنیف کے تعین میں آسانی ہو جاتی۔ میر حسن آصف الدولہ کی شادی کے مختلف مناظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تب کہا اک شخص نے تو اس قدر — حال سے ہے کیا جہاں کے بے خبر
ہے وہ نواب اک شجاع الدولہ نام — دھاک سے لرزے ہے جس کی روم و شام[1]

دوسرے شعر کے پہلے مصرع سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی تکمیل کے زمانے میں نواب شجاع الدولہ زندہ تھے۔ اس کا انتقال ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔[2] میر حسن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی "شادی غمائیاں" ۱۱۸۰ھ یا اس کے آس پاس لکھی گئی ہو گی۔ اس کے آخری شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصنیف زر و جواہرات کی تمنا کی بجائے خلوص و محبت کے اظہار کے لئے لکھی گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایسی تہنیتی کاوشیں انہیں مخصوص موقعوں پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جن کی تحریک تخلیق کی بنیاد ہوتی ہے۔ میر حسن نے دوسری مثنویوں کی طرح حمد و نعت و منقبت اور اہل بیت کی تعریف کا طویل سلسلہ نہیں اپنایا۔ چند تمہیدی اشعار کے بعد شاعر اصل موضوع کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کی مراجعت کرنے کے لئے قصیدہ گو شاعر

---

[1] کلیات میر حسن قلمی، دہلی یونیورسٹی لائبریری ۔ [2] تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم ص ۲۴

Marfat.com

کی طرح گریز کا سہارا لیا گیا ہے، جس سے مثنوی کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں[1] ؎

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل — یعنی تھی میرے تئیں فکرِ غزل
یک بیک ہاتف نے دی آواز یوں — آج کے دن فکر میں بیٹھا ہے کیوں
گھر سے باہر ٹک[2] نکل اے بے خبر — چل ذرا قدرت خدا کی سیر کر
فکر و غم ہے آج تو سب سے بعید — شام میں ظاہر ہے یاں صبحِ اُمید
سن کے یہ مژدہ اُٹھا میں یک بیک — سیر کرتا جوں گیا بازار تک
دیکھا رستوں میں اک[3] انبوہ ہجوم — تب کہا میں نے یہ کیسی ہے دھوم

ماخوذ از معاصر ۱۹۵۱ء

میر حسن شادی کے جلوس کا نظارہ کرتے ہوئے دریا کی طرف مڑتے ہیں تو روشنی کا ٹھاٹ دکھائی دیتا ہے ؎

دیکھتا کیا ہوں کہ بے حد و قیاس — روشنی کا ٹھاٹھ ہے دریا کے پاس
لے زمیں سے آسماں تک ہے بلند — مہ سے روشن ہے چراغ اس کا دو چند
اس روش روشن تھا واں ہر اک چراغ — عرش پر جس کا لٹکتا تھا دماغ
تھا شعاعِ روشنی کا بس وفور — شام سے لے صبح تک تھا وقتِ نُور
اپنے اوپر[4] بستے تھے جوں جوں چراغ — تھا عدو کو داغ پر بالائے داغ
کیا بیاں اس کا کروں میں سر بسر — طوطیِ تقریر کے جلتے ہیں پر
روشنی اس طور[5] سے ہوتی ہے کہ — اک سرا جس کا ازل اور اک ابد
روشنی کچھ اک نہ تھی اس جا عیاں — اس میں آتش بازی کا بھی تھا سماں

---

حواشی م = مخطوطہ کتب خانہ مشرقیہ؛ مع = مخطوطہ کلیاتِ میر حسن پر معیار مارچ ۱۹۳۶ء کا شائع کردہ متن۔
پ = متن شائع کردہ پامر، د = کلیات میر حسن قلمی دہلی یونیورسٹی

[1] از مخطوطہ کتب خانہ مشرقیہ بحوالہ معاصر ۱۹۵۱ء از قاضی عبدالودود۔ ص ۶۱ تا ۶۶

[2] ٹک - پ، تک - م، مع / [3] اک = م، مع ابھی = پ / [4] اپنے اوپر بستے تھے، م، مع نیچے اوپر جلتے تھے، د / [5] طور سے: م، د = طول سے، پ

Marfat.com

روشنی کی تعریف کرنے کے بعد آتش بازی چھوٹنے کا سماں اس طرح دکھاتے ہیں ؎

اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور ... موج زن رہتی میں تھا دریا نور
کاسۂ مہتاب تھا اس کا حباب ... نور سے لبریز مثل آفتاب
ہاتھی[1] آتش بازیوں کے[2] چھٹتے جب ... نور کوہ طور تھا نظروں میں تب
مور[3] اس کے اس میں چھوٹے[4] اس نمط ... چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس[5] کو گھس جگہ کہیں ہیں وہ نہ تھا ... وجد میں آتش کا دل تھا برملا
پھلجھڑی ہتھ پھول گل ریز[6] انار ... کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار
یہ بھی گل اس واسطے درکار تھے ... اس میں بھی روشن ہوا یہ ہار تھے
تھیں[7] نہ روشن مورتوں کی ٹٹیاں ... مردم ناری تھے یہ جلوہ کناں
متصل[8] چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی ... نور کی بارش کی گویا تھی جھڑی
جس جگہ جاتی تھی واں حد نگاہ ... جوش گل ناری[9] سے پاتی تھی نہ راہ
دیکھ کر اس وقت یہ سوجھی دلیل ... ایسی ہی ہوئے گی گلزار خلیل

اس دھوم دھام کے بعد شاعر اصل واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیا کچھ کس تقریب کو منانے کی خاطر کیا جا رہا ہے ؎

دیکھ کر یہ دھوم اور[10] یہ عزوشاں ... میں نے پوچھا ایک سے کیا ہے یہاں[11]
کس کی یہ شادی ہے اور کس کی یہ فوج ... جوش مارے کس پہ دریا کی ہے موج
تب کہا اک شخص نے تو اس قدر ... حال سے ہے کیا جہاں کے بے خبر
ہے وہ نواب اک شجاع الدولہ[12] نام ... دھاک سے لرزے ہے جس کی روم و شام

---

[1] ہاتھی آتش بازیوں کے چھٹتے جب مع آتش بازی کے چھٹتے جب پ/ [3-4] یہ اشعار رپا مر کے یہاں نہیں ہیں بحوالہ معاصر ۱۹۵۱ء قاضی عبدالودود۔ ایک انگریز متشرق کا سرقہ [5] ۱ وم مع د، اور پ +
[6] ۷ یہ اشعار رپا مر کے یہاں نہیں ہیں بحوالہ ۱۹۵۱ء معاصر قاضی عبدالودود ایک انگریز متشرق کا سرقہ۔ [8] گلناری، م
مع، پ، د/ [9] گی، م، مع۔ [10] گا۔ پ۔/ [10] ۔م۔ مع دھوم دھام اور عزوشاں۔ پ/ [11] میاں۔ پ۔
۔ [12] ڈیوک آف اڈنبرا ہے جس کا نام۔ پ۔

Marfat.com

اس[۱] کے ہے فرزند اک عالی جناب — آصف الدولہ بہادر ہے خطاب

اس کی شادی ہے یہ اور اس کی برات — نیک طینت اور پاکیزہ صفات

عیش و عشرت کا سر اک جا ذکر ہے — آج فکر و غم کو اپنی فکر ہے

سن[۴] کے بولا یوں دعائیہ حسن — نت ہے روشن وہ شمع انجمن

آخری اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شعر[۵] کا بھی عرض طرفہ ہے یہ فن — تا ابد جس کا رہے روشن سخن

زر[۶] کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف — گر قبول افتد زہے عز و شرف

تاریخی مثنویوں کی جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے اور موضوعات کے تعین کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا اس لحاظ سے تو آصف الدولہ کی شادی کو تاریخی واقعہ کہنا کچھ مناسب معلوم نہیں ........ ہوتا۔ لیکن آصف الدولہ کی تاریخی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مثنوی شادی کو تاریخی مثنویوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

---

۱ تا ۳ یہ اشعار پامر کے یہاں نہیں ہیں۔ ۴ سن کے بولا یہ دعا کر پامر ؛ نت رکھ شمع سے پرنور گھر، پ

۵ ہے عرض طرفہ یہ فن۔ پ

Marfat.com

# عبرت و عشرت

مثنوی "پدماوت" کے مصنفین کے بارے میں تاریخ و تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ "پدماوت"[1] کے دیباچہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ضیاالدین نام عبرت تخلص تھا۔ نواب محمد خاں کے شاگرد تھے[2]۔ شاہ جہاں آباد آبائی وطن تھا۔ رام پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اپنے پیشے طبابت میں کمال حاصل تھا۔ عاقل خاں رازی کی فارسی مثنوی "شمع و پروانہ" کو ۱۲۱۱ھ میں اردو زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا مگر تکمیل سے پیشتر انتقال ہو گیا۔ ۱۲۱۱ھ میں سید غلام علی مشہدی عشرت مرزا علی لطف کے شاگرد نے ملا عبدالشکور بزمی کی فارسی مثنوی "پدماوت" کو اردو میں ترجمہ کیا۔ عبرت کی غیر مکمل مثنوی کو پورا کیا۔ عشرت نے اس مثنوی کو مکمل کرنے کے لئے ایسے ماہرانہ طریقے سے پیوندکاری کی ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ اگر درمیان میں ضمنی عنوان "یہاں سے انتہا نظم آرائی میر ضیاءالدین عبرت کی ہے اور ابتدا طبع آزمائی سید غلام عشرت کی" نہ ہوتا تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ عبرت نے کہاں قصے کو نامکمل چھوڑا اور عشرت نے کہاں سے شروع کیا۔

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام "شمع و پروانہ" ہے جس کی تصدیق عبرت کے درج ذیل شعر سے ہوتی ہے ؎

سو اُن کا میں نے لکھا کر قصہ تمام　　مدلل شمع و پروانہ رکھا نام

مثنوی دو اجزا میں ہے۔ پہلے جز میں پدمنی راجہ سراندیپ کی شہزادی اور راجہ رتن سین والی چتوڑہ کا ذکر ہے جو داستانوی انداز میں ہے۔ دوسرا جز نیم تاریخی ہے۔ راجہ رتن سین نے اپنا ایک مصاحب راگھو برہمن سے خفا ہو کر اُسے شہر بدر کر تا ہے۔

---

[1] عبرت و عشرت مطبوعہ بھارت الیکٹرک پریس سہارنپور۔ سید میر تقی حسن رضوی سہارنپور ص ۹۷۔ علاؤالدین کاتب بہ نی۔ [2] جین ڈاکٹر گیان چند "اردو مثنوی شمالی ہند میں" ص ۳۶۸

Marfat.com

رگھو برہمن راجہ رتن سین سے بدلہ لینے کی خاطر علاؤ الدین والی دلی کو چتوڑھ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علاؤ الدین کے ہاتھوں راجہ رتن سین گرفتار ہو کر دہلی لایا جاتا ہے اور بعد میں اُس کے ہمشیرزادے گورا بادل اُسے قید سے آزاد کراتے ہیں۔ راجہ دیوپال اور راجہ رتن سین کی لڑائی میں دیوپال راہیٔ ملک عدم ہوتا ہے مگر رتن سین بھی لڑائی کے زخموں کی تاب نہ لاکر بالآخر جان بحق ہوتا ہے۔ اور رانی پدمنی ستی ہو جاتی ہے۔ علاؤ الدین جب دوبارہ پدمنی کو حاصل کرنے کے لئے چتوڑ پر چڑھائی کرتا ہے۔ تو پدمنی کے ستی ہونے اور راجہ رتن سین کی وفات کی خبر پاکر مایوس لوٹ جاتا ہے۔ مگر ہم عصر مؤرخ ضیاء الدین برنی مولف "تاریخ فیروز شاہی" نے علاؤ الدین کو چتوڑ پر چڑھائی کرنے کی وجوہات اُس کی ملک گیری کی ہوس بتائی ہے۔

چتوڑ کے ایک کتبے سے جو اودھے پور کے آثار قدیمہ میں محفوظ ہے اس داستان کی گتھی کو سلجھانے میں بڑی مدد دی ہے۔ اس کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ گورا بادل ۱۴۸۸ء سمت ۱۵۴۵ میں غیاث الدین خلجی والی مالوہ جس کی راجدھانی مانڈو تھی کو شکست دی۔ اس عہد میں رانا سانگا کا لڑکا رتن سین چتوڑ کا حکمران تھا۔ "تاریخ فرشتہ" میں مذکور ہے کہ کئی مرتبہ والی چتوڑ اور غیاث الدین خلجی والی مالوہ کے مابین لڑائیاں ہوئیں۔ اور راجہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ غیاث الدین خلجی کو اپنے حرم میں حسین عورتیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ یعین ممکن ہے کہ غیاث الدین خلجی نے رانی پدمنی کی خوبصورتی کی داستان سن رکھی ہو اور اُس کو حاصل کرنے کی خواہش نے چتوڑ پر بار بار حملے کئے ہوں۔ خلجی کی رعایت سے بعد میں اس داستان میں غیاث الدین کی بجائے علاؤ الدین خلجی سے شعراء اور مؤرخین نے منسوب کر دیا ہو۔ راجہ رتن سین کے مقید ہونے کی اور چالاکی سے رہا ہونے کی داستان تخیلی رنگ آمیزی پر مبنی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مؤرخین کے نزدیک اختلاف رائے پر مبنی ہیں۔

مثنوی میں علاؤ الدین خلجی اور راجہ چتوڑ کی لڑائی کا منظر ملاحظہ ہو ؎

---

لہ احتشام حسین، افسانہ پدمنی، مطبوعہ محبوب المطابع دہلی، ص ۱۲۵

Marfat.com

جو ہو کر مستعد وہ بر سرِ جنگ | چلی آئی سپاہ برق آہنگ
ہوئے یہ بھی نکل کر تب صف آرا | دو جانب سے ہوا ہنگامہ برپا
نقیبوں کی صدائیں وحشت انگیز | وہ کڑکے دھاڑیوں کے اور خوں ریز
دو جانب کی صفیں جیوں ابر تاریک | خروشاں رعد ساں آئیں جو نزدیک
لگا چھٹنے ہر اک سو توپ خانہ | ہراساں جس کی آتش سے زمانہ
دھوئیں میں اس طرح اڑ جاتے تفنگ | کہ جیوں بادل میں مارے برق چشمک
نکلنا توپ سے گولی کا رخشاں | گھٹا میں جس طرح مہرِ درخشاں
بایں صورت غرض وہ جنگ کرتے | بہم زخمی ہو گرتے اور مرتے
ہوئے کفار کچھ گولوں سے فی النار | ہوئے کچھ آب نوش تیغ خونخوار
حصارِ شہر تھا وہ سنگ اور دھات | نہ پہنچے جس پہ کچھ صدمہ نہ آفات
ہر اس شہہ نہ فکر آب و دانہ | وہیں موجود اشیا ئے زمانہ
نہ ٹوٹی جب کہ وہ سدِ سکندر | ہوا لڑنے سے عاری شہہ کا لشکر

لڑائی کے اس منظر میں رزمیہ شان نہیں پیدا ہو سکی اس طرح دوسرے موقعہ پر جب دیوپال رتن سین پر چڑھائی کرتا ہے اور میدان جنگ میں فوجوں کی بجائے راجہ رتن سین اور دیوپال کی دوبدو لڑائی ہوتی ہے تو اس کا منظر پھیکا ہے۔ دو راجاؤں کی لڑائی اس طرح دکھائی گئی ہے کہ جس طرح دو معمولی سپاہی میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہوں۔

علاؤالدین خلجی اپنے ساتھ ایک جرار اور بے شمار فوج لئے چتوڑ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

لئے ہمراہ اپنے اس قدر فوج | کہے تو بحرِ بے پایاں کی ہے موج
ہزاروں فوج چینی اور زنگی | فرانسیسی و رومی اور فرنگی
سپاہ ہندو لاکھوں زابلی تھے | ہزاروں مکی اور کابلی تھے
غرض عربی و عجمی خیل در خیل | جدا ہر ایک کی ہر سمت کو دیل

عشرت نے علاؤالدین خلجی کی فوج میں چینی فرانسیسی فرنگی سپاہیوں کا ذکر کیا ہے۔

Marfat.com

جو تاریخی اعتبار سے غلط ہے اور مضحکہ خیز بھی ہے۔ علاؤ الدین کے عہد میں ہندوستان میں انگریزوں، فرانسیسی، اور چینی سپاہی کہاں سے آئے۔ چونکہ عشرت نے جس وقت مثنوی تصنیف کی اس وقت انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ہندوستان پر غلبہ تھا اس لئے غیر شعوری طور علاؤ الدین کی فوج میں ان کا ذکر کیا جو تاریخ کے موضوع سے انصاف نہ کرنے کے مترادف ہے۔ مثنوی میں ہندوستانی طرز معاشرت اور تہذیب کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ گو عشرت و عبرت نے اس مثنوی کو تصنیف کرتے وقت فارسی ماخذوں کو پیش نظر رکھا پھر بھی مثنوی کی زبان ...... زیادہ مفرس نہیں بلکہ اپنے عہد کے مطابق زبان میں روانی اور شیرینی پائی جاتی ہے شعریت کے اعتبار سے عبرت کا درجہ عشرت کے مقابلے میں قدرے بلند ہے۔

بقول گیان چند جین "غیر مشہور مثنویوں میں یہ اعلیٰ درجے کی نظم ہے"[1]

چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رقم جو ہے یہ مضمون شعلہ بنیاد ۔۔۔ میری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
نہ سرقہ ہے نہ کوئی مبتذل ہے ۔۔۔ توارد لیکن اس کا متحمل ہے
مگر مضمون عاقل خان رازی ۔۔۔ کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی
تمن کے طریق اس میں ہے داخل ۔۔۔ کہ میں اس کے مقولہ کا ہوں ناقل

---

[1] جین ڈاکٹر گیان چند "اردو مثنوی شمالی ہند میں" ص ۲۸۸

Marfat.com

# سعادت یار خاں رنگین

سعادت یار خاں نام، رنگین تخلص تھا۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں رنگین نے خود دیوان ریختہ کے دیباچہ میں اطلاع دی ہے کہ ۱۱۶۸ھ میں سرہند میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد طہماسپ بیگ خاں سے حاصل کی۔ شعر و شاعری کی طرف بچپن سے رجحان تھا پندرہ سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ۱۱۸۸ھ میں شاہ حاتم سے دہلی میں شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تیئیس سال کی عمر میں دیوانِ ریختہ مکمل ہوا۔ رنگین کو مختلف زبانیں سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سترہ زبانوں میں شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ۱۲۵۱ھ میں انتقال ہوا۔ کافی عرصہ تک شعر و شاعری کا دامن دُرِ آبدار سے بھرتے رہے۔ رنگین کی خوش قسمتی ہے کہ اُن کی سب تصنیف انڈیا آفس میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے رنگین کی صرف اُردو مثنویوں کی تعداد تینتالیس بتائی ہے۔ مثنویوں کی تعداد کا تعین ڈاکٹر صابر علی خاں کی تصنیف " سعادت یار خاں رنگین، تحسین سروری کی شش جہت اور ڈاکٹر بلوم ہارٹ کے تذکرے سے کیا گیا ہے۔ جن کی فہرست یہاں پیش کرنے سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ اس تعداد میں دوسری زبانوں کی مثنویاں شامل نہیں ہیں۔

رنگین کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف میں ہمارے موضوع سے متعلق صرف ایک مثنوی " جنگ نامہ رنگین " ہے۔ جو رنگین کے مجموعہ خمسۂ رنگین کے پہلے حصے پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں شاعر نے ۱۲۰۲ھ کے واقعہ پائن کی لڑائی کا ذکر کیا ہے۔

**جنگ نامہ رنگین**

مثنوی میں نواب اسمٰعیل خاں کی جواں مردی بہادری اور شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے رنگین کہتے ہیں کہ اُن کی شجاعت کے چرچے دُور دُور تک ہوتے تھے۔ ان کے سپاہی بہادر، آلات حرب و ضرب کے استعمال میں ماہر تھے۔

---

۱ ڈاکٹر صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین مطبوعہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۵۶ء ص ۲۵

۲ جین ڈاکٹر گیان چند "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" ص ۳۶۲ - ۳۶۵

۳ تحسین سروری، شش جہت رنگین۔ رسالہ اُردو شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء

Marfat.com

شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں شمالی ہند میں مرہٹوں کا سکہ چل رہا تھا۔ خود بادشاہ شاہ عالم ان کے دست نگر تھے، مگر نواب اسمٰعیل خاں نے ارادہ کر لیا تھا کہ مرہٹوں کے زور کو جس طرح بھی ممکن ہو ختم کیا جائے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار بادشاہ کے سامنے کیا۔ شاہ عالم نے اسمٰعیل خاں کو رائے دی کہ جب تک تمام امرائے سلطنت اور راجاؤں کی مدد نہیں ملے گی اس وقت مرہٹوں پر قابو پانا مشکل ہے۔ لہٰذا اس خیال کو عمل میں لانے سے پہلے ضروری ہے کہ نوابوں اور راجاؤں سے گفتگو کی جائے۔ نواب صاحب نے جب جے نگر کے راجہ کو بادشاہ کے مشورے سے آگاہ کیا تو اکثر راجہ متحد ہو کر مرہٹوں سے زور آزمائی کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اتحاد کی وجہ یہ تھی کہ مرہٹوں بڑھتی ہوئی طاقت سے خود راجاؤں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں، پاٹن کے نزدیک مرہٹی اور مغل فوجیں ایک دوسرے کے آگے صف آرا ہوئیں، گھمسان کی لڑائی ہوئی، طرفین کے بے شمار آدمی جان بحق ہوئے۔ مرہٹہ فوج مصلحتاً پیچھے ہٹنے لگی، جب تقریباً چار کوس پیچھے ہٹ چکی تو ایک دم سے نواب کی سرکردگی میں مغلیہ فوج کے پانچسو سرداروں کے دستے کو گھیر لیا۔ نکلنے کا راستہ کسی طرف سے بھی نہ تھا۔ مرہٹوں کی چالاکی سے مغلیہ فوج کے کیمپ میں خبر کر دی کہ نواب مارا جا چکا ہے۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو روپے لے کر ہمارے نوکر ہو سکتے ہیں۔ مغلیہ فوج نے اس خبر پر یقین کر لیا اور نواب کی واپسی کا انتظار کئے بغیر کیمپ چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ مرہٹہ فوج نے اس بھگدڑ سے بہت فائدہ اٹھایا اور بھاگتی فوج کو بھی جی بھر کر لوٹا۔ جب مشکل سے ساٹھ آدمی اور پانچ گھوڑے مرہٹوں کے گھیرے سے نکل کر کیمپ میں پہنچے تو اسے خالی پا کر حیران رہ گئے مغلیہ فوج کو اس لڑائی میں بہت جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ لٹی پٹی فوج جب جے پور پہنچی تو راجہ جے پور نے اسمٰعیل خاں کو دوبارہ لڑائی کرنے پر آمادہ کیا اور انہیں راجہ جودھپور کے پاس بھیجا کہ راٹھور کا راجہ بھی آپ کی مدد کرے گا۔ مگر جب اسمٰعیل خاں جودھپور پہنچا تو وہاں کا راجہ سرد مہری سے پیش آیا۔ نواب مایوسی کے عالم میں بھیلواڑے سے ہوتا ہوا گجرات پہنچا۔

Marfat.com

اس لڑائی میں رنگین بھی مغلیہ فوج کے شانہ بشانہ داد شجاعت دے چکا تھا، شکست کے بعد ملازمت چھوڑ کر بھرت پور چلے گئے، لیکن یہاں بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور کچھ دنوں بعد ڈھاکہ مرشد آباد کی سیر کرنے کے بعد گوالیار کے کھانڈو جی سندھیا کی ملازمت اختیار کر لی، یہاں پانچ چھ سال گزارے، جب اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تو ملازمت چھوڑ کر آزادانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

رنگین کی مثنوی "جنگ نامہ" کئی لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے، مگر افسوس ہے کہ پوری مثنوی شائع نہ ہوئی۔ ڈاکٹر صابر علی خان نے اس مثنوی کے صرف چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔ آخری دو اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی پانچسو اشعار پر مشتمل تھی۔ اور اس کو پچھتر سال کی عمر میں صرف پندرہ دنوں میں مکمل کیا۔ ؎

ہوا ہے پچھتر کے یہ سن میں تنظم — کیا ہے سے پندرہ دن میں نظم
ہوئے پانچسو شعر اس جا تمام — بس اب ختم کر لکھ کے تو والسّلام

حمد و نعت کے بعد رنگین لکھتے ہیں ؎

پس از حمد اور نعت رسول ﷺ — مری عرض یارو یہ کرنا قبول
کہ ہو جنگ نامہ جو یہ پڑھ کے شاد — کرو فاتحہ خیر سے مجھ کو یاد

اس کے بعد شاعر قاری کو یقین دلاتا ہے کہ پانی کی لڑائی کا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے ہوا، اُسے سچائی سے بیان کروں گا۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ شاعر نے اپنا فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جنگ کی ابتداء کا زمانہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

سن ہجری بارہ سو اور دو تھی یار — کہ ہریانے میں فوج تھی بیشمار
اسمٰعیل خاں مرد ہشیار تھا — وہ ہم سارے مغلوں کا سردار تھا

دوسرے شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سپاہی کی ہے اور اسمٰعیل خاں مغلیہ فوج کا سردار ہے۔ اس کے بعد اسمٰعیل خاں کی سخاوت و شجاعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اولوالعزمی اور بہادری کے ساتھ نواب سیاسی سوجھ بوجھ اور ملکی انتظامات میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ درج ذیل اقتباس سے اس زمانے کی ورزش کے

Marfat.com

طریقے اور فنونِ سپہ گری پر روشنی پڑتی ہے ؎

کوئی پھینک کر لکڑی بن کے اچل | اُٹھا سینہ چلتا تھا پنجوں کے بل
کوئی جھک کے کرتا تھا نالی کے ڈنڈ | کوئی لڑ کے کشتی ہوا تھا بھنڈ
ہلاتا تھا مگدر ہی کے کوئی ہاتھ | کوئی ڈنڈ کرتا تھا بیٹھک کے ساتھ
کلائی کا تھا زور کرتا کوئی | شلنگیں تھا میداں میں بھرتا کوئی
کوئی بانک کے کر کے پیچ | کہ سب ہیں بانک کے آگے ہیچ[1]
غرض سب کو ہر وقت ایک نوید | کہ شب قدر تھی رات اور دن تھا عید

سعادت یار خاں رنگین۔ ص ۲۳۹ - ۲۴۰

آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص خوش تھا، کسی کو کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ مثنوی میں بے موقعہ جذبات نگاری ناگوار گزرتی ہے مگر یہاں شاعر نے جزئیات نگاری سے اس وقت کے فنون سپہ گری اور دوسرے مشاغل کی تصویر پیش کر کے شاعرانہ کمال دکھایا ہے۔

اب لڑائی کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے پر بے دردانہ وار کر رہی ہیں اور بے سر کے دھڑ پڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ شاعر خود میدان میں لڑ رہا ہے۔ اس لئے اس واقعہ کو اس پس منظر میں دیکھئے۔ ؎

ہوئی جنگ کی صف جو آراستہ | تو نکلے جوانانِ نوخاستہ
قرولی[2] سواروں میں ہونے لگی | دلوں سے کدورت کو دھونے لگی
کوئی اپنی بندوق بھرنے لگا | کوئی ہاتھ بھالے کے کرنے لگا
حریفوں سے کہنے لگا یوں پکار | کہ تم میں سے جو دل جلا ہو سوار
یہاں آئے گر سیر جینے سے ہو | کہ یہ پار آنی اوس کے سینے سے ہو
میرے تیر کی چھوٹ یہ کیجئے دھیان | کہ گرتے ہیں اک تیر سے دو جوان

---

[1] ڈاکٹر صابر علی خاں، سعادت یار خاں رنگین۔ ص ۲۳۹ - ۲۴۰

[2] قرولی۔ بندوقچی، وہ فوج لڑائی کے واسطے جگہ مقرر کرنے کو آگے جائے سنتری سپاہی

Marfat.com

یہ کہتا چلا وہ کہ ایک دم میں جھٹ — ابھی دوں گا میں صف کی صف الٹ
میاں سے کوئی کھینچ تروار کو — جتا کر یہ کہتا تھا ہر یار کو
کہ اب تم سبھوں کو رجھاتا ہوں میں — ہنر آج اپنے دکھاتا ہوں میں
لگا کہنے یوں کوئی برچھے کو تول — کہ یارو ذرا دیکھنا آنکھیں کھول
کہ وہ مرہٹوں کا جو سردار ہے — یہ سینے کے وار اس کے یا پار ہے
وہ کٹ مرہٹوں کے جو آگے تھے سر — تو تودے پڑے تھے ادھر اور ادھر
ادھ چھلتے دھڑ اوس جا تھے بن سر کے یوں — کہ مچھلی تڑپتی ہے بن آب جوں — ایضاً ۲۴۰ ۲۴۱
ہزاروں کی آ لب پہ اٹکی ہے جاں — نہ ملتا تھا اک قطرہ پانی کا واں

بغیر سروں کے دھڑوں کے اچھلنے کو بن آب مچھلی کے تڑپنے سے کیا خوبصورت تشبیہہ دی ہے

تشبیہہ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو ؎

چنوں کی طرح لوگ جاتے تھے بھن — ہر ایک جل کے جاتا تھا سر کو دھن

حملے کا جواب جب بحیثیتِ مخالف سے ملتا ہے تو اس منظر کو بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

برستی تھیں اس طرح سے گولیاں — کہ جیسے برستے ہیں اولے گراں
نظر آتی رنجک[1] دھوئیں میں تھی یوں — چمک جاتے جگنو ہیں ساون میں جوں
وہ ہوتی تھیں یوں تو بیاں آتش فشاں — کہ جوں برق ہو گہہ عیاں گہہ نہاں — ایضاً
وہ گولے تھے چلتے تھے زنجیر کے — تو جاتے صفوں کو تھے چیر کے
بس انسان و حیوان درخت اور سنگ — قلم اون سے ہوتے تھے سب بے درنگ
ڈیا بائی جو اس پر چلا کچکچا — تو وہ کینو یک لخت اٹھا بلبلا

آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیا بائی فرانسیسی سپاہ سالار تھا۔ اس نے نواب کی فوج پر سخت حملہ کیا تھا۔ جواب میں نواب نے مرہٹوں پر تابڑ توڑ حملہ کر دیا اور مرہٹے پیچھے ہٹنے لگے مگر دراصل مرہٹوں کا پیچھے ہٹنا ایک چال تھی۔ پیچھے ہٹنے کے بعد ایک دم سے مغلیہ فوج کو گھیر لیا۔ نواب اور رنگین دونوں گھیرے میں آ گئے ؎

---

[1] بارود۔

Marfat.com

یکایک لیا اس طرح ہم کو گھیر — دبا صید کو جس طرح بیچے شیر
سواروں میں باہم لگی ہونے جنگ — ہوئی فوج نواب لڑنے سے تنگ — ایضاً ص ۲۴۲

سپاہی اِدھر اُدھر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگے مگر مرہٹوں نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا اور دوسری طرف چالاکی سے مغلیہ فوج کے کیمپوں میں مشہور کر دیا کہ نواب مارا جا چکا ہے مغلیہ فوج نے اس اطلاع پر یقین کر لیا، جب نواب کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو مرہٹوں سے روپے لے کر ان کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ؎

وہیں چھ مہینے کی تنخواہ دے — ڈبائی گیا اُن کو ساتھ اپنے لے

جب پانچسو کے رسالے میں سے بمشکل ساٹھ آدمی اور پانچ گھوڑے مرہٹوں کے گھیرے سے نکل کر اپنے کیمپوں میں پہنچے تو اس کو خالی پایا۔ یہ حالت دیکھ کر نواب کی مایوسی کا کچھ ٹھکانہ نہ رہا، اور دل شکستہ جے پور کی طرف رُخ کیا ؎

اُٹھا کر شب و روز دو دن الم — سب آ پہنچے گر پڑ کے جے پور ہم

جے پور کے راجہ نے نواب کی بڑی مدد کی اور حوصلہ افزائی کر کے یوں فرمایا ؎

کہ کھائی نہیں تم نے مطلق شکست — لڑانے کا پھر کیجئے بندوبست
دغا میں تمہاری سپاہ آ گئی — فریب ان کے میں آ کے گھبرا گئی

راجہ جے پور نے نواب کو راجہ جودھپور کے پاس اس اُمید پر بھیجا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ نواب راجہ جودھپور سے ملاقات کے لئے روانہ ہونے لگے تو رنگین نے نوکری چھوڑ کر بھرت پور کا رُخ کیا اور راجہ بھرت پور کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ لکھتے ہیں ؎

شفیق اپنا راجہ کو پہچان کر — بھرت پور نوکر ہوئے آن کر

یہاں تک رنگین نے لڑائی کے چشم دید حالات بیان کئے ہیں پھر سُنی سُنائی خبر دن کو نظم کا جامہ پہنا تا ہے کہ جب راجہ جودھپور نواب سے بے مروتی سے پیش آیا تو نواب نے بھیلواڑے کا عزم کیا ؎

کیا واں سے جو بھیلواڑے کا عزم — مقرر کیا کو لیواڑے کا عزم
اٹھا کر یہ سب رنج دن رات کے — یہ جا متصل پہنچے گجرات کے

اس کے بعد رنگین اپنے حالات بیان کرتا ہے کہ کس کس گھاٹ کا پانی پیا اور کہاں کہاں کی بادیہ پیمائی کی سے

غرض ہم بھرت پور میں تھے دو برس — نکالی ہر ایک اپنے دل کی ہوس
وہاں سے جو پھر دانا پانی اُٹھا — تو اُس جا سے میں لکھنؤ کو گیا
جب آخر گیا آصف الدولہ مر — وہاں سے پڑا مجھ کو کرنا سفر
گیا وہاں سے پھر مرشد آباد میں — رہا ہو کے یک چند وہاں شاد میں
غرض ڈھاکے بنگالے کو دیکھ یار — رہا چھ برس آن کر گوالیار
وہاں کھنڈو جی ایک سردار تھا — وہ سب مرہٹوں میں نمودار تھا
کیا مجھ کو نواب کنبو دیا — غرض مجھ کو مختار گھر کا کیا
زمانہ موافق ہوا ایسا آ — کہ جو میں نے چاہا وہی ہو گیا
غرض چھ برس تک یہ اوقات تھی — کہ بنتی ہی تھی مجھ سے جو بات تھی

یہاں پہنچ کر مثنوی ختم ہوتی نظر آتی ہے اور شاعر زمانے کی بے اتفاقی کا ذکر چھیڑتا ہے۔ مثنوی کا انجام حزنیہ ہے کیوں نہ ہو مصنف نے اپنی طویل عمر میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرتے دیکھا ہے۔ ملک میں خانہ جنگی بیرونی حملہ آوروں، مرہٹوں، جاٹوں اور پٹھانوں کی لوٹ مار سے عوام کو تڑپتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہی وجوہات تھیں جنہوں نے شاعر کو غم والم کا مجسمہ بنا دیا ہے۔ مثنوی میں جوش و ولولہ پایا جاتا ہے جو رزمیہ مثنویوں کی جان ہے۔ حالانکہ مثنوی اصل واقعہ کے رونما ہونے کے اکتالیس سال بعد نظم ہوئی۔ اگر مصنف اس واقعہ کو اُس وقت بیان کرتا تو اس کی رزمیہ شان اور دوبالا ہو جاتی۔

مثنوی کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جب خود غرضی کا دور دورہ تھا تو وفادار نواب ایسے تھے جن کی دلی خواہش یہ تھی کہ مرہٹوں کی طاقت ختم کر کے مغلیہ سلطنت کی گزشتہ شان و شوکت اور جاہ و جلال کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ مثنوی کا تاریخی مرتبہ بلند ہے اس میں جن اشخاص اور واقعات کا ذکر آیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں۔ شمالی ہند میں اس سے پہلے کوئی رزمیہ مثنوی نہیں لکھی گئی۔ ہاں دکن میں اس کا سلسلہ مُلّا نصرتی کی مثنوی "علی نامہ" سے ملایا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

# مول چند منشی

مول چند نام منشی تخلص تھا۔ ابوالنصر معین الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کے عہد کے شاعر تھے۔ نصیر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔ منشی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ اس کی مثنوی "شاہنامہ اُردو" کے ایک عنوان "سبب تالیفِ کتاب" کے مطالعہ سے مصنف کے تخلص اور شاہنامہ کے سنہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کا پتہ چلتا ہے۔ بارہویں بار دسمبر ۱۹۱۲ء میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ بولے کہ اے منشی اس نامہ کو — تم اب ریختی کی زباں میں لکھو

مرتب یہ شاہنامہ جب ہو گیا — کیا فکر تب سالِ تاریخ کا

تو پھر ہاتفِ غیب نے صبح دم — کہا قصۂ خسروانِ عجم

منشی نے اپنے عہد کی روش سے ہٹ کر عشقیہ اور داستانوی رنگ کی مثنویوں کی بجائے رزمیہ موضوع کو تختۂ مشق بنایا۔ شاہنامہ کا ایک قلمی نسخہ ہندوستانی میٹس کرپٹس انڈیا آفس میں موجود ہے۔ جس کا بلوم ہارٹ کے کیٹیلاگ میں ذکر ہے۔

**اُردو شاہنامہ**

مول چند منشی کے شاہنامہ کی ابتدا حمد، نعت و مناجات سے ہوتی ہے۔ جس کے ایک عنوان "سبب تالیف کتاب" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ منظوم فارسی شاہنامہ قصۂ خسروانِ عجم کو ایک شخص "توکل" نے اختصار کے ساتھ نثر میں بہت عمدہ ترجمہ کر کے "شمشیر خانی" نام رکھا، جس کا بعد میں مول چند منشی نے منظوم اختصار کے ساتھ ترجمہ کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ ہے شاہنامہ تماشا کتاب — عجب نظم دلکش ہے آب و تاب

وے ہر کسی کو میسّر نہیں — یہ تاریخ فرح نہیں ہر کہیں

---

بحوالہ:- جین ڈاکٹر گیان چند، اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔

Marfat.com

"توکل" کہ مردِ سخن سنج تھا ۔۔۔ کیا ترجمہ اُس نے شہنامہ کا
لکھا نثر میں نسخۂ مختصر ۔۔۔ کہ احوال معلوم ہو سر بسر
"یہ شمشیر خانی" وہ موسوم ہے ۔۔۔ تمام اس میں احوال مرقوم ہے
یہ بولے کہ اے منشی اس نامہ کو ۔۔۔ تم اب ریختی کی زباں میں لکھو
سُنا یہ سخن جب تو بصد طرب ۔۔۔ وہیں کر کے شمشیر خانی طلب
ہوا میں دل و جاں سے مصروفِ کار ۔۔۔ لکھی نظم دلکش و آب دار

ملک ایران کے بانی کیومرث شاہ کے فرزند سیامک نے اپنے والد کے ایک دیو دشمن کے ساتھ جنگ کی، شکست کھائی اور راہی ملکِ عدم ہوا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ہوا پہلے جو کوئی کشور کشا ۔۔۔ شہ دادگستر کیومرث شاہ
سدا کوہ میں تھا وہ مسکن گزیں ۔۔۔ بجز چرم پوشاک تھی کچھ نہیں
سیامک تھا اس شاہ کا اک پسر ۔۔۔ خردمند شبل پدر نامور
کیومرث کا دشمن اک دیو تھا ۔۔۔ ارادہ اُسے اس سے تھا جنگ کا
غرض بچہ اُس دیو کا ایک بار ۔۔۔ پدر سے لگا کہنے اے نامدار
یہ ہے عرض میری کہ جو حکم ہو ۔۔۔ تو جاؤں کیومرث کی جنگ کو
سنا اُس نے جب یہ بیانِ پسر ۔۔۔ تو دیووں کی فوج اس کے ہمراہ کر
سیامک نے جس دم سنی یہ خبر ۔۔۔ کیا عرض جا کر حضورِ پدر
کہ آپ کے حکم کا ہوں میں اُمیدوار ۔۔۔ جو ہو حکم جاؤں پئے کارزار
کیومرث نے اس کو رخصت کیا ۔۔۔ بہت اس کے ہمراہ لشکر کیا
جو وہ بادشہ زادہ جنگ جو ۔۔۔ ہوا بچۂ دیو کے رُوبرو
تو پھر ہاتھ سے بچۂ دیو کے ۔۔۔ نہ ہرگز ہوئی بس رہائی اُسے
سیامک ہوا رزم گہ میں ہلاک ۔۔۔ ملا جسم اس کا تہِ خون و خاک

فردوسی نے شاہنامہ تصنیف کر کے ایران کی تاریخ اور فسوانِ ایران کو زندہ جاوید بنا دیا مگر اس میں داستانوی انداز میں دیووں سے رزمیہ منظر نگاری کا تذکرہ کر کے

Marfat.com

تاریخ جیسے سنجیدہ موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

شاہ جمشید فرزند طہمورث کے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں جس سے اس عہد میں پارچہ بافی اور کاشتکاری کے رواج کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے۔

پسر تھا جو جمشید طہمورث کا — ہوا بعد اس کے وہ فرماں روا

فنِ پارچہ و کشتکار — کیا شاہِ جمشید نے آشکار

تنزد فرزد دیبا و ریشم کتاں — زرہ جوشن و تیغ و برگستواں

ہوا عہد میں اس کے پیدا یہ سب — ہوئے اس جہاں میں ہویدا یہ سب

مثنوی کے عنوان فارسی نثر میں ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہنامہ کی زبان بھی قدرے مفرس ہے۔

مثنوی میں تسلسل و بلا کی روانی شروع سے آخر تک موجود ہے مگر رزمیہ منظر نگاری کا قدرے فقدان ہے۔

Marfat.com

# امیر علی

امیر علی نام آمیر تخلص تھا۔ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ امیر کے سنہ ولادت اور وفات کا پتہ نہ چل سکا۔ سوائے گارساں وتاسی کے کسی تذکرہ نگار نے امیر علی کا ذکر نہیں کیا۔ غیر معروف شاعر تھے ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جو کچھ بھی معمولی معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ ان کی بیاض میں موجود ہیں جو سنٹرل لائبریری کلکتہ میں محفوظ ہے۔ امیر علی کے والد کا نام تاج الدین تھا۔ جس کا رشتہ محمد غوث گوالیاری سے ملتا ہے۔ امیر علی کی بیاض میں علاوہ جنگ نامہ بلدہ بھوپال کے متفرق اشعار، سلام، واقعات کربلا اور مرثیہ بھی ملتے ہیں۔ گوالیار میں آئے دن کی سیاسی دیگرگوں حالت نے امیر علی کو گوالیار چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ بھوپال میں اس وقت نواب حیات محمد خاں ابن دوست محمد خاں کا دور تھا۔ ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء میں امیر بھوپال پہنچے جب ۱۸۱۲ء میں مرہٹوں نے بھوپال پر حملہ کیا اس وقت نواب وزیر محمد کا عہد تھا۔ امیر علی نے اپنی مثنوی میں جنگ نامہ بھوپال کے چشم دید حالات واقعہ سے تقریباً تیرہ سال بعد ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء میں نظم کئے ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق امیر علی کی صرف یہی مثنوی ہے۔

## جنگ نامہ بلدہ بھوپال

آمیر علی گوالیاری نے یہ مثنوی ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء میں تصنیف کی جس کی ابتدا حمد، نعت سے ہوتی ہے اس مثنوی میں امیر نے سندھیا اور ہولکر کی اتحادی فوجوں کے بھوپال پر حملہ کے چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔ ابتدا میں نواب وزیر محمد اتحادی فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکا شکست کھا کر بھوپال میں پناہ لی اتحادی فوجوں نے تعاقب کیا اور بھوپال کا محاصرہ کرلیا جو تقریباً نو ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران خوراک کی بے حد کمی واقع ہوئی عوام اور نواب بھوپال کی فوجیں بھی بھوک سے پریشان ہوگئیں۔ مگر نواب بھوپال نے جان کی بازی لگادی۔ بھوپال کی عورتوں نے بھی اس لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بالآخر مرہٹوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

لڑائی کے دنوں میں خوردنی چیزوں کی قلت ہوگئی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پیسہ ہوتے

Marfat.com

ہوئے بھی کھانے کی چیزیں دستیاب نہیں تھیں۔ عوام نے اپنے سردار کے پاس جاکر غلّہ کی فراہمی کی دہائی دی۔ عوام اتنے لڑائی سے سہمے ہوئے نہیں تھے جتنے بھوک سے پریشان تھے۔ یہ منظر ملاحظہ کیجئے ؎

گرانی شہر میں غلّہ کی آئی ۔۔۔ بہت دن ہوگئے کٹھرتی[1] نہ پائی

پھریں نمریا بھٹکتے شہر اندر ۔۔۔ لئے پیسہ پھریں غلّہ کو گھر گھر

سنو قسمت کا ان کے کیا ٹھکانہ ۔۔۔ میسّر اک نہیں ہوتا ہے دانہ

تو پھر سردار سے کہنے لگے زود ۔۔۔ کرے دل کو ہمارے آج خوشنود

کوئی بولا ہمیں گزرے ہیں سہ روز ۔۔۔ ملا جب سے نہیں دانہ فقط سوز

غرض سن کر کیا کوٹھے[2] کو خالی ۔۔۔ کہا اس شہر کا اب حق ہے والی

خدا وقت ایسا پھر ہرگز نہ لاوے ۔۔۔ کہ مادر دیکھے اور فرزند کھاوے

رہی دو ماہ تک ہوتی لڑائی ۔۔۔ سوا حق کے مدد کوئی نہ آئی

یہ کہتے جنگ کا ہم کو نہ ڈر ہے ۔۔۔ مگر اک بھوک کا ہم پر اثر ہے

رئیس بھوپال غوث محمد کی دختر قدسیہ بیگم[3] نے جو نواب نظر محمد پسر وزیر محمد کی بیگم تھی کا بیان غور فرمائیے :۔

"ہماری والدہ زینت بیگم ہمارے حصّہ کا کھانا سپاہیوں میں تقسیم کردیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کو اطلاع ملی کہ ایک دستہ پیٹ پر پتھر باندھ کر دشمن کا مقابلہ کررہا ہے تو اسی وقت کھانا فراہم کرکے اور خود برقعہ پہن کر، موقع پر پہنچ گئیں اور اور کھانا تقسیم کیا[4] ـــــ تاریخ بیگمات ۔ ص ۳۲

دوسری جگہ فرماتی ہیں :۔

"اس محاصرہ کے دوران میں نواب مقر محمد خاں ابن غوث محمد خاں کو

---

[1] راشن۔ [2] غلّہ کا گودام۔ [3] نواب زینت بیگم غوث محمد خاں کی بیگم تھیں۔

[4] بحوالہ رضوی سلیم حامد۔ اردو ادب کی تاریخ میں بھوپال کا حصّہ علوی پریس بھوپال پریس ایشیا پریس ۱۹۶۵ء ص ۳۱ ـ ۳۲

Marfat.com

جو ایک محافظ دستہ کے کمانڈر بھی تھے دو روٹیوں سے زیادہ نہیں ملی تھیں۔ بلکہ بعض مرتبہ تو فاقہ پر گزرتی تھی۔ یہ تھا شاہی محل کا حال[1] ——— تاریخ بیگمات میں ایک جگہ بھوپال شہر اور دوسری جگہ بھوپال کے تال کی مختصر تعریف کی۔ کیا اچھا ہوتا اگر شہر کی تعریف مصنف نے تفصیل سے کی ہوتی ؎

ہزاروں بستیاں آئیں نظر میں — سوا اس کے نہ کوئی اس دہر میں
عجب حکمت سے ہے اس کو بنایا — نظر میں آج تک ایسا نہ آیا

مندرجہ ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی میں نظمائے گئے واقعات مصنف کے چشم دید ہیں

بمر تک ماجرا ایسا نہ شنوید — قسم اللہ من از چشم خود دید

مگر مثنوی میں نظمائے گئے چشم دید جنگی مناظر میں وہ شان پیدا نہ ہو سکی جو ایک رزمیہ نظم میں ہونی چاہیئے۔ مثنوی میں نہ کہیں شوکتِ الفاظ کا استعمال ہوا ہے نہ بلند آہنگی پائی جاتی ہے، جو رزمیہ مثنویوں کے لازمی عنصر ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی واقعہ جنگ سے تقریباً تیرہ سال بعد تصنیف ہوئی۔

چونکہ مثنوی جنگ کے زمانے میں نہیں لکھی گئی تھی اس لئے مصنف کو جنگ کے واقعات نظم کرنے کی بجائے جنگ کے رو رواں نواب وزیر محمد (الدولہ) سے زیادہ دلچسپی ہے۔ چند اشعار وزیر الدولہ کی تعریف میں ملاحظہ ہوں ؎

ہوئے اس شہر میں دیواں بسیار — کیا سب ہی نے عدل اپنے کو اظہار
وہاں پشتوں سے ہے یہ حال جاری — رہے دو دست دیواں دستکاری
عدل ملک و خزانہ اور افواج — بجز دیواں نہو دیگر کے سرتاج
وزیر الدولہ اسم اس کا تھا مشہور — کہ چوں دستور بھا از شاہ تیمور
کہ بعد از پدر کے بست و دو سال — ہوا مسند نشیں در شہر بھوپال
شکل، صورت میں خوب تھا میں بالا — وزیر الدولہ ہوا دلوں سے عالا

---

[1] بحوالہ مثنوی سلیم حامد، اردو ادب کی تاریخ میں بھوپال کا حصہ، علی کلاسیکی بھوپال پریس اختیار پبلیکیشنز ۱۹۶۹ء ص ۳۱-۳۲

بریدہ دم کا اک رکھتا تھا تازی | کئے دشمن ہزاروں اس نے ماضی
وہ گھوڑا جب تلک اس کے رہا پاس | نہ آیا کچھ غم دنیا کا وسواس
ہوا جب اسپ وہ دنیا سے فانی | ہوئی اس کے اوپر غم کی نشانی
کہ بعد از اسپ کے دوازدہ سال | پڑا اچھو یاں پر اک چرخ بھونچال

مثنوی کا درجہ زبان وفن کے لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ مثنوی میں جا بجا قوافی اور عروض کی نمایاں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے بھی مثنوی کمزور ہے۔ مصرعوں کی بندش بھی چست نہیں کہیں مبتدا ہے تو خبر نہیں کہیں فاعل ہے تو فعل ندارد۔ علاوہ ازیں مثنوی میں محاورہ روزمرہ کا استعمال بھی غلط ہے۔ متروکات وفارسی الفاظ کے غلط استعمال سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کا مرتبہ اپنے ہم عصر شعراء سے پست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ہم عصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

تشبیہہ و استعارہ کی ندرت ملاحظہ ہو، جب حملہ کی خبر ملی تو فرماتے ہیں ؎

ہوا خاموش عاقل مرد سُن کر | چڑھا اک بُرج پر جوں ماہِ انور
لگے ہتھیار چلنے اس قدر سے | ابر سے جس طرح باراں برسے

بعض جگہ بے ساختگی کے ساتھ طویل مضمون کو ایسی خوش اسلوبی سے قلمبند کیا ہے، جانو دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ؎

غرض سُن کر کیا کھوٹے کو خالی | کہا اس شہر کا اب حق ہے والی
خداوقت ایسا پھر ہرگز نہ لاوے | کہ مادر دیکھیے اور فرزند کھاوے

المختصر جہاں مثنوی زبان وفن کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اور تیسرے درجے کی ہے، وہاں تاریخی اعتبار سے سچے واقعات پر بھی مبنی ہے۔

Marfat.com

# شاہ امیر الدّین علی

شاہ امیر الدین علی ضلع گونڈہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ جب جوان ہوئے تو مولانا عبدالرحمٰن صوفی کے حلقہ "مدرس" سے وابسطہ رہے۔ شاہ امیر الدین علی نے علم معقول و منقول کے علاوہ علم باطنی پر بھی عبور حاصل کیا۔ درس و تدریس کے کاموں میں لگ گئے۔ سنہ ولادت کا پتہ نہ چل سکا۔ ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ میں انتقال ہوا۔ قصبہ چنہٹ کے تالاب میں دفن ہوگئے۔ شاہ امیر الدین علی کی ایک منظوم تاریخی درخواست موسوم بہ "اطلاع نامہ" کا پتہ چلتا ہے جو ۱۲۷۱ھ میں تصنیف ہوا۔ جو ہنومان گڑھی کے ہندوؤں کے مظالم سے متاثر ہو کر واجد علی شاہ اختر کی خدمت میں بھیجا گیا۔

**اطلاع نامہ** شاہ امیر الدین علی کی منظوم درخواست مثنوی کے انداز میں ان کے ایک فارسی مخطوطہ میں چھپن اشعار پر بخط نستعلیق چار صفحات پر مشتمل ہے۔ جامع مسجد لائبریری بمبئی میں موجود ہے۔ اس منظوم اطلاع نامے کا پس منظر مولانا انتظام اللہ شہابی کی تصنیف "علمائے حق اور اُن کی مظلومیت کی داستانیں" میں بھی ملتا ہے یہ منظوم درخواست شاہ امیر الدین علی نے واجد علی شاہ اختر کو لکھی تھی۔

اجودھیا میں ایک ٹیلہ جو ہنومان بیٹھک کے نام سے مشہور تھا' اس پر شہنشاہ اورنگ زیب نے ایک مسجد بنوائی تھی۔ ہندوؤں کو اس کا بہت ملال تھا۔ برہان الملک کے عہد میں بیراگیوں نے اس مسجد کو گرا کر دوبارہ مندر بنادیا۔ بعد میں حکومت نے مسلم عوام کی شورش پر اس پر از سر نو مسجد کھڑی کردی۔

واجد علی شاہ کے عہد میں راجہ درشن سنگھ نے اس مسجد کو پھر توڑ کر ہنومان گڑھی نئے سرے سے بنوادیا۔ علاوہ اس کے ایک جگہ جو سیتا جی کی رسوئی کے نام سے مشہور تھی وہاں پر بھی ایک مندر بنوادیا اس وجہ سے ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۷۱ھ میں اجودھیا میں مسلمانوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ بیراگی اور مسلمانوں میں خوب جم کر لڑائی ہوئی۔ دونوں فریقوں کے کافی آدمی مارے گئے۔

Marfat.com

مولوی امیر الدین علی شاہ نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر بیراگیوں کو سزا دینے کی خاطر فتویٰ جہاد جاری کر دیا جب واجد علی شاہ کو اس کی خبر ملی تو فیصلہ کرنے کے لئے اس نے پنچ مقرر کئے۔ جنہوں نے مہنتوں کو طلب کیا مگر ہنومان گڑھی کا کوئی مہنت نہ آیا۔ نواب واجد علی شاہ اختر نہیں چاہتے تھے کہ خون خرابہ ہو جھگڑے کی بنیاد کی تحقیقات کرنے کے لئے نواب نصرت جنگ راجہ مان سنگھ، قاسم جنگ، تہور علی خاں رسالدار فیض آباد مقرر ہوئے۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیق شدہ رپورٹ پیش کی کہ کبھی مسجد وہاں بنی ہی نہ تھی، اس رپورٹ کا واجد علی شاہ نے اعلان کر دیا۔ اس تحقیقی رپورٹ کے اعلان سے نالاں ہوکر امیر الدین علی نے منظوم درخواست لکھی تھی۔ اس درخواست یا اطلاع نامہ کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سپاس حمد بہ درگاہِ خالق کونین — سلام حضرت باری بہ سید الثقلین
درود حضرت حق رسول عالی جاہ — بہ آل اطہر اصحاب آں رسول اللہ
یہ اشتہار جہاد آج کر دیا ارقام — بہ اطلاع تمام امم رسولِ کرام
امید ہے کہ شہنشاہ قبلۂ عالم — ابو المظفر منصور و خسرو اعظم
زبانِ فیض مبارک سے یوں کرار شاد — کہ کافرانِ اودھ پر شتاب ہوئے جہاد

اور آخری اشعار یوں ہیں ؎

اہالیان خلافت پناہ قیصر جاہ — کریں گے منصفی معذرت سے اس پہ نگاہ
بہ پاس دین رسالت پناہ نسل علی — کہ فرض عین ہے مقہور گردنِ اعدا
روانہ ہووے گا شنبہ کو لشکرِ اسلام — برائے غارت و تاراج شہر بچھمن ولام

جب واجد علی شاہ اختر کو ''اطلاع نامہ'' ملا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا جس سے ناراض ہو کر ۲۰ صفر ۱۲۷۲ھ میں امیر الدین علی اپنے مریدوں کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ دوسری جانب واجد علی شاہ نے بارلو کی سرکردگی میں چار کمپنی فوج روانہ کی صرف ایک گھنٹے کے تصادم میں چھ سو پچیس ۶۲۵ اشخاص جاں بحق ہوئے۔ شاہ صاحب بھی اس حادثہ میں کام آئے۔

اطلاع نامہ کی زبان مغرس ہے۔ کلام میں زور اور جوش بھی پایا جاتا ہے۔ ایک تاریخی حادثہ کے پیش نظر جس نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا کر رکھ دیا جس کے نتیجہ میں طرفین کی بے شمار بے گناہ جانیں پیوند خاک ہوتی رہیں۔

Marfat.com

# سہیل

نام سید حیدر حسین خاں رضوی۔ لقب اسلام خانی تخلص سہیل تھا بڑی طویل عمر پائی تھی، ساری عمر علمی ادبی خدمت میں گزاری۔ محمود علی خاں ان کے دادا تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد کے جاگیر دار برہان علی خاں سہیل کے والد بزرگوار کے نانا تھے۔ سنِ ولادت و وفات کا پتہ نہ لگ سکا۔ وطن دہلی تھا۔ محمد عبداللہ چغتائی نے تاریخ منظوم سلاطینِ بہمنہ" کے مقدمے میں سہیل کو بیرار کا شاعر لکھا ہے جو بے بنیاد ہے۔ سہیل کی تصانیف کا موضوع تاریخ رہا ہے۔ "تاریخ ہندوستان منظوم" "تاریخ سلاطین بہمنہ منظوم" "سہیل دکن" ان تین مثنویوں کے علاوہ کچھ غزلیں اور قصید سے دستیاب ہوئے ہیں۔ سہیل کے متعلق کسی تذکرہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی۔ یہ ان کی سیلانی طبیعت کی بدولت ہے۔ اگر ایک جگہ سکونت پذیر رہتے تو یقیناً شمالی و جنوبی ہند کے کسی نہ کسی تذکرہ نویس نے ان کا ذکر کیا ہوتا۔ عہدِ پیری میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سہیل کا نام خاندانی حالات اور وطن کے بارے میں جو کچھ مختصر معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ اُن کی اپنی منظوم تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ "تاریخ ہندوستان منظوم" کے "عنوان" بیان حالات خاندانی، مؤلفِ مثنوی" کے تحت فرماتے ہیں ؎

| | |
|---|---|
| مؤلف بھی کچھ اپنا لکھتا ہے حال | کہ ہستی میں ہے مثل وہم و خیال |
| وہ گمنام دہلی ہے جس کا وطن | دعاگوی سرکار سرو عملن |
| معزز جو تھے خاندانی امیر | شریف و نجیب و صغیر و امیر |
| نہ باقی رہے ان کے نام و نشان | نہیں آج دہلی میں وہ خاندان |
| کروں حال اہل سلف کا بیاں | ہیں مشہور و معروف یہ خانداں |
| توسل جو شاہانِ دہلی سے تھا | تو جاگیریں ہر جا یہ کی تھیں عطا |
| بخدمت عمدہ رہے سرفراز | امیران نامی میں با امتیاز |
| امیر معظم جلادت شعار | تھے برہاں علی خاں عالی وقار |
| جو تھے اکبر ثانی دہلی کے شاہ | زمانے تک اون کے تھے باعز و جاہ |

Marfat.com

وہ ذی مرتبہ گو آج نابود ہیں ۔۔۔ مکاں اون کے تاحال موجود ہیں
کرے مغفرت اُن کے بار آلہ ۔۔۔ نواسہ تھے اُن کے میرے قبلہ گاہ
حقیقی مرے جد سیادتمآب ۔۔۔ کہ محمود علی خاں ہے جن کا خطاب
باولاد والقاب اسلام خاں ۔۔۔ نویں پشت مجھ تک ہوئی بیگماں

"تاریخ منظوم سلاطین بہمنہ" میں بیاں معراج کے خاتمہ پر کچھ اپنے متعلق یوں بیان کرتے ہیں ؎

جوانی کا آتا ہے جس دم خیال ۔۔۔ تو ہوتا ہے بس دل میں جوش ملال
گئی عمر مانندِ آب رواں ۔۔۔ ہوا باغ تن پائمالِ خزاں
کہاں وہ طبیعت کا جوش و خروش ۔۔۔ قریب ہے کہ ہو شمع ہستی خموش
ہوا سر سے کافور پیری عیاں ۔۔۔ مگر رہ گیا میں پس کارواں
بہت دیکھے دورِ سنین و شہور ۔۔۔ گئے ملک در ملک ہم دور دور
زمانے کے دیکھے فراز و نشیب ۔۔۔ یہاں تک کہ اب آگیا وقت شیب
نہیں کوئی کبھی اب ہمارا وطن ۔۔۔ مگر دور گرد دوں ہے اپنا وطن
کوئی علم سے بڑھ کے دولت نہیں ۔۔۔ کسی فن میں یہ جاہ و عزت نہیں
ہوا ہوں جو سب سے کنارہ گزیں ۔۔۔ تو علم سخن ہے میرا ہم نشیں
ہوا جب سے میرا کہ سن تمیز ۔۔۔ کتابوں کی ہے سیر دل کو عزیز

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر سیلانی طبیعت کا مالک ہے جو دیار غیر میں رہ کر اپنے وطن کی یاد میں مغموم ہے، جس کا کوئی یار و غمخوار نہیں، اس کی زندگی کا واحد مقصد کتابیں پڑھنا اور علم و ادب کی خدمت کرنا ہے، علم و ادب کی کتابوں کو اپنا جلیس ہم نشیں سمجھتا ہے۔

## تاریخ منظوم سلاطین بہمنہ

محمد عبداللہ چغتائی کے مقدمہ[1] تاریخ بہمنی کے مطالعہ سے اس مثنوی کے صرف دو نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] چغتائی محمد عبداللہ، مقدمہ تاریخ منظوم سلاطین بہمنہ، از سہیل مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند۔ سنہ ۱۹۲۱ء

Marfat.com

انجمن ترقی اردو ہند نے دکن کالج پوسٹ گریجویٹ ریسرچ پونہ کے نسخے کو حاصل کرکے ۱۹۶۱ء میں اس مثنوی کو شائع کیا۔ اس کا ایک نامکمل نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بھی ہے جس کے متعلق پروفیسر عبدالقادر[1] سروری کی رائے ہے کہ یہ اصل مسودہ مصنف کا ہے۔ راقم الحروف کو رضا لائبریری رامپور میں بھی ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا۔ جس میں دو مثنویاں ہیں۔ ایک "تاریخ سلاطین بہمنہ" اور دوسری "سہیل دکن"

سہیل نے تاریخ دکن امجدیہ مصنفہ ابو الفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ سید امجد حسین کی فارسی تاریخ کے ایک باب "در بیانِ سلطنت شاہانِ بہمنیہ" کا اردو مثنوی میں ترجمہ کیا ہے جس کی صراحت شاعر نے درج ذیل اشعار میں کردی ہے ؎

سلاطین گزرے ہیں جو بہمنی — ہے تقویم پارینہ یہ اے غنی
ہے تاریخ مطبوع جو اک احمدی — وہ ہے نثر میں اور ہے فارسی
کیا نظم اردو میں اس کو تمام — کہ ہوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

ان اشعار کے علاوہ "طلب نمودن بادشاہ محمد منجم و صدر الشریف را بعد از جلوس" اور "ذکر جلوس محمود شاہ بہمنی بن محمد شاہ بہمنی" کے ضمنی عنوانات کے تحت لکھے گئے درج ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سہیل کے پیش نظر تاریخ فرشتہ بھی ہے۔

ہے تاریخ فرشتہ جو اک معتبر — بتصریح لکھتے ہیں وہ ذی ہنر
لکھا ہے یہ قاسم[2] نے اس شکل حال — فراغت طلب تھا ضعیف الخیال

قدماء کی طرح سہیل نے اس مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے۔ مثنوی کے عنوانات فارسی نثر میں ہیں۔ ایک عنوان "بیان سلطنت و حکومت سلاطین بہمنی" جس کے تحت شاعر نے حسن بہمنی کے اوائل زندگی کے حالات نظم کیے ہیں۔ اور جب محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا تو کئی سرداروں نے بغاوت کردی۔ جس کا نتیجہ

---

[1] سروری عبدالقادر فہرست مخطوطات، مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ ص ۹۹ - ۱۰۰

[2] مراد۔ ابوالقاسم فرشتہ

Marfat.com

یہ نکلا کہ بادشاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دکنی علاقہ تغلق سلطنت سے آزاد ہو گیا۔ اسمٰعیل خاں ناصر الدین کے خطاب سے دکن کا بادشاہ بنا۔ چونکہ حسن بہمنی نے اسمٰعیل کے شانہ بشانہ محمد تغلق کا مقابلہ کیا تھا، اس لئے حسن بہمنی کو ظفر خاں کا خطاب ملا۔ اور ۷۴۸ھ اسمٰعیل خاں ناصر الدین نے امرائے دکن سے خطاب کیا کہ اب مجھے ملک گیری کی آرزو نہیں ہے اس ملک کا حاکم حسن ہونا چاہیئے۔ اس رائے سے سب متفق ہوئے۔ حسن بہمنی نے ۷۴۸ھ میں بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی اور گلبرگہ پایہ تخت مقرر ہوا۔ اس خاندان کے یکے بعد دیگرے اٹھارہ فرمانروا ہوئے۔ مثنوی کے آخری تین اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کلیم اللہ پر ہو گیا اختتام — ہوا بہمنی پھر کسی کا نہ نام
گئی دولتِ بہمنی جو گزر — ہوئے طائفے پنج پھر جلوہ گر
قطب شاہ و عادل نظام و عماد — بریدی تھے بیدر میں فرحان و شاد ۱۱

بعد میں ان دکنی سلطنتوں کو اورنگ زیب نے فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا۔ سہیل نے ۱۰۰ صفحات پر بہمنی خاندان کے اٹھارہ بادشاہوں کے مختصر حالات بیان کئے ہیں جس کے مطالعہ سے اس عہد کے اُمراء، وزراء اور بادشاہوں کے اخلاق، تاج و تخت حاصل کرنے کی تگ و دو میں انسانیت سوز مظالم، عوام کی فلاح و بہبود کے انتظامات کے بارے میں مختصر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں بہمنی سلطنت کے فرمانرواؤں کو اپنے معصر بیجانگر اور تلنگ کے رائیوں کے ساتھ جن وجوہات کی بنا پر لڑائیاں کرنی پڑیں ان واقعات کی طرف بھی اجمالاً اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی چونکہ بہمنی سلطنت کی منظوم تاریخ ہے، اس لئے اس میں جن جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے یا جو واقعات معہ سنہ تاریخ نظم ہوئے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے مستند ہیں۔ چونکہ یہ مثنوی فارسی نثر کا ترجمہ ہے اس لئے زبان مفرس ہے۔ بعض شعر تو بالکل فارسی زبان میں ہی ہیں۔ جہاں کہیں جنگ کا منظر پیش کیا گیا ہے کلام میں بلند آہنگی اس طرح سے نہیں پائی جاتی کہ جس سے مثنوی میں رزمیہ شان پیدا ہو جائے۔ درج ذیل اقتباس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے تاریخی واقعات کو کس طرح خوش اسلوبی اور مور خانہ فرائض سے انجام دیا ہے۔

Marfat.com

محمد تغلق دیارِ دکن کی طرف گیا تو اُسے یہ علاقہ بہت پسند آیا اور اس نے چاہا کہ دہلی کے بجائے دکن کو دار الخلافہ بنانا چاہیے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بادشاہ سے جو اقدام کئے ہیں انہیں ملاحظہ کیجئے ؎

جو ہے نو بنوع دورِ چرخِ کہن — گئے شاہ تغلق بسمتِ دکن
گذر جو ہوا جانبِ دیو گیر — پسند آیا شہ کو بہت دیو گیر
رفیع متیں اور جائے لطیف — پسندیدہ آب و ہوائے لطیف
ہوا شاہ تغلق کے مافی الضمیر — بنے بارگاہ ہو خلافت مصیر
یہ نافذ ہوا سب پہ فرمان شاہ — دکن کو ہوں دہلی سے سب برراہ
امیر و وزیر و صغیر و کبیر — جنہ کل ہوں سب ساکن دیو گیر
کریں ترک واں کی سکونت قدیم — سبھی دولت آباد میں ہوں مقیم ۔ص ۱۱

علاوہ ازیں یہ حکم بھی صادر ہوا ؎

ازاں جملہ نافذ تھا یہ حکم شاہ — سرائیں ہوں تعمیر مابین راہ
سڑک پر شجر بھی یمین و یسار — دکن تک ہوں دہلی سے سب سایہ دار
با سودگی تا کہ خلقت تمام — کرے آمد و رفت میں اہتمام
جو محتاج ہوا اور نہو زاد راہ — مصارف ملے اس کو از گنج شاہ
تغیر تبدل ہوا جو جدید — تو صورت ہوئی پھر تفرقہ پدید
ہما اڑ گیا دولت آباد سے — ہوا کوچ شہ دولت آباد سے ۔ص ۱۲

سلطان مجاہد شاہ ابن محمد شاہ کشن رائے والی بیجانگر کی سرکوبی اور بیجانگر کو فتح کرنے کے بعد دریائے کرشنا کے کنارے مچھلی کے شکار سے دل بہلا رہے تھے، کہ اچانک اُن کی آنکھ میں درد شروع ہوا۔ داؤد خاں نے اقتدار کی ہوس میں، موقعہ پا کر اپنے بھتیجے سلطان مجاہد کو موت کی نیند سلا دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اقتدار کا نشہ برا ہوتا ہے لیکن اقتدار حاصل کرنے کے لئے جن راہوں کو اختیار کیا جاتا ہے اس کا مطالعہ اور تجزیہ بھی ضروری ہے ؎

Marfat.com

گئے نہر کشنہ کے جو متصل | پئے صید ماہی ہوئے مشتغل
ہوا درد سے چشم کے کچھ تعب | ہوئے داخلِ خیمہ آئی جو شب
تو داؤد خاں اور مسعود خاں | ہوئے متفق اور بعضے جواں
سرا پردۂ شہ کے بیٹھے قریں | نگہبان جس طرح چوکی نشیں ۔ص ۳۴
گئی رات دو پاس جس دم گزر | ہوئے آدمی جابجا منتشر
سوا نامہ بر دوں کے کوئی نہ تھا | تو داؤد خیمہ میں شہ کے گیا
تھے خوابیدہ سلطان سرِ پلنگ | کیا حملہ داؤد نے بے درنگ
تھا خواجہ سرا ایک حبشی غلام | وہ تھا پاسِ شاہ میں بااہتمام
جو داؤد کو دیکھا خنجر بکف | تو نالاں ہوا وہ بشور و شغف
اٹھے خواب سے جو شہ حق شناس | پراگندہ تھے۔ تھے نہ جمع حواس
تو داؤد لے خنجر پر ستم | بصد زور مارا بر دئے شکم
شکم سے نکل آئے روئے بروں | مجاہد کا رایت ہوا سرنگوں
پڑی اس طرح کی وہ ضرب شدید | کہ اک وار میں تھے مجاہد شہید ۔ص ۳۵

شاہان بہمنہ اہلِ علم و ہنر کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ عرب و عجم سے جوق در جوق اہل کمال چلے آتے اور دکن میں انعام و اکرام پاتے۔ چند اشعار سلطان محمود شاہ بہمنی فرزند کو چک علاؤالدین حسن بہمنی کے متعلق غور فرمائیے جن سے اس کی شخصیت و کردار پر روشنی پڑتی ہے ؂

یہ سلطان محمود شاہِ دکن | تھے قاریِ قرآں بوجہ حسن
نوشت اور تحریر میں خوش نویس | پسندیدہ مطبوع و ہر دل عزیز
علوم جز و کل سے ہے باخبر | پئے نظم اشعار بھی بہرہ ور ۔ص ۳۷
ہوئی گرم جو شاہ کی انجمن | عرب اور عجم کو تھا شوق دکن
ہوئے میر فضل اللہ انجو وزیر | وزارت کی مسند پہ رونق پذیر
یہ داد و دہش کی جلی و خفی | کہ وہ جائزہ میں ہزار اشرفی

Marfat.com

کھلا تھا جو دربار انعام کا | بچھا ہر طرف خوان اکرام کا
ہنر پروری کی جو حد سے سوا | سخاوت کا آوازہ ہر سو گیا
ہوا خواجہ حافظ کو شوقِ دکن | ہے مشہور شیراز جن کا وطن — ص ۳۸

چند اشعار سلطان فیروز شاہ الملقب بہ روز افزوں بن داؤد شاہ بہمنی کے متعلق ملاحظہ ہوں ؎

ادائے فرائض میں نیکو صفات | ہمیشہ تھا پابند صوم و صلوٰۃ
ہر اک شب کو معمول تھا آدو پاش | خرد مند رہتے تھے سب شہ کے پاس
فواضل بھی اور شاعر قصہ خواں | ندیماں خوش لہجہ شیریں بیاں
شگفتہ طبیعت کریم و حلیم | ہنر مند و زیرک تھے شہ کے ندیم۔ ص ۴۵
نہ پوچھو کہ کیسے تھے عمدہ خصال | تھی اک قوتِ حافظہ بھی کمال
تھا معمول و دستور شاہِ حمید | ہر اک روز لکھتا کلامِ مجید
جو اک بار سنتا وہ رکھتا تھا یاد | فصاحت تکلم میں حد سے زیاد
سخن گو و ذی فہم و ذہنِ رسا | تخلص عروجی و فیروزی تھا

ان اشعار سے فیروز شاہ کے بارے میں ان کی شخصیت اور اہلِ کمال کی سرپرستی اور ان کے فن کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بہمنی سلطنت کے فرمانروا نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے سلطنت کے بڑے شہروں میں نہ صرف شراب نوشی ممنوع قرار دی، بلکہ شراب خانے بند کرا دیئے۔ احمد شاہ بہمنی کے لڑکے علاؤالدین بہمنی نے شہر بیدر میں مریضوں کے لئے بہترین شفا خانہ بھی بنوایا جس کے متعلق سہیل نے "تعمیر دارالشفا حسب الحکم بادشاہ در شہر بیدر ......" کے عنوان کے تحت لکھا ہے ؎

بنی حکم سے شہ کے دارالشفا | اسی شہر بیدر میں باصفا
ہوئے وقف قریہ کئی اس کے نام | دوا اور غذا میں تھا صرف تمام
مسلمان تھے اس میں طبیب و حکیم | معالج تھے وہ بہر جملہ سقیم

تھے قاضی و مفتی امین و متین — خدا ترس و حامی شرعِ مبین
دیا حکم کوئی نہ پیوے شراب — بدوں پر تحاشہ کا عقاب و عتاب
یہ نافذ ہوا حکمِ شاہی اگر — قماری جو ہیں ان کو کر دو بدر
ہوئے امرِ ممنوع پہ جو مرتکب — ز روئے شریعت تھا ان پر غضب — ص ۷۷

جنگ کا منظر ملاحظہ ہو۔ سلطان فیروز شاہ نے راجہ نرسنگ پر چڑھائی کرنے کے لئے میرانجو اور خان خاناں کو روانہ کیا ؎

تو میرانجو اور خان خاناں بہم — جما کر صفیں ہو گئے بر قدم
کھڑی تھی مقابل میں فوجِ عظیم — کئے حملے مردانہ بے خوف و بیم
ہوا کُشت و خوں اور جنگ و جدال — ہر اک تیغ پر چڑھ گیا رنگ لال
شجاعوں نے دی دادِ مردانگی — لڑائی میں دکھلائی فرزانگی
مخالف کا غلبہ ہوا اس قدر — ہوا جیش اسلام سب منتشر
جو تھے خان خاناں سوئے میمنہ — تو تھے میرانجو سوئے میسرہ
اسی معرکہ میں بجمع قلیل — تھے حیران و استادہ دونوں اصیل ص ۴۹

چونکہ سہیل کے پیشِ نظر تاریخ کا نثری مجموعہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مثنوی میں واقعات کو اس مسودے کے چوکھٹے میں کھڑا کیا اور مختصر اٹھارہ بہمنی بادشاہوں کا ذکر کر دیا۔ اگر بہمنی سلطنت کے حالات تفصیل سے پیش کرتے تو ایک اچھی تاریخی مثنوی وجود میں آجاتی۔ مختصر یہ کہ یہ مثنوی بہمنیہ سلطنت کا اجمالی خاکہ ہے جو تاریخی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہے۔

## مثنویِ سہیلِ دکن

اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ یہ غیر مطبوعہ مثنوی ایک مخطوطہ کی دوسری مثنوی ہے۔ پہلی مثنوی "تاریخ سلاطین بہمنہ منظوم" کا ذکر تفصیل سے پہلے ہو چکا ہے۔ ذیل کے اشعار سے مثنوی کا نام اور مصنف کے تخلص کا پتہ چلتا ہے۔ ؎

یہ پُرساں ہوتے ہیں سب شیخ و شاب — مولف ہے کون ہے یہ کس کی کتاب

Marfat.com

یقین ہے کہ روشن ہے یہ انجمن    رکھا نام اس کا سہل دکن

اس مثنوی کی ابتداء بھی روایتی انداز میں حمد و نعت اور تعریف و مدح، صحابۂ کرام حضرت خیر انام سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مصنف مثنوی کے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے اور "عنوان" "بیان ممالک جنوبی ہندوستان و تعریف نواب نظام الملک آصف جاہ" قائم کیا۔ اس عنوان سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کا اصل مقصد کیا ہے۔ پہلے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

قلم اب ہے سیاح ملکِ جنوب    کہ لکھتا ہے احوال ملکِ جنوب
یہ قصہ جنوبی ہے اک تیرا    دکن اس کو کہتے ہیں اے باصفا
جو مشہور نامی ہیں اس میں دیار    بیاں ان کا ہوتا ہے اندیو قار

اس عنوان کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں جو نظام الملک آصف جاہ کی تعریف میں کہے ہیں

ارسطو فطانت خداوند تخت    سزاوار تاج و سزاوار تخت
فلک اقتدار اور علو دو دماں    نظام دکن افتخارِ جہاں
خدیو جہاں اور عالی جناب    ہے محبوب علی شاہ جس کا خطاب
دکن کی ریاست کے مسند نشیں    خدا داد جن کو ہے تاج و نگیں
رعایا نواز اور ظلِ اللہ    سخی و رحیم اور عالم پناہ

سب سے پہلے مصنف دارالخلافہ بیدر جسے محمد آباد بھی کہتے ہیں اس کی تعریف کی ہے اس کے بعد اورنگ آباد دکن کی کیفیت جس انداز میں پیش کی ہے ملاحظہ ہو

ہوا اورنگ سے لفظ آباد ضم    تو اک شہر کا نام ہوئے علم
عمارات کہنہ سے یہ ہے پدید    نہیں کوئی اس میں طرح جدید
ہوا جبکہ مہرِ سعادت طلوع    تو آبادی شہر ائے وقوع
قدوم سلاطینِ با احتشام    زمیں کو بھی کرتے ہیں عالی مقام
خصوصاً شکستہ و ویران کہیں    جو ہے روضۂ صوبہ دار دکن

Marfat.com

یہ ہے گریہ و نالۂ آب شار — سُنیں میری فریاد کو شہریار
جو ہے خاں مرحوم کا وارثہ دار — کسی طرح اس کا نہیں اختیار
نہیں اس کی تُربت پہ شمع چراغ — نزول اس کا سب ہے اراضی و باغ
جو ہیں صاحبِ روضہ اے ذی شعور — ہوا اُن کا اظہار بھی پُر ضرور
وہ ہیں عمدۃ الملک اسلام خاں — یہ روضہ انہیں کا ہے باعز و شاں
مگر ہاں حضور ہیں جو عالم پناہ — کہ ملک دکن کے ظلِ الٰہ

مثنوی کے آخر میں کچھ غزلیں اور قصیدہ بھی ہے۔ مثنوی کی تاریخی حیثیت صرف اتنی ہے کہ مثنوی ہند کے مشہور شہروں اور قدیم مقبروں کی خستہ حالی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور شاہِ دکن کو آثارِ قدیمہ کی دیکھ بھال اور اُن کی حفاظت کی طرف دھیان دلایا ہے۔

## تاریخ ہندوستان منظوم

مثنوی "تاریخ ہندوستان منظوم" کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ جو خطِ نستعلیق میں ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا قدیم مثنویوں کی طرح حمد، نعت، مناجات سے ہوتی ہے تعریف ملکہ وکٹوریہ تعریف صاحب عالیشان کہ در مملکت ہند اور تعریف ارباب کونسل کے دیباچے کے بعد مصنف مثنوی کے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مصنف نے مثنوی کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کے جزِ اوّل میں مشرقی ہند کے صوبجات۔ آسام، بنگال، اڑیسہ، بہار، الہ آباد اور بنارس کی کیفیت، وہاں کے باشندوں کی بود و باش، تاریخی عمارتوں کی تفصیل، عہد عالمگیر کے واقعات، حصولِ تخت کے لئے اورنگ زیب اور دارا کی لڑائی کا تفصیلی بیان، ابو المظفر قطب اللہ محمد معظم بادشاہ بہادر کے جلوس اور اُن کے چار شہزادے، منیر الدین، جہاندار شاہ، محمد فرخ سیر ابن عظیم الشان محمد شاہ ابن خجستہ اختر، احمد شاہ ابن محمد شاہ گورگانی، عزیز الدین محمد المخاطب با عالمگیر ثانی کے عہد کے مختصر واقعات کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں، نصیر الدین حیدر، نصیر الدولہ عرف محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی تخت نشینی، لکھنؤ کے قدیمی چوک کی کیفیت، باشندگانِ لکھنؤ کی تعریف، کیفیتِ محرم، قیصر باغ اور اندر سبھا کی تعریف، لکھنؤ کے علمائے زبان اور اسیر، دبیر، انیس سے مختصر تذکرہ پر پہلے

Marfat.com

حصّے کے جزِ اوّل کا اختتام ہوتا ہے۔ پہلے حصّے کے جزِ دوم میں مرزا بابر سے لے کر ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ کی تخت نشینی کے مختصر واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ مثنوی کے دوسرے حصّے میں مغربی ہند کے اضلاع لاہور اور ملتان، صوبجات مالوہ، کشمیر اور صوبۂ کابل بلخ و بدخشاں کا ذکر ہے۔ تیسرے حصّے میں جنوبی ہند کے اضلاع، برار، دولت آباد و تلنگ، احمد نگر، بیجاپور، کا مختصر ذکر کیا ہے۔

المختصر ۲۲ صفحات پر مشتمل مثنوی میں پورے ہند کی تاریخ قلمبند کردی ہے۔

مورخہ ذمہ داری کا احساس مصنّف میں ہے فرماتے ہیں ؎

مؤرخ وہ ہے قابلِ اعتبار — کہ ہو راستی جس کا قول و شعار
ہے علمِ تواریخ علمِ دگر — نہیں منحصر یہ قوائین پر
حقیقت جو ہے وہ لکھوں صاف صاف — تواریخ سے ہے نہ لاف و گزاف
بتصریح رقم ہو تو ہوئے کتاب — لہٰذا ہے مجمل کا یہ انتخاب

آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی تاریخ مجمل کا مختصر انتخاب ہے جو مصنّف کے پیش نظر رہی ہے۔ مثنوی کے تمہیدیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوا ختم دیباچۂ مثنوی — سنو ہم سے کیفیتِ ہند دی
کروں ...... نظم نو و کہن — کہ مطبوع ہر دل ہے شعر و سخن
یہ ہے مثنوی شِبلِ جغرافیہ — کہ مضمون حال اور ہے ماضیہ
بہ تفصیل کرتا ہوں اس کو رقم — کہ ہے تین حصّوں پہ یہ منقسم
جو مشہور ہیں شہر ہندوستاں — ہر اک جزو کل کا ہے اس کے بیاں
یہ آئینۂ کشورِ ہند ہے — یہ فہرست بحر و برِ ہند ہے
کیا ملک شرقیہ کو پہلے رقم — پھرے غرب کو پھر عنانِ قلم
فراغت ہوئی ملکِ غربی جب — لکھا حال ملکِ جنوبی کا سب

اس تمہید کے بعد مشرقی ہند کا حال سب سے پہلے بیان کیا ہے ؎

لہٰذا قلم اُس طرف ہے رجوع — کہ خورشید کا ہے جہاں سے طلوع

Marfat.com

ہے بنگال احاطہ جو اے ذی وقار  ہوا ملک شرقین جس کا شمار
اسی وجہ اس کا ہے پہلے بیاں  کہ یہیں سے ہے آغاز ہندوستاں

بیان در عمارات کلکتہ و تعریف حکام کے زیر عنوان لکھتے ہیں ؎

کروں مجملاً حال اوس کا بیاں  کہ کہتا ہے کلکتہ جس کو جہاں
عمارات عالی ہیں اس میں تمام  یہ ہے آج کل مرجع خاص و عام
گورنر اسی میں ہیں رونق پذیر  ہیں سلطان لندن کے اک وزیر
ہوا ہند میں جب سے ان کا گذار  ہوا غیرت باغ ہر خانہ زار
نہایت عقیل و خردمند ہیں  یہ قانون کے اپنے پابند ہیں
یہ ہیں بادشاہ اپنی تدبیر کے  یہ دراصل جوہر ہیں شمشیر کے
فراست میں ان کا نہیں ہے نظیر  ارسطو ہے یہاں ایک طفل صغیر
ہر اک شے میں کرتے ہیں اختراع  نہ کیوں پھیلے دنیا میں ان کی شعاع

مندرجہ بالا اشعار میں مصنف نے فرنگی قوم کی ذہانت اور ذہنیت کی غیر مبہم تصویر پیش کردی ہے " جنگ وجدل مابین دارا شکوہ و اورنگ زیب " کے عنوان کے تحت اورنگ زیب کا شب خون مارنا، دارا کی شکست، شاہ جہاں کی نظر بندی اور مراد بخش کو جس عیاری سے قید کیا ہے اس سے اورنگ زیب کے کردار و گفتار پر روشنی پڑتی ہے۔ چند اشعار اس موقعہ کے ملاحظہ ہوں ؎

یہ شاہ جہاں کو جو پہنچی خبر  کہ در پیش اب نزع ہے ہمدگر
پے جنگ آئے ہیں تا دھولپور  یہ بھڑکے گی آتش نزدیک و دور
ہوئی شعلہ ور جب یہ آتش کی موج  روانہ کی شاہ جہاں نے بھی فوج
چلے جبکہ دارائے عالی وقار  تو ہمراہ تھا لشکر بے شمار
فطانت میں یکتا تھے اورنگ زیب  کہ سوجھے اونہیں راہ قتل و نہیب
نہ تھی فوج دارا میں اصلا خبر  کہ شب خون مارا بہ تعجیل تر
ہوئی فوج دارا کی ایسی شکست  کہ امکان سے باہر ہوں بند و بست

Marfat.com

مظفر ہوئے جب کہ اورنگ زیب تو آئے سوئے آگرہ با نہیب

خاص و عام جتنے بھی اراکین دولت تھے وہ سب کے سب حصول منصب کے لئے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور جب شاہجہان کو اس کی خبر ہوئی تو ناچار اورنگ زیب کو صلح کا خط لکھا۔ اورنگ زیب نے قلعہ میں داخل ہوتے ہی شاہ جہان کو قید کر لیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوئی بادشاہ کو یہ جس دم خبر مکدر ہوئے اور غم دیدہ تر
لکھا ایک نامہ بصد اشتیاق کہ گنگ رہے یہ زبانِ فراق
نہ ناچاری کی صلح شہ نے قبول روانہ کیا ایک اپنا رسول
یہ مضمون نامہ تھا اندوہ گیں بتوفیق اب ہوں میں عزلت گزیں
نہیں کچھ زمانے میں اب مجھ کو کام جو چاہے کرے سلطنت کا نظام
گیا جب یہ فرمانِ شاہِ جہاں تو اورنگ نے اپنا گارڈ عالی شان
کیا آمد و رفت مردم کو بند ہوئے پاک شیدہ جو ہے ہوش مند
یہ تدبیر ایسا کیا بند و بست کہ سب کارخانہ کیا زیر دست
قلعہ میں نظر بند جس دم ہوئے ہوئی زندگی تلخ و رنج ہم ہوئے

سلمان شکوہ اپنی فوج کے ساتھ بنارس میں تھا جب دارا شکوہ کی شکست کا حال معلوم ہوا تو سلمان شکوہ کی فوج میں بغاوت پھیلی اور اپنے آقا پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ دارا شکوہ نے شکست کھانے کے بعد آگرہ سے شاہ جہان آباد کا رخ کیا، پھر وہاں سے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے بعد مراد بخت تخت کا دعویدار بنا، اورنگ زیب نے اُسے دھوکہ سے قید کیا ؎

جو متھرا میں پہنچے یہ با عدل و داد تو مکنوں خاطر تھے فکر مراد
کیا تھا محبت سے اس کو طلب غرض آیا وہ سادہ دل پاس جب
ضیافت دی اس کو کھلایا طعام ہوا دام و دانہ سے وہ جیسے رام
مقید بہ زنجیر اس کو کیا کہ دار الخلافہ میں بھیجا گیا
غرض اس طرح شاہ اورنگ زیب بادار الخلافہ پھرے با نہیب

Marfat.com

مولوی محمد ذکاء اللہ خاں نے تاریخ ہندوستان جلد ہشتم میں خافی خان کے حوالے سے لکھا ہے ۔

"شاہزادہ مراد بخش سادہ لوح تھا..... دونوں بھائیوں نے ساتھ بیٹھ کر ہنسی خوشی کھانا کھایا اور ظاہر میں محبت اور الفت کی باتیں نہایت تپاک کے ساتھ ہوئیں اور کہیں بیچ میں ان کا تار نہیں ٹوٹا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو کابل اور شیراز کی مزہ دار شرابیں بہت سی آئیں۔ اورنگ زیب اٹھا اور مسکرا کر اس نے کہا کہ صاحبِ عالم تم خوب جانتے ہو میں مسلمان ہوں مجھے مشکل ہے کہ میں تمہارے ساتھ اس مے نوشی میں مزے اڑاؤں۔ اس لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں یہاں سے غیر حاضر رہوں۔ مراد بخش کی عادت میں تو خوب شراب پینا داخل تھا، جب نفیس شرابیں اس کے آگے آئیں تو اس قدر ان کو پیا کہ بدمست ہو کر بے خبر سو گئے۔ اورنگ زیب کی مراد برآئی کہ مراد بے ہوش پڑا سوتا تھا اُسے ہتھکڑیاں لگوا کر قید کر لیا۔" ص ۲۹ - ۳۰

مراد بخش کو قید کرنے کے بعد اورنگ زیب نے دارا شکوہ کے تعاقب کے لئے سپاہی روانہ کئے اور خود محمد شجاع کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوا۔ لڑائی کے میدان میں راجہ جسونت سنگھ نے شاہی فوج سے دغا کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تعاقب میں دارا کے پیچھے دو شیر ۔۔۔ جو تھے شیخ میر اور خان دلیر
محمد شجاع سے جو تھا عزم جنگ ۔۔۔ روانہ ادھر ہی کر بھیرے بے درنگ
صف آرا ہوئے پھر جنگ و جدال ۔۔۔ ہوا دونوں جانب سے رزم قتال
بہت سخت باہم ہوئے کارزار ۔۔۔ بسر ہو گئی جس میں لیل و نہار
جو اک راجہ جسونت مشہور تھا ۔۔۔ شبِ آخر اس سے ہوا یہ دغا
کہ لشکر کو وہ لوٹ کر رفتنی ۔۔۔ سر دیا سے لی اس نے راہِ وطن

مولوی ذکاء اللہ نے تاریخ ہندوستان جلد ہشتم میں لکھا ہے :-

"پچھلے پہر لشکر میں یکبارگی غلغلۂ عظیم ہوش رُبا اٹھا اور ایک عجیب آشوب برپا ہوا۔

Marfat.com

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ راجہ جسونت سنگھ منافقانہ بادشاہ کے ساتھ ہوا تھا۔ ہمیشہ سے فرار کی بدنامی کا جامہ اس کے لئے سیا گیا تھا۔ اُس نے اوّل شب میں شجاع کے محرمِ راز کی زبانی پیغام اُس کے پاس بھیجا تھا کہ میں آخر شب میں لشکرِ شاہی پر شب خون مار کے لوٹتا مارتا فرار اختیار کروں گا۔ بادشاہ اُس سے مطلع ہو کر میرا تعاقب کرے گا۔ اس وقت شجاع کا بہادر لشکر، شاہی لشکر پر تاخت کریں۔" ص ۵۸

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے "تاریخ ہندوستان منظوم" تین حصّوں پر منقسم ہے۔ ہر حصّے کے بعد چند صفحات مخطوطے میں خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مخطوطے کی عبارت پڑھنے میں قدرے دشواری ہوتی ہے، بعض جگہ کئی کئی اشعار اور بعض جگہ صفحات کے صفحات ایسے مسخ ہو گئے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپڑے کا ٹکڑا پانی میں تر کر کے اشعار ایسے مسل دیئے ہیں کہ پڑھنے میں نہیں آتے۔ یہ رگڑ نے مسلنے کا کام کسی سنجیدہ شخص کا نہیں معلوم ہوتا یا یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ باتیں ایسی راہ پا گئی ہوں جو تاریخی اعتبار سے مستند نہ ہوں اور اُنھیں بعد میں مصنّف نے یا جس نے نظرِ ثانی کی ہو اُنہیں مٹا دیا ہو۔

اس مخطوطے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی دستیابی سے شاعر کے نام اُن کے خاندانی حالات اور وطن کے بارے میں بہت کچھ اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کا ذکر تفصیل سے "تاریخ سلاطین بہمنیہ" کے باب میں آ چکا ہے۔

تاریخی اعتبار سے "تاریخ ہندوستان منظوم" مستند ہے۔ چونکہ سہیل کے پیش نظر تاریخ مجمل" کا نثری مجموعہ تھا۔ جس کی وجہ سے مثنوی میں واقعات کو اختصار سے اپنے شعری مخطوطہ میں پیش کیا ہے۔ مثنوی میں جہاں کہیں بھی جنگی مناظر آئے ہیں ان میں رزمیہ شان پیدا نہیں ہو سکی۔ اور نہ مثنوی میں فارسیت کا غلبہ ہے، جو تاریخ سلاطین بہمنیہ منظوم" میں پایا جاتا ہے۔

Marfat.com

# سیّد احمد علی شاہ

سید احمد علی نام۔ احمد تخلص تھا۔ ۱۸۱۸ء میں ولادت ہوئی اور ۱۸۷۴ء میں وفات پائی۔ خاندانی حالات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے مفسدہ کے وقت گورکھپور کے رئیسِ اعظم تھے۔ ان کی تین تصانیف کا پتہ چلتا ہے "مثنوی کشف البغاوت گورکھپور" جو انہوں نے ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں تصنیف کی۔ ۱۲۷۶ھ/۱۸۶۰ء میں در مطبع حیدری شائع ہوئی۔ مثنوی "محبوب التاریخ" ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں در مطبع حیدری شائع ہوئی، اور تیسری تصنیف "نور الحقیقت" ہے۔ جس میں مذہبی مضامین ہیں۔ امام باڑے کی لائبریری میں تینوں مثنویاں موجود ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق پہلی دونوں مثنویاں ہیں مثنوی کشف البغاوت گورکھپور کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے دوران مصنّف نہ صرف انگریزوں کا وفادار رہا بلکہ ان کی ہر طرح سے مدد بھی کی تھی۔ مدح ملکہ معظّمہ کے عنوان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

دُعا ہے یہ احمد کی اے کردگار　　رہے حشر تک سلطنت پائیدار

مندرجہ بالا شعر سے مصنّف کے تخلص اور اس کی سلطنتِ انگلشیہ سے ہمدردی کی غمازی ہوتی ہے۔

**کشف البغاوت گورکھپور** سید احمد علی شاہ کی اس مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے۔ مدح ملکہ معظّمہ کوئین وکٹوریہ کے بیان کے بعد "بیان وجہ تصنیف" قائم کیا ہے۔ جس کے تحت موٗلّف نے پہلے اپنے کلام کے بارے میں چند اشعار لکھے ہیں اور بعد میں فرماتے ہیں کہ اس مثنوی میں جو کچھ بھی بیان کروں گا وہ سب صداقت پر مبنی ہوگا۔ مصنّف نے مثنوی میں ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے واقعات بیان کئے ہیں۔ جو اخبارات میں چھپی خبروں پر مبنی ہیں۔ مثنوی کا مختصر خلاصہ اس طرح ہے۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ میں روزوں کے دنوں میں پہلے پہل میرٹھ چھاؤنی کی فوج اپنے انگریز حاکموں سے باغی ہوگئی اور دلّی کی جانب کوچ کیا۔ یہ خبر

Marfat.com

ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ماہ جون کی تین تاریخ کو یہ خبر اعظم گڑھ پہنچی تو یہاں کی فوج نے بھی بغاوت میں شریک ہونے کے لئے دہلی کا رُخ کیا۔ ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ سرکاری خزانے لوٹے جانے لگے۔ اعظم گڑھ میں حکومت کے کچھ خیرخواہ علی بخش ناظر اور سررشتہ کے افسر صفدر حسین جیسے لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دیانت داری سے انگریزوں کی امداد کی۔ اعظم گڑھ کی فوج کی خبر گورکھپور پہنچی تو وہاں کی دو کمپنی فوج بھی باغی ہو گئی۔ جب وہ خزانہ لُوٹنے کے لئے آئی تو وہاں کے حاکم اور رئیس لوگوں نے جو سرکار کے معاون اور مددگار تھے خزانہ لوٹنے نہ دیا تعلقہ گنیش پور کی گوتم قوم اور موضع پانڈے پار کے عوام بھی اس سانحہ میں ملوث رہی۔ برعکس اس کے ضلع غازی پور کے رؤسا نے بڑھ چڑھ کر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مصنّف کے خیال میں مفسدہ کی وجہ بندوقوں کے کارتوسوں پر لگی چربی کی جھوٹی افواہیں تھیں۔ جو غیر ذمہ دار شرارتی طبقہ کی پھیلائی ہوئی تھیں۔ مصنّف کی رائے ہے کہ انگریز ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی عقیدوں کی پائمالی نہیں کرتے تھے۔ نہ اُن کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کے عادی تھے۔ برعکس اس کے انگریز یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان آپس میں کبھی نہ بگڑیں۔

تعلقہ سوگولی کا رسالہ باغی ہو کر سلیم پور کے خزانے کو لوٹنے آیا تو وہیں کا رسالہ جو انگریزوں کا وفادار تھا اس نے خزانہ لوٹنے نہ دیا۔ انگریزوں کے مطالبہ پر مہاراجہ نیپال نے فوراً فوج بھیج دی۔ بہرائچ پہنچنے پر مصنّف نے نیپالی فوج کی رسد کا انتظام کیا۔ فوج کی نقل و حرکت کے لئے علاقہ سے گاڑیوں کا بھی بندوبست کیا۔ مصنّف نے انگلشیہ حاکموں کی شجاعت کا ذکر بھی کیا ہے۔ بمقام گگیا محمد حسن مصنوعی حاکم خزانہ لوٹنے آیا تو اس نے انگریز حاکموں کو بہت پریشان کیا۔ قوم بلوار اور راجہ جیلال نے بھی سرکار کے خلاف جنگ کی مگر انگریز فوج کے ہاتھوں سخت ہزیمت اُٹھائی۔

چاروں طرف پھیلی لُوٹ مار کے دوران مصنّف کا بھی کافی سازوسامان لُٹ گیا جس کا اُسے بے حد ملال ہوا۔ علاقہ محی الدین پور اور نوراکی بربادی کی حکایت راجہ ستاسی کی سرکشی اور لوٹ مار کا مفصّل بیان مثنوی میں ہے۔ نیپالی فوج بہرائچ کے مہاجنوں اور

Marfat.com

رعایا کو اس کی سربلندی کا مزا چکھانے کے بعد ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ جا کر نواب لکھنؤ اور مفسدیوں پر فتح پائی۔ اور پھر نیپال واپس رخصت ہوئی۔

مصنف نے جناب کمشنر لارنس صاحب حاکم پنجاب کے حسنِ انتظام کا ذکر کرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور رنگون روانہ کئے جانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملکہ معظمہ نے باغیوں کے لئے عفو و تقصیر کا اشتہار مشتہر کیا۔ جس کا مصنف نے ترجمہ کیا۔ مہیت سنگھ اور دیگر وفاداروں کو رتبے ملے اور آخر میں کیفیتِ رئیسانِ شہر گورکھپور پر مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے۔

"بیان وجہِ تصنیف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس سے "مثنوی کشف البغاوت گورکھپور" کا تعارف ہوتا ہے ؎

کروں سانحہ ہند کا آشکار — قلم کا بھی جس سے ہے سینہ فگار
یہ ہے قدرتِ خالقِ ذو المنن — پڑا ہندیوں پر یہ رنج و محن
ہوا ہر بشر پر یہ رنج و تعب — پڑا ایک بیک یہ خدا کا غضب
کہ افواجِ سلطان والا حشم — سے افسر روم چین و عجم
بغی[1] اپنے سردار سے ہو گئی — کمائی ہمیشہ کی سب کھو گئی
نہ سمجھے ذرا کچھ بھی شرطِ نمک — یہ شہرا ہے اب از سما تا سمک
عجب نطفہ بد تھے لعینِ خدا — کب ایسوں کا منہ دیکھنا ہے روا
میرے حال پہ رحم لولاک ہے — کہ ایسوں سے اقلیم سب پاک ہے

مذکورہ بالا آخری شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اب سانحہ ۱۸۵۷ء فرو ہو چکا ہے اور مثنوی اس سانحہ کے فوراً بعد لکھی گئی ہے۔ مثنوی میں ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے واقعات اس وقت کے اخبار پر مبنی ہیں جن کا آغاز ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے ہوا۔ جونہی یہ خبر ضلع اعظم گڑھ اور پھر گورکھپور پہنچی تو وہاں بھی کمپنی کی فوج اپنے مالک سے باغی ہو گئی ؎

مگر پہلے میرٹھ سے آغاز ہے — عیاں ہم پہ اخبار سے راز ہے
مئی کا مہینہ تھا اے ہوشیار — تھی تاریخ دسویں یہ ہے آشکار

---

[1] باغی

تھے اعدا دبارہ صد پہ ہفتاد سہ | ہوئے متفق دونوں سنہ ہے یہ یہ
مناسب ہے اب عیسوی سن لکھوں | تھے ستاون اٹھارہ سو پہ فزوں
مہینہ تھا روزوں کا گرمی کی فصل | ہوئی شہر میرٹھ سے جھگڑے کی اصل
یکایک یہ سلطاں سے باغی ہوئے | کہ سب فتح دہلی کو راہی ہوئے

جہاں اعظم گڑھ کی فوج باغی ہوئی وہاں کمپنی کے خیر خواہ رئیس علی بخش ناظر خود مصنف سید احمد علی اور سررشتہ کے افسر صفدر حسین نے وفاداری اور دیانت داری کا ثبوت دیا۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اعظم گڑھ کا احوال آگے سنو | ذرا باغیوں پر تاسف کرو
مخالف یہاں پر بھی لشکر ہوا | مثالِ شتر وہ بھی دہلی چلا
علی بخش ناظر تھے ایک خیر خواہ | سمجھ کر وہ حکام کو بادشاہ
دم ہر دم اطاعت کا بھرتے رہے | بُرے کام کو نام دھرتے رہے
کہ بے خوف ہوں آپ روز فروز | یہ عاصی ہے حکام کا کفش دوز
ہمیشہ ہتھیلی پہ رکھتا ہوں سر | اطاعت میں ہوں مستعد سر بسر
سررشتہ کے افسر ہیں صفدر حسین | دیانت امانت سے کرتے ہیں چین
بہت خوب ہیں مرد دانش گزیں | ہزار آفریں صد ہزار آفریں
رفاقت میں حکام کے وہ بھی تھے | جو پیش آیا رنج والم سب سہے

اس طرح سے ضلع گورکھپور کی فوج بغاوت پر اتر آئی مگر وہاں کے رؤسا نے جرأت کا ثبوت دیا اور خزانہ نہ لوٹنے دیا ؎

یہاں کی بھی افواج باغی ہوئی | شرارت سے اپنے وہ داغی ہوئی
اعظم گڑھ کا احوال اس نے سنا[1] | کہ حاکم سے سب نے بغاوت کیا
خزانے کے لینے پہ تیار ہو | ہوئے مستعد وہ پیکار ہو

---

[1] بروزن عظم گڈھ مستعمل ہوا۔

Marfat.com

یہاں پر جو حاکم تھے ذی عزوشاں کروں ان کی جرأت کا کیا میں بیاں
کیا گرچہ افواج نے انحراف رؤسا مگر یاں کے تھے پاک صاف
معاون تھے حکام کے اس قدر نہ آنے دیا ان پہ ہرگز ضرر

تعلقہ گنیش پورہ کی گوتم قوم اور پانڈے پار کی عوام نے بھی بہت لوٹ مار کی برعکس اس کے ضلع غازی پور کے رؤسا کا ذکر سنیئے ؎

اور آشوب سے جو کہ خالی رہا اسے بھی یہ تفصیل میں نے لکھا
سبھوں پر مقدم رہا غازی پور بہت اس کی شہرت ہے نزدیک و دور
وہاں کے رؤسائے عالی نسب صفا دید اضلاع والا حسب
دلوں سے تھے حکام کے خیر خواہ نصیبوں میں اُن کی رہی واہ واہ

بغاوت کی وجوہات بندوقوں کے کارتوسوں[1] پر لگی چربی بتائی گئی تھی مصنّف کا خیال ہے کہ یہ غلط افواہ کسی غیر ذمہ دار اور بدفہم شرارتی طبقہ کی پھیلائی ہوئی تھی ورنہ انگریز حاکم ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقیدوں کی پائمالی کبھی نہیں کرتے تھے اور نہ ان کی کبھی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس میں بگڑیں ؎

وے یہ نہ تحقیق ہم کو ہوئی کہ باعث خرابی کی کیا بات تھی
سبب کون سا برہمی کا ہوا قدم حد سے کیوں سب نے باہر دھرا
کیا دشمنی اپنی کیوں جان سے مبدّل کیا دل کو کیوں شان سے
مگر اس قدر ذہن میں آگیا کہ جو کچھ کیا فہم بد نے کیا
وہ سمجھے کہ ٹوٹیٹی میں کچھ تھا لگا اگرچہ حقیقت میں وہ صاف تھا
ہمیشہ سے حاکم کو ہے یہ خیال کہ مذہب کسی کا نہ ہو پائمال
ہمیشہ اعانت ہے حکام سے کہ بگڑے نہ ہندو و اسلام سے

انگریزوں نے مہاراجہ نیپال سے امداد کے لئے افواج طلب کیں اور مصنّف کو بھی شقہ لکھا کہ وہ نیپالی فوج کے لئے رسد کا سامان مہیا کرے۔ نیز نقل و حرکت کے لئے علاقے

---

[1] کارتوس۔

سے گاڑیوں کا انتظام بھی کر سے ؎

اعانت طلب جب ہوئی کمپنی — تو افواج راجہ وہاں سے چلی
عدد میں وہ پلٹن ہے شبِ چار دہ — جو یہ رشکِ حور ہیں تو وہ رشکِ مہ
چلی فوج نیپال سے بے جد و کد — تو پہونچا مرے پاس حکمِ رسد
رسد کے لئے ایک شقہ لکھا — جو کچھ تھا ضروری سو میں نے دیا
ہوا جب کہ بہرائچ میں آ مقام — بخوبی رسد کا کیا انتظام
طلب گاڑیوں کو بھی مجھ سے کیا — اور شقہ میں مضمون ایسا لکھا
جو ممکن ہو گاڑی علاقے سے دو — کہ اس وقت سرکار کا کام ہو
کیا میں نے گاڑی کا بھی انتظام — بخوبی کیا اوس کا بھی انصرام

"حکایت فتح و فیروزی سرکار دولتِ مدار از لکھنؤ وا رخصت یافتن فوج نیپال" کے عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ نیپال کی فوج کی رخصت پر گوروں کی فوج نے جگہ سنبھالی جن کی شان و شوکت شجاعت و کر و فر کا مصنف نے کیا خوب بیان کیا ہے ؎

رہی باقی تھوڑی سی یہ گفتگو — یہ لکھتا ہے راوی اسے دو بدو
یہ پچیس اپریل کا سرگزشت — سن ہیجدہ بود پنجاہ و شصت
کہ از لکھنؤ فوج نیپالیاں — مظفر و منصور آئی یہاں
اور سرکارِ عالی سے رخصت ہوئی — بدفعات نیپال کو سب گئی
اور افواج گوروں کی آئی یہاں — بصد فر و شوکت بصد عز و شاں
لکھوں کیا میں ان کی شجاعت کا حال — کہ رستم بھی ہے سامنے اون کے زال
ہیں سب سامنے ان کے مثل شغال — کرے سامنا ان کا کس کی مجال
کروں کیا میں یا رب کہ ان کا بیاں — سب اسرار پنہاں ہیں اس سے عیاں
ہو وقت دعا صور یوم النشور — بہنگام عشرت سراپا سرور
لکھے کیا قلم ان کا حسن و جمال — ہے نظارہ کو اوس سے حیرت کمال
وہ رنگت گلابی وہ وردی غضب — عجب ہے عجب ہے عجب ہے عجب

Marfat.com

ہند کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر بھی اس سانحہ میں برابر شریک رہا جس کی وجہ سے اُسے قید کر کے جلا وطنی کی سزا دی گئی اور رنگون بھیج دیا گیا۔ مگر مصنّف کی رائے ہے کہ انگلشیہ حکمرانوں نے اُسے جرم کی سزا دینے کی بجائے لطف و کرم سے نوازہ ہے

کیا شاہ دہلی نے ایسا فساد ۔۔۔ رہے گی قیامت تلک جس کی یاد
ہوا سارا ہندوستاں پُر غدر ۔۔۔ کسی کی نہ باقی رہی کچھ قدر
کیا کیسا برباد ہر ایک کو ۔۔۔ رہے آپ اچھے یہ طرفہ سُنو
سزا جُرم کی کچھ نہ اون کے ہوئی ۔۔۔ جگہ ایک جزیرہ میں اون کو ملی
ملے گا اونہیں نان ولفقہ وہاں ۔۔۔ رہیں گے وہاں جیسے رہتے تھے یہاں
یہ انگلش بہادر کا اوصاف ہے ۔۔۔ یہ اس جُرم پہ بھی یہ الطاف ہے
کریں شکر خالق کا دل سے ادا ۔۔۔ دعاگو ہوں سرکار کا اب اللہ

مندرجہ ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی ۱۲۷۴ھ میں اختتام پذیر ہوئی تھی اور دو سال بعد ۱۲۷۶ھ میں شائع ہوئی۔

تھی بائیسویں ماہ ذیقعد کی ۔۔۔ کہ انجام پائی مری مثنوی
ہجری سن یک ہزار دو صد ۔۔۔ ہفتاد و چار است بے ردو کد

دراصل کشف البغاوت ایک رسالہ کا نام تھا جس کو خیر خواہانِ کمپنی نے بہت پسند کیا تھا ہے

ہے کشف البغاوت رسالہ کا نام ۔۔۔ ہوا خواہ پڑھ کر ہوئے شاد کام

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنّف اس سانحہ کا ایک کردار تھا جس نے نہ صرف چشم دید واقعات قلم بند کئے بلکہ اس سانحہ میں انگلشیہ کمپنی کی تن من دھن سے مدد بھی کی تھی۔ مثنوی کی تاریخی اہمیت مستند ہے۔ گورکھپور، اعظم گڈھ اور گرد و نواح کے اضلاع میں اس سانحہ کی بدولت جو اتھل پتھل مچی تھی اس کا ذکر تفصیل سے مصنّف نے کیا ہے۔ دوسری تاریخی کتابوں میں بہت کم ملتا ہے۔

مصنّف نے اپنے عہد کے رونگٹے کھڑے کرنے والے چشم دید واقعات نظم کئے ہیں۔

Marfat.com

مگر مثنوی میں کہیں بھی جوش و خروش نہیں پایا جاتا، نہ بلند آہنگی ہے، نہ شوکت الفاظ۔

نیپال اور گورروں کی فوج کا موازنہ کرتے ہوئے تشبیہ کی ندرت ملاحظہ ہو ؎

جو یہ رشکِ حور ہیں تو وہ رشکِ مہ　　　عدو میں وہ پلٹن ہے شب چاردہ

مثنوی کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے مگر کہیں کہیں فارسی زبان کی رنگ آمیزی و پیوند کاری بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ؎

پراگندگی آرد انبوہ را　　　دو دل یک شود بشکند کوہ را

## محبوب التاریخ

سید احمد شاہ نے یہ مثنوی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں تصنیف کی جس کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ بعد میں مصنف نے عنوان سبب تالیف قائم کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مصنف نے چند تاریخی کتابیں پڑھیں تو ان میں شہر گورکھپور کا کہیں بھی تذکرہ نہیں آیا۔ جس سے اس کا دل بہت مخطور ہوا۔ لیکن جونہی اسے ایک مستند تاریخ کا نسخہ دستیاب ہوا تو اس کو پیشِ نظر رکھ کر تاریخی واقعات بطور مثنوی نظم کئے، تاکہ دانشمند دوست، احباب حضرات ہندوستان کی تاریخ سے عام طور پر اور گورکھپور کی تاریخ سے خاص طور پر آگاہ ہوں۔ مصنف نے محبوب التاریخ میں ہندوستان کے اضلاع کے رقبہ جات وہاں کی تعداد افواج اور باج کی وصول یابی کی مقدار کا ذکر بھی کیا ہے۔

مثنوی میں دہلی کے راجاؤں اور شہنشاہوں کے نام کا آغاز سری کشن اور جدھشٹر سے کیا۔ اور تیمور کے حملے مغل بادشاہ بابر، اکبر، شاہجہاں اور اس کی اولاد کا اجمالاً ذکر کرتے ہوئے، انگلشیہ تاجر کمپنی کے تاریخی حالات نظم کئے ہیں۔ میر قاسم علی نواب بنگال کی انگریزوں سے لڑائی اور شکست کھا کر فرار ہونے اور میر جعفر علی کو نواب بنگال مقرر کئے جانے کے بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی کی اتحادی فوجوں کی شکست کھانے کا بھی اس مثنوی میں بیان ہے۔ نواب آصف الدولہ اور ٹیپو سلطان کا بھی اس میں ذکر ہے۔

اس کے بعد مصنف نے اصل موضوع اور مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے

Marfat.com

تفصیل سے شہر گورکھپور کا حال قلم بند کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک ہندو درویش گورکھ ناتھ جی کے نام پر اس شہر کی بنیاد پڑی۔ گورکھپور کا رقبہ اس کے محلّے اور محلّے کے مالکوں کے نام کے تذکرہ کے بعد وہاں عرصہ دراز سے سالار علی اور گورکھ ناتھ جی کے میلے جو بڑی دھوم دھام سے لوگ مناتے چلے آرہے تھے کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہاں کے عالی شان مکانات حاکموں کی کارگزاری اور راجہ ستاسی والی کشمیر کا تخت و تاج سے دست بردار ہو کر راجہ بنارس کے پاس آنا اور اس کی کوششوں سے ریاست گورکھپور کا راج گدی پانے کا ذکر ہے۔ مثنوی کا اختتام شہر کے رئیسوں کے تذکرے کے بعد حکایت پند و حکمت پر ہوتا ہے۔

"سببِ تالیف کتاب" کے مطالعہ سے مثنوی کی تالیف کے محرک اور اس کی وجوہات کا پتہ چلتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو راوی نے دیکھیں تواریخ چند — تو اس شہر کا ذکر لے ہوش مند
نہ پایا تو مخطور خاطر ہوا — بیاں اوس کا منظور خاطر ہوا
اور پھر سلطنت اور بندش کے ساتھ — لگا ذرِ تحقیق تب میرے ہاتھ
لکھا پھر تو میں نے بفضلِ الٰہ — اوسی سلسلہ ساتھ بے اشتباہ
کہ اربابِ دانش سب آگاہ ہوں — خبردار ازیں تا بہ ماہ ہوں

سیّد احمد علی کو جب ایک مستند تاریخ کا نسخہ دستیاب ہوا تو پھر اس کو پیشِ نظر رکھ کر سلسلہ وار سارے واقعات نظم کئے۔ تاکہ اہلِ دانش گورکھپور کی تاریخ سے آگاہ ہو سکیں۔ سیّد احمد علی نے مثنوی کی تقریباً ہر حکایت کا آغاز ساقی نامہ سے کیا ہے۔ تاریخی مضمون کے ساتھ ساقی نامہ کا تذکرہ بے جوڑ اور نامناسب ہے۔ ایک حکایت ملاحظہ ہو۔ "نواب بنگال میر قاسم علی نے گورنر سے درخواست کی کہ انگلشیہ محصول جو نواب کو دینا پڑتا ہے وہ ختم ہونا چاہیئے۔ چونکہ یہ درخواست کمپنی کے دستور کے خلاف تھی اس لئے اس پر غور نہیں ہوا۔ نواب میر قاسم نے اپنے مشیروں سے صلاح و مشورہ کیا نتیجہ کے طور پر میر قاسم علی نے انگریز سفیروں اور جگت سیٹھ جو انگریزوں کا مددگار تھا کو قید کر لیا۔

اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

Marfat.com

پلا مجھ کو ساقی شراب زلال ۔ کہ کرتا ہوں ذکر جدال و قتال
لکھا ہے یوں مورخ خیر باب نے ۔ کی درخواست محصول نواب نے
گورنر سے اس بات پر وہ اڑا ۔ کہ انگلشیہ محصول تم دو چھوڑا
طلب کی جو دستور کے برخلاف ۔ تو ان کو کہا یوں گورنر نے صاف
تلنگوں کی ایک کمپنی ساتھ لے ۔ وہ نواب صاحب کی جانب چلے
وہ گرگیں خاں تھا بڑا بے خرد ۔ نہ تھی بیوقوفی کی کچھ جس کی حد
لڑائی کی نواب کو دی صلاح ۔ مگر خوں بہانے کو جانا مباح
سفیروں کے زمرہ سے پھر ایک کو ۔ نہ چھوڑا کیا قید جو ہو سو ہو
بچے انگلشیہ جو کچھ قید سے ۔ چلے دام کو توڑ وہ صید سے
ہوئے سخت ناراض جی جان سے ۔ گئے سمت کلکتہ حیران سے
ادھر اب سنو تم کہ نواب نے ۔ رفیقوں نے اور اُن کے احبا نے
جگت سیٹھ کو کر لیا پھر اسیر ۔ کہ پہلے گورنر کا تھا دستگیر
وہی تھا مددگار انگریز کا ۔ دیا اُون کو تھا خرچ بھی جا بجا

میر قاسم علی کو اس سرکشی کی سزا دینے کے لئے انگلشیہ فوج نے نواب پر حملہ کیا۔ میر جعفر علی کو بھی ساتھ ملا لیا۔ میر قاسم علی بڑی جرأت سے لڑا مگر شکست کھا کر فرار ہو گیا ؎

ہوئی قلعہ پر حملہ آور فرنگ ۔ کیا فتح بس قلعہ کو بے درنگ
یہ قاسم علی نے وہ کی کارزار ۔ کہ نکلے وہ سب قلعہ سے ایکبار
لیا لوٹ کوٹھی کو بازار کو ۔ کہا انگلیشہ کو بس مار لو
پھر انگلشیوں نے یہ تدبیر کی ۔ کہ جعفر علی خاں کی توقیر کی
وہ جعفر علی قبل میں تھے نواب ۔ نظر بند ہوئے تھے زیر عتاب
تھا اقبال کا زور اون کے دلا ۔ کہ پھر صوبہ ملک اون کو ملا

۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی میں نواب شجاع الدولہ اور بادشاہ ہند شاہ عالم گورگانی کی اتحادی فوجوں کو شکست ہوئی۔ پھر اختصار سے نواب آصف الدولہ اور ٹیپو سلطان کے تذکرے کے

Marfat.com

بعد مصنف نے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے حکایت بنائے شہر گورکھپور کا عنوان قائم کیا۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ قدیم میں گورکھپور شہر کی بنیاد، گورکھ ناتھ ہندو درویش کے نام پر پڑی۔ مگر اس کی حالت شاہجہاں کے عہد میں ویران سنسان جنگل کی طرح تھی۔ شاہجہاں کے فرزند نے اس کو دوبارہ آباد کرانے کی کوشش کی۔ ؎

جو شاہجہاں والی ہند تھے بہر قابض وہ تا سندھ تھے
غرض اون کے فرزند بھی چار تھے دلاور جوانمرد و جرار تھے
معظم جو عظمت میں تھا نامور ہوا فتح یابی میں وہ کام ور
وہ دونوں برادر سے ایسا لڑا نشاں فتح کا اوس کے آخر گڑا
وہ کرتا ہوا سیر پہنچا یہاں ہوا خیمہ زن اس جگہ ناگہاں
جو دیکھا تو یہ شہر ویران ہے بیاباں ہی دشتِ میدان ہے
غرض اس کو آباد کرنے لگا نئی اینٹ پر اینٹ دھرنے لگا
گورکھپور کہنہ جو مشہور ہے تو اس طور سے اس کا مذکور ہے
سلف میں جو یہ کہنہ بنیاد تھا تو قریہ کی مانند یہ آباد تھا
گورکھ ناتھ یہاں ایک درویش تھا ہندوؤں کا وہ خیر اندیش تھا
بسایا اُسی نے یہ قریہ تمام اُسی سے گورکھپور ہوا اس کا نام

"حکایت میلا ہائے" کے تحت سالار غازی اور گورکھ ناتھ جی کے میلوں کا ذکر کیا ہے یہ میلے گورکھپور میں بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے ؎

اب ان میلوں کا تھوڑا سا لکھا ہوں حال جو اس شہر میں ہوتے ہیں سال سال
وہ سالار غازی کا میلا ہے عام کہ ہوتا ہے خلقت کا اک اژدھام
وہ رہتی ہے میلے کی دو روز دھوم کہ ہوتا ہے تماشائیوں کا ہجوم
گورکھ ناتھ ہے ایک جا گہ بڑی چڑھاتی ہیں واں جا کے سب کھچڑی
یہ ہوتا ہے میلہ وہ منگل کے روز ہے جنگل میں منگل وہ اے دل فروز

مگر خاص پھاگن میں ہوتی ہے دھوم   تماشائیوں کا ہر ایک سو ہجوم

گورکھپور کے مدرسوں کی حکایت کے بعد حکایت شہیداں کا عنوان قائم کیا ہے جس کے تحت وہاں کے مشہور شہیدوں کا اختصار سے مذکور ہے۔

ہیں جتنے شہیدان کامل یہاں   میں کرتا ہوں احوال ان کا بیاں
ہے نام اون کا مشہور غالب شہید   شہیدوں میں ہیں وہ بزرگ و رشید
مبارز خاں نامی نہیں دور میں   دکن شہر کے خوب مشہور ہیں
ہیں یہاں ماموں اور بھانجے بھی شہید   شہیدوں میں مشہور ہیں وہ سعید

"حکایت حکام" ہندوستان کے اوصاف اور ان کی کارگزاری کے بعد حکایت راجہ ستاسی کے تحت راجہ کشمیر کا حال لکھا ہے جو قسمت کا مارا تاج و تخت سے دست بردار ہو کر بنارس کے راجہ کے پاس آیا تھا جس کی بدولت اُسے ریاست گورکھپور کی راج گدی ملی۔ یہ ریاست بعد میں اس کے تین بیٹوں میں تقسیم ہوئی۔

کہا اس طرح اوس نے بندہ نواز   ہے گورکھپور ایک شہر دور دراز
یہ شہر ان کو دے دیجئے   وہ بے دخل ہے دخل کر لیجئے
کہ قابض ہیں اس شہر میں ڈوم کنار   وہ حاصل یہ دیتے نہیں زینہار
سُنا جب یہ احوال راجہ نے سب   کیا اُس کی باتوں کو منظور تب
غرض راج گورکھپور اس کو دیا   اوسے خاص راجہ یہیں کا کیا

حکایت ضلع و پرگنہ گورکھپور اور رئیساں شہر کے بعد حکایت پند و حکمت پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ آخری شعر ملاحظہ ہو۔

ہوا ختم یہ نسخۂ خوش نما   کروں سجدۂ شکر باری خدا

مندرجہ ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر کوئی نہ کوئی نثری تاریخ کا نسخہ رہا ہے، جس کو انہوں نے مثنوی کے انداز میں نظم کر کے پیش کیا ہے۔

اور پھر سلطنت اور بندش کے ساتھ   لگا دُرِ تحقیق تب میرے ہاتھ

Marfat.com

لکھا یوں ہے مؤرخ خبریاب نے ۔۔۔ کی درخواست محصول نواب نے
کہ سابق سے تاحال اے خوش رقم ۔۔۔ کیا ایک تاریخ داں نے ختم

مثنوی کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے مگر فارسی زبان کی رنگ آمیزی بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے ؎

یکم ماہ ذیقعد در یاد بود ۔۔۔ ہزار و صد و شش و ہفتاد بود
سن ہجری پاک رب الرشید ۔۔۔ پیام آنچہ مسترامت آورید
چو بشنید نواب پیغام آن ۔۔۔ شدہ مشورت جوزکرکیں خاں

مصنف نے مثنوی میں جہاں کہیں جنگی منظر کی مرقع نگاری کی ہے دہاں رزمیہ شان پیدا نہ ہو سکی۔ تاریخی اعتبار سے مثنوی کا درجہ بلند ہے۔ مصنف نے ریاست گورکھپور کی منظوم تاریخ پیش کر کے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔

Marfat.com

# تمنا

منشی کاشی رام سہائے نام، تمنا تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے جن کا رئیس گھرانے سے تعلق تھا۔ والد کا نام منشی پورن چند تھا۔ کاشی رام کے دادا ایشری پرشاد بھی شاعر تھے۔ جن کا تخلص سماعی تھا۔ تمنا کی زندگی کے حالات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ تمنا کی ایک تاریخی مثنوی موسوم بہ "یادگارِ بھوپال" ہے، جو کہ نومبر ۱۸۷۷ء میں مطابق ۱۲۹۴ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ مختصر مثنوی صرف چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کے درج ذیل شعر سے سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے ؎

بادہ افتخار قدر نظم        ہوئی مرغوب خوب صدر نظم

## یادگار بھوپال

تمنا نے یہ مختصر مثنوی صرف ایک دن میں لکھی تھی جس کی تصدیق مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے ؎

نہایت مختصر یہ مثنوی ہے        بس اک دن میں بصد عجلت لکھی ہے
ادھر ماہ صیام اے دل ہے روشن        ہیں ہجری بارہ سو چورانوے سن

تمنا نے یہ مثنوی ۱۸۷۷ء عید کے دن نواب شاہ جہاں بیگم والیٔ بھوپال کی خدمت میں پیش کی۔ مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ذکر شہر بھوپال" ایک عنوان قائم کیا ہے جس سے شہر بھوپال کی فلک بوس پختہ عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ اور بھوپال شہر کو روئے زمین پر بہشت قرار دیا ہے پھر مجموعی طور پر "آغاز حال فرصت اشتمال ریاست بھوپال" کے عنوان کے تحت ریاست بھوپال کی تاریخ اختصار کے ساتھ نظم کی ہے۔ جس کا مختصر پلاٹ اس طرح ہے۔ شاہ عالمگیر کے عہدِ حکومت میں دوست محمد خاں بھوپال کے قریب ضلع برسیا کا حاکم تھا۔ جب عالمگیر کا انتقال ہوا تو ملک میں بے چینی دابتری پھیل گئی۔ دوست محمد خاں کی ہوس ملک گیری نے شہر بھوپال پر قبضہ کر لیا اور نواب

Marfat.com

بھوپال کہلائے۔ ۱۷۲۸ء میں جب دوست محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کے بعد اس خاندان کی دو پشت تک بہترین طریقہ سے ریاست بھوپال پر حکمرانی ہوتی رہی جس کے تحت ریاست بھوپال نے بہت ترقی کی۔ ریاست بھوپال کی ترقی و خوش حالی مرہٹوں کو ایک آنکھ نہیں بھائی وہ ہر وقت اس موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح ریاست بھوپال ان کے قبضہ میں آجائے۔ آخر کار مرہٹوں کے پیشوا نے حیات محمد خان کے عہد میں بھوپال پر حملہ کیا اور کچھ حصہ ریاست کا اپنے قبضہ میں کر لیا۔ وزیر محمد خاں رئیس، نواب بھوپال کے رشتے دار تھے۔ بھوپال کی آئے دن بگڑتی حالت ان سے نہیں دیکھی گئی۔ جب وہ نواب بھوپال بنے تو سندھیا اور ہولکر نے اتحاد کر کے وزیر محمد پر حملہ کر دیا۔ وزیر محمد خاں نے بھاگ کر بھوپال شہر میں پناہ لی۔ اتحادی فوجوں نے شہر بھوپال کا محاصرہ کر لیا اور نو ماہ تک لڑائی ہوتی رہی آخر کار اتحادی فوجیوں کو شکست ہوئی۔ وزیر محمد کے عہد میں رعایا اور اہل پیشہ خوش حال تھے۔ ۱۸۱۶ء میں وزیر محمد کا انتقال ہوا، اس کا بیٹا نظر نواب بنا جس کی رئیس وقت نواب غوث محمد کی صاحبزادی قدسیہ بیگم سے شادی ہوئی جس کے بطن سے سکندر بیگم پیدا ہوئیں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد سکندر بیگم نواب بھوپال بنیں اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر حکومت کی۔ برٹش کمپنی کی حکومت سے پوری وفاداری نبھانے کی بنا پر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزی سرکار نے بڑی قدر و منزلت سے اُسے نوازا۔ سکندر بیگم نے ریاست کی ازسرِ نو پیمائش کروائی۔ محکمہ زراعت کی طرف توجہ دی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اناج کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ جب دربار منعقد ہوا ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کی بجائے شہنشاہیت قائم ہوئی تو نواب بھوپال سکندر بیگم بھی دربار میں مدعو ہوئیں۔ گورنر جنرل نے انہیں نیک نامی کا تمغہ عطا کیا۔ ۱۸۶۸ء میں سکندر بیگم اللہ کو پیاری ہوئیں تو اُن کی دختر نیک اختر شاہجہاں بیگم بھوپال کی گدی پر رونق افروز ہوئیں۔ بیگم شاہ جہاں نہ صرف شمشیر زنی میں کمال رکھتی تھیں بلکہ علم نواز، سخن سنج، و سخن داں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں رعایا پرور، غریبوں پر مہربان تھیں۔ سلطنت کا انتظام کچھ اس طرح سے انجام دیا کرتی تھیں کہ کسی کو شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ مثنوی کا خاتمہ دعائیہ پر ہے۔ شاہ جہاں بیگم کی تعریف اور ریاست کی بقا کی خواہش

Marfat.com

ظاہر کی ہے۔ مثنوی کے خاتمہ کے بعد ایک اور عنوان شکریہ بحضور بندگان جناب عالیہ متعالیہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال دام اقبالہٗ میں بیگم کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

ذکر "شہر بھوپال" کے تحت بھوپال کی تعریف میں چند اشعار ملاحظہ ہوں مصنف نے سرزمین بھوپال کو فردوس کا درجہ دیا ہے ؎

یہ ہے ہندوستاں میں ملک آباد — خزاں سے یہ چمن رہتا ہے آزاد
بہار اس پہ سدا رہتی ہے قرباں — خزاں کا بھٹ گیا ہے ساز و ساماں
نہ غنچہ بے کلی سے کچھ ہے غمناک — نہ غم سے دامان گل ہے یہاں چاک
عمارت اس میں ہے ایک ایک نامی — ہے جن کی پختگی میں ذکر خامی
مکاں اونچا اگر دیکھو نظر سے — مثل سچ ہو گرے دستار سر سے
غرض ہر اک مکاں ہے لائق دید — مکیں کی اوس سے بر آتی ہے اُمید
تمنا اب نہ کر یہ داستاں طول — صفت میں اس کے پڑھ یہ شعر مقبول
اگر فردوس بر روئے زمیں است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مجموعی طور پر ایک عنوان "آغاز فرصت اشتمال ریاست بھوپال" قائم کیا ہے جس میں اختصار کے ساتھ بھوپال کی تاریخ عہد محمد دوست خاں افغان ملازم شاہ عالمگیر سے لے کر شاہ جہاں بیگم تک تقریباً پونے دو صدی کا حال بیان کیا ہے۔ جب مغل شہنشاہ ہند شاہ عالمگیر کا انتقال ہوا تو ملک میں ابتری پھیل گئی۔ ہر صوبہ کا سردار خود سری پر اتر آیا اور آہستہ آہستہ اپنی ریاست میں خود مختار نواب بن بیٹھا۔ ریاست بھوپال میں بھی دوست محمد خاں افغان نواب بن بیٹھا۔

محمد دوست خاں افغاں تھا جو ایک — دہی قابض یہاں تھا باول نیک
یہ افغاں صاحب ذہن و ذکا تھا — ملازم شاہ عالمگیر کا تھا
جو عالمگیر شاہِ عالم آرا — اونہیں روزوں میں جنت کو سدھارا
ہوئی پھر ابتری میں حالت ہند — تغیر ہو گئی سب صورت ہند
محمد دوست خاں نے از سر ہوش — کیا بھوپال پر قبضہ بصد شوق

Marfat.com

ملا جب خود سری کا ان کو اسباب　　ہوئے بھوپال کے مشہور نواب

نشاں مجھے جب یہ سال عیسوی کے　　ہزار ہفت صد پر بیست دسہ تھے

سنہ ۱۷۴۲ء میں محمد دوست کا انتقال ہو گیا اس کے بعد دو پشت تک بہت اچھی طرح سے حکومت ہوتی رہی مرہٹوں کے پیشوا نے بغیر لڑائی کے چالاکی سے ریاست کا کچھ حصہ اپنی حکومت میں ملا لیا۔ مرہٹوں اور نواب بھوپال کے مابین صلح نامہ ہوا جس کی رو سے باقی ریاست نواب بھوپال کے پاس رہی۔

مرہٹوں کا جو واں پر پیشوا تھا　　ارادہ اُس نے یہ ظاہر کیا تھا

ملے بھوپال کی مجھ کو ریاست　　عیاں ہو جس میں کچھ کار فراست

نہ لڑنے کا کسی سے وقت آئے　　فقط تدبیر ہی مطلب دکھائے

غرض قبضہ کیا کچھ سر زمیں پر　　مگر یہ عہد بھی لکھا دہیں پر

جو باقی ہے ریاست کی نشانی　　کریں نواب یاں کی حکمرانی

ریاست کی آئے روز دگر گوں حالت ہوتی جا رہی تھی۔ مرہٹہ ریشہ دوانیاں کرتے رہتے تھے آخر کار رئیس وزیر محمد خاں جو نواب بھوپال کے رشتہ دار تھے مرہٹوں سے لوہا لینے کی ٹھانی وزیر محمد خاں جونہی نواب بھوپال بنے تو مرہٹوں کے زور کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ؎

اسی صورت غرض گزرے بہت روز　　رہا بھوپال میں رنج و غم و سوز

غرض نواب سابق کی تحریر ایک　　گئے بھوپال میں پھر بادلِ نیک

وزیر اوّل محمد بعد سمجھو　　اسی صورت و نامِ سعید سمجھو

بڑا ذی ہوش تھا یہ مردِ عاقل　　جوانمرد و عقیلِ دہر و عادل

جو اس نے یاں کا ابتر حال دیکھا　　تاسف سے سوئے بھوپال دیکھا

دلیری سے مرہٹوں کو نکالا　　بلائے سخت کو اک دم میں ٹالا

کیا قبضے میں اپنے ملک سابق　　حکومت کی زمانے کے موافق !!

جو گزرے سال پھر دو تین یونہی　　ہوا پھر سندھیا سرکش بصد کیں

رہی نو ماہ تک تو اس طرح کی بات　　پھر آخر ادن مرہٹوں کو ہوا مات

Marfat.com

| | |
|---|---|
| غرض اوس دم سے آسودہ ہے بھوپال | خدا کا فضل ہے بس شامل حال |

حقیقت یہ ہے کہ نو ماہ کے محاصرہ کے دوران بھوپال کی عورتوں نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑائی میں حصّہ لیا اور مرہٹوں کی فوج کے حوصلے پست کرنے میں معاون ثابت ہوئیں نواب قدسیہ بیگم کا بیان ہے:-

"ایک دن پیرزادے کی حفاظت کرتے ہوئے معظّم محمد خاں ابن رئیس محمد غوث خاں زخمی ہو کر بیہوش ہو گئے جیسے ہی اوس کی خبر زینت بیگم[1] کو ہوئی وہ موقعہ پر پہنچ گئیں اور چاند بی بی کی طرح انہوں نے تلوار لے کر بیٹھنے کی بجائے خود فوج کی کمان اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی اور دو گھنٹے تک فوج کو لڑاتی رہیں۔"[2] تاریخ بیگمات ص ۳۲

ایک اور جگہ سرجان مالکم لکھتے ہیں:-

"دشمن کے داخلے سے خوفزدہ ہو کر تمام عورتیں مکانات کی چھتوں پر چڑھ گئیں، وہاں سے دشمن پر کھپڑے کنکر پتھر کی بوچھاڑ کر دی جنگجو عورتوں کے اس غیر متوقع حملے سے دشمن نے پریشان ہو کر اپنا جھنڈا نیچے کر دیا۔"[3] مالکم سینٹرل انڈیا ص ۳۲

۱۲۳۱ھ میں وزیر محمد کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا نظر محمد نواب بنا جس کی شادی قدسیہ بیگم سے ہوئی جب نظر محمد کا انتقال ہوا تو اس کی دختر نیک اختر سکندر بیگم نواب بھوپال نہیں اپنے والد کے طرز پر حکومت کی ؎

| | |
|---|---|
| پدر کے وقت کا دستور رکھا | سبھوں کو فیض سے مسرور رکھا |
| یہ بیگم تھیں نہایت عاقل دہر | کیا کرتی تھیں اکثر دورِ شہر |
| وہ کرتیں انتظام ملک خود روز | بڑھا تیں احتشام ملک خود روز |

---

[1] زینت بیگم نواب قدسیہ بیگم کی والدہ اور رئیس وقت نواب غوث محمد خاں کی بیگم تھیں۔

[2] بحوالہ رضوی سلیم حامد، اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ۔ پریس علوی پریس بھوپال پرنس ایشیا۔ جنوری ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۱-۳۲

[3] بحوالہ رضوی سلیم حامد، اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصّہ پریس علوی پریس بھوپال پرنس ایشیا جنوری ۱۹۶۵ء ص ۳۲

Marfat.com

سکندر بیگم کے دورِ حکومت میں ریاستی زمین کی از سرِ نو پیمائش ہوئی۔ زراعت کو ترقی ہوئی ؎

ہوئی بس حکم سے پیمائشِ ملک | ہے پیدا جس سے اب آسائشِ ملک
جو محلّے کی تھی آمد و رفت مسدود | اُسے جاری کیا باطرزِ مسعود

شاہ جہاں بیگم کی تعریف ملاحظہ ہو ؎

یہ ہیں شمشیر زنِ جانِ شجاعت | یہی ہیں مردِ میدانِ شجاعت
یہ عورت ہیں مگر عاقل ہیں از بس | سخن داں ہیں سخن سنج و سخن رس
رعایا پر رعایت ہے ہمیشہ | غریبوں پر عنایت ہے ہمیشہ

چونکہ بیگم بھوپال ایک اچھی سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک تھیں انگریزی حکومت سے استوار رشتہ بنائے رکھا ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد ہندوستان پر انگریزی شہنشاہیت قائم ہوئی تو دہلی میں دربار منعقد ہوا۔ نواب بھوپال دربار میں شرکت کرنے کے لئے مدعو ہوئیں۔ گورنر جنرل نے انھیں نیک نامہ کا تمغہ عطا کیا۔ مثنوی کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ مصنف کا مقصد بھوپال کی تاریخ کو اختصار سے پیش کرنا تھا جس میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہوا تاریخی اعتبار سے مثنوی کا پایہ بلند ہے جس کے مطالعہ سے بھوپال کی تاریخ کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے ؎

تمنّا اب نہ کر یہ داستاں طول | بیاں سب ہو چکا ہے ذکر معقول
برائے یادگارِ شہرِ بھوپال | بطرزِ مختصر موزوں کیا حال
نہ کی کچھ شاعری میں نکتہ دانی | نہ پائی لذتِ شیریں بیانی

اس عہد میں یہ مثنوی اہلِ کمال نے بہت پسند کی مثنوی کا اختتام دعائیہ پر ہے ؎

الٰہی حکمرانِ ملک بھوپال | اسی حشمت سے دیکھیں عید ہر سال
بہ فضلِ حق رہے دائم یہ اقبال | ریاست کا رہے قائم یہ اقبال
ہمیشہ شادمانی سے بسر ہو | خوشی کا سامنا شام و سحر ہو
دعا پر ختم بس یہ مثنوی ہے | فقط تاریخ سال آگے لکھی ہے

کاشی رام سہائے تمنّا نے مثنوی کے اختتام پر نواب شاہجہاں بیگم کا منظوم شکریہ بھی مثنوی کے انداز میں کیا ہے۔

Marfat.com

# اختر

سلطان واجد علی شاہ جان عالم کا تخلص اختر تھا۔ صوبہ اودھ کے آخری تاجدار ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں انتقال ہوا۔ اپنے والد امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء/۱۲۶۳ھ میں تخت نشین ہوئے۔ فروری ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ تک حکومت کی۔ بادشاہت صرف نام کی تھی۔ امورِ سلطنت انتظامِ سلطنت وزیر علی نقی کے سپرد تھا۔ جن کی لاپرواہی ہی سے صوبہ اودھ کے عوام پریشان حال تھے۔ موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے شیدائی علمی ادبی ذوق نے جان عالم کو ملکی انتظام کا موقعہ بہت کم دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے کرنیل سلیمن اور پھر جرنیل اوٹرم صاحب نے گورنر جنرل ڈلہوزی کو مشورہ دیا کہ صوبۂ اودھ کی فلاح و بہبود کا کل انتظام کمپنی اپنے ہاتھ میں لے لے تاکہ ملکی انتظام درست ہو اور عوام کو سکون حاصل ہو۔ چونکہ لارڈ ڈلہوزی صوبۂ اودھ میں برائے نام بادشاہت کو قائم رکھنے اور دیوانی فوجداری و سپاہ کے انتظام کمپنی کے دائرہ اختیارات میں لینے کے حق میں تھے۔ اس نے کمپنی کے ڈائرکٹرز کو اپنے مشورے سے آگاہ کیا۔ جب ڈائرکٹرز نے صوبے کے انتظامات اپنی تحویل میں لینے اور بادشاہت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو واجد علی شاہ اختر کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔

واجد علی شاہ اختر کی تصانیف کے بارے میں مولوی نجم الغنی نے تاریخ اودھ حصہ پنجم میں لکھا ہے

"ان کے متعدد دیوان، مرثیے، سلام اور مختلف بے شمار نظمیں دیکھ کر ہر شخص یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ سلطان ہر وقت ہر لحظہ اسی فکر میں رہتے ہے"[1]

نواب وزیر علی خاں نے وزیر نامہ میں[2] ان کی تصانیف کی تعداد "چالیس" لکھی ہے۔ ان بیانات سے جان عالم واجد علی شاہ اختر کے فطری رجحان کا پتہ چلتا ہے نظم نثر دونوں

---

[1] مولوی نجم الغنی تاریخ اودھ۔ حصہ پنجم۔ ص ۱۱۵

[2] وزیر علی خاں وزیر نامہ، بحوالہ تاریخ اودھ۔ حصہ پنجم ص ۱۱۵

Marfat.com

میں اس درجہ کمال رکھتے تھے کہ قلم برداشتہ برجستہ لکھتے چلے جاتے تھے اس لئے تصانیف میں کہیں کہیں لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں۔ گیان چند جین[1] نے واجد علی شاہ کی مثنویوں کی تعداد نو بتائی ہے۔ مگر ہمارے موضوع سے متعلق صرف ایک مثنوی "حزن اختر" ہے جس کا اجمالاً تعارف یوں ہے۔

**حزن اختر** اس مثنوی میں معزولی سلطنت کی داستان، قید کی تکلیفیں۔ بیت الخلا کی گندگی اور مچھروں کی ایذا رسانی کے ساتھ داروغہ قید خانہ کرنل کو نیا کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ جنہوں نے تمام مجبوریوں کے باوجود شاہِ اودھ کو ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ معزول ہوکر کلکتہ پہنچے اور بحالی کا پروانہ راہ داری حاصل کرنا اور اچانک بیمار پڑ جانا اپنی والدہ محترمہ ملکہ کشور اور بھائی مرزا سکندر حشمت اور ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد علی بہادر کو اس کام کے انجام دینے کے لئے لندن بھیجنے کا حال بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قید خانہ میں ایک سال بیمار رہنے کے بعد غسلِ صحت کے موقعہ پر جشن بھی دیرینہ آن بان سے منایا گیا۔ غدر کے ہنگامہ میں واجد علی شاہ کو انگریزی حکومت نے مٹیا برج سے فورٹ ولیم میں منتقل کر دیا۔ یہاں کی کڑی نگرانی، محلات کی جدائی اور ان کی بے وفائی، والدہ اور بھائی کے انتقال کی خبر، شہزادیوں کا لکھنؤ میں کس مپرسی کی حالت میں دن گزارنے کے حالات نے نہ صرف مصنّف کو غمزدہ بنا دیا، بلکہ اپنے عہد کی ثروت و جاہ و جلال کے ایام کی یاد کے علاوہ عہدِ پیری کی اتفاقیہ مصیبت نے نڈھال کر دیا تھا۔ مثنوی میں مذکورہ بالا تمام واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثنوی کے اختتام پر قید خانہ کی تکلیف سے نجات پانے کی دُعا مانگی ہے۔ شررؔ کا کہنا بجا ہے کہ مصنّف نے اپنے مختصر حالات کو جس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کے باقی ماندہ حالات کو اس خوبی سے پیش کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔

---

[1] جین ڈاکٹر گیان چند "اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ۔ طبع اوّل۔ ص ۵۴۷

Marfat.com

قدماء کی طرح مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ جو صرف تین اشعار پر مبنی ہے اس کے بعد چار اشعار نعتیہ ہیں پھر منقبت کے بعد شاعر نے ضمنی عنوان "ساقی نامہ و احوال مصنّف در قید خانہ" قائم کیا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ولا بعد حمد اور نعتِ رسولؐ　　پس از منقبت لکھ تو اب یہ اصول
پلا ساقیا وہ مئے سُرخ رنگ　　کہ ہو نشہ سے جس کے دل میں اُمنگ
اکیلا ہے زنداں میں اک مے پرست　　شب و روز ہے محوِ روزِ الست
مہینوں سے ہے طالبِ وصلِ یار　　نہ زنداں میں پہنچی نسیمِ بہار
نہ آتی ہے جاں نہ نکلتا ہے دم　　حجر ہو گئی رنج سے چشمِ نم
ہوا بھی جو آتی ہے تو سہم گئیں　　نہ یار و نہ مونس نہ کوئی قریں
رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے　　سبھوں نے کنوئیں میں دھکیلا مجھے
عیال اور اطفال لوٹے گئے　　جہاں میں مرے لال لوٹے گئے
جگر جل گیا گرمیٔ رنج سے　　تنفر ہوا ایک عالم گنج سے
نمی تک نہیں نام کو آنکھ میں　　نہ نیند آتی ہے شام کو آنکھ میں

پیری میں جوانی کی یاد آتی ہے تو اس کا ماتم ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب　　نہ زلفوں میں بل ہے نہ وہ پیچ و تاب
نہ چہرے کا وہ ڈھب نہ وہ حل کا کمال　　ہر اک بال ہے جان و تن کو وبال
ہر انگلی کا عالم ہے جیسے قلم　　دیا تار مسطر سے ہے وہ بہم
وہ پنجہ جو تھا پنجۂ شاہیار　　شعر کے خط کی طرح ہے دراز
رگیں اس طرح اس پہ ظاہر ہوئیں　　رگِ گل کی صورت سے باہر ہوئیں
یہ گالوں کا عالم ہے اے خوش خصال　　ہوئے بدرِ کامل سے گھٹ کر ہلال
وہ سینہ جو تھا تختۂ نور سا　　وہ مکھڑا جو تھا خوشنما حور سا

ان اشعار سے نسوانیت کی بو آتی ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جان عالم پر نسوانی اثر کس قدر غالب تھا مگر تشبیہات کی ندرت قابلِ غور ہے۔

Marfat.com

جان عالم اختر نے معزولی کی داستان اور وطن سے ہجرت کے واقعہ سے پیشتر جو چند اشعار تمہید یہ نظم کئے ہیں قابل غور ہیں اپنے دل سے مخاطب ہیں ؎

وہ قصہ سُنا جو سراسر ہو سچ — خود اپنی طرف ہو نہ غیروں کی پچ
وہ قصہ سنا جو گواہی رہے — فقیری میں بھی بادشاہی رہے
وہ قصہ سُنا جو بہت ٹھیک ہو — ذرا بھی نہ پھر اس میں تشکیک ہو

اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جان عالم نے جو کچھ بھی اپنے تاریخی واقعات کے متعلق اس مثنوی میں تحریر کیا ہے وہ حقائق پر مبنی ہے۔ غدر کے ہنگامے اور اُس کے سبب کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

کہ بلوائی کچھ جمع ہونے لگے — وہ لکھا مقدر کا دھونے لگے
ہوئی خوب برگشتہ انگریزی فوج — کہ امڈی ہے جس طرح دریائی موج
سبب اس کا ہم نے تو تھا یہ سُنا — کہ کچھ کارتوسوں پہ قصہ ہوا
وہ تھے گائے کے چرم کے کارتوس — اُسی پہ ہوئی تھی یہ بانگِ خروس

غدر کا سبب شاعر نے گائے کے چمڑے کے کارتوس کو بتایا ہے مگر سور کی چربی کے کارتوس کا ذکر نہیں کیا غالباً اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں نے بلوا کیا۔ لیکن ایسا نہیں تھا ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر یک جہتی کا ثبوت دیا اور ایک قوم ہو کر انگریزوں کے خلاف شانہ بشانہ لڑے۔ مثنوی کے خاتمہ سے چار چھ صفحات پیشتر یہ اشعار پائے جاتے ہیں ؎

بارہ سو پر تھے چوہتر جو سن — اُسی سن میں پہنچے یہ رنج و محن
جو تاریخ تک آج کی اُٹھ چکا — وہ سب شِلِ اخبار میں نے لکھا

جو اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مثنوی سنہ ۱۲۷۴ھ میں تصنیف ہوئی اس سے اگلے سال قید خانے سے نجات حاصل ہوئی اور مٹیا برج میں دوبارہ داخل ہوئے سنہ ۱۲۷۵ھ میں جان عالم نے محمد حسین صاحب کے اہتمام سے مطبع سلطانی سے یہ مثنوی شائع کروائی۔ جو درباریوں اور مصاحبوں میں تقسیم ہوئی شاہی کاتب نے قطعہ تاریخ کہا جس کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے ؎

Marfat.com

"گفتمش تاریخ حزنِ اختری" جو ٹھیک نہیں۔ ۱۲۷۶

اس مصرع سے وزیر نامے کے مؤلف نے وزیر نامے میں اور ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے "تاریخ اُردو ادب" میں مثنوی کا نام "حزنِ اختری" لکھا ہے مرحوم عبدالحلیم شرر نے مقدمہ حزن اختر میں لکھا ہے :۔

"یہ مثنوی آج سے ۶۵ برس پیشتر ۱۲۶۶ھ جبکہ بادشاہ قیدِ فرنگ میں تھے تصنیف ہوئی اور اس کے کئی سال بعد ۱۲۷۶ھ میں ظل اللہ جہاں پناہ کے مطبع واقع مٹیا برج سے چھپ کر اہلِ دربار میں اور ملازمین میں تقسیم ہوئی۔"

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "اردو مثنوی شمالی ہند میں" شرر کے متذکرہ بالا بیان پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واجد علی شاہ کا سنِ اسیری ۱۲۶۶ھ بتایا ہے۔ شرر نے سنہ مذکورہ واجد علی شاہ سنِ اسیری نہیں بلکہ سنہ تصنیف (حزنِ اختر) لکھا ہے۔ دوم ۱۲۶۶ھ لکھنا شرر کے لغزش قلم کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ سہوِ کاتب ہے کیونکہ شرر نے مقدمہ میں صاف صاف لکھا ہے کہ یہ مثنوی آج سے پینسٹھ برس پیشتر تصنیف ہوئی۔ چونکہ شرر نے یہ مثنوی ۱۹۲۲ء میں مع اپنے مقدمہ کے شائع کی اس لئے اگر ۱۹۲۲ء سے پینسٹھ برس نفی کر دیئے جائیں تو ۱۸۵۷ء ۱۲۷۴ھ نکلتا ہے جو مثنوی کا صحیح سنہ تصنیف ہے اور یہ اس کے دو سال بعد پہلی بار شائع ہوئی۔

مثنوی کی ادبی اہمیت تو اتنی نہیں تاہم سوانحی اور تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے اس میں جتنے سنہ نظم ہوئے وہ بھی تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں اور جن جن اشخاص کا نام ملتا ہے چاہے وہ واجد علی شاہ کے مصاحبین ہوں، ملازم ہوں یا محلات ہوں وہ بھی ٹھیک ہیں اور تاریخ اودھ سے ان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی واقعات تاریخی ہیں اور آخر میں سوانحی رنگ زیادہ چڑھا ہوا ہے۔ بیچ بیچ میں جہاں محلات کا ذکر آیا ہے وہاں جانِ عالم کی عیاشی طبیعت کا راز کھل جاتا ہے۔

Marfat.com

# حیدر

غلام حیدر نام۔ حیدر تخلص تھا۔ قصبہ گوپامئو ضلع ہردوئی اودھ کے رہنے والے تھے۔ قاضی مبارک شارح غلام حیدر کے جدِ اعلیٰ تھے۔ غلام حیدر کا گلدستۂ شجاعت موسوم بہ "اُردو سکندر نامہ" حضرت خواجہ گنجوی کے فارسی منظوم سکندر نامہ بحری و برّی کا اُردو منظوم تلخیصی ترجمہ ہے۔ جو دوسری بار ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔

غلام حیدر کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ حیدر نے اردو سکندر نامہ میں بھی اپنے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں۔ صرف اتنا پتہ پتہ چلتا ہے کہ مثنوی سکندر نامہ کی تصنیف کے وقت گوپامئو میں سکونت پذیر تھے۔ سبب تحریر ترجمہ سکندر نامہ برّی میں فرماتے ہیں ؎

میرا نام ہے حیدر خام خو — اس عاصی کا مسکن ہے گوپامئو
کبھی علم کا جس کو کہتے ہیں جائے — مگر وائے اے گردشِ چرخ وائے
کیا تو نے در جہالت اُسے — پُر از کاروبار لطافت اُسے
ہوئی مستزاد اس پہ ضیق معاش — رہی ہر کسی کو اُسی کی تلاش

**اُردو سکندر نامہ**

غلام حیدر نے اُردو سکندر نامہ کی ابتدا حمد و نعت اور مناجات سے کی، چونکہ حیدر نے خواجہ گنجوی کے فارسی سکندر نامہ بحری و برّی کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اس لئے اس کی زبان مفرس ہے عنوانات اُردو، فارسی نثر میں ہیں۔ مصنف نے سکندر نامہ میں تبت اور روس فتوحات کا بھی ذکر کیا ہے۔ روس کی فتح کے بعد سکندر نامہ برّی کا پہلا حصہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سکندر نامہ بحری کے دوسرے حصہ کا آغاز ہوتا ہے۔ "داستان مفصل سکندر ذوالقرن بادشاہ روم" کے عنوان کے چند اشعار

Marfat.com

ملاحظہ ہوں ؎

گذارندۂ نامۂ خسرواں    لکھے ہے سکندر کی یوں داستاں

کہ تھا روم کے ملک میں ایک شاہ    وہ تھا صاحب دولت و تخت و جاہ

لکھا ہے نام اس کا تھا فیلقوس    اطاعت میں تھے اُس کی روم و روس

مگر ملک یونان تھا اُس کا مقر    بمقدونیہ خاص تھا اُس کا گھر

عدالت کا تھا اس قدر پایہ بلند    کہ بے خوف تھی گرگ سے گوسفند

مندرجہ بالا اشعار سے یونان کے ملک بادشاہ فیلقوس کی عدالت کا پایہ کس مرتبہ کا تھا کا پتہ نہیں چلتا ہے مثنوی سکندر نامہ کی زبان قدیم مفرس ہے مگر تسلسل و روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ رزمیہ مثنویوں میں شکوہ الفاظ اور منظر نگاری مثنوی کے پایہ کو بلند کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مثنوی کمزور نہیں ہے۔ چند اشعار بعنوان "جانا سکندر کا طرف ہندوستان کے بجانب کید ہندو" کے ملاحظہ ہوں ؎

کہ ایراں ہوا جب کہ زیر نگیں    تو ہے سیر ہندوستاں دلنشیں

کروں کید ہندو سے جا کر ستیز    وہ آوے میرے پاس یا لے گریز

جو ہووے اوروں کے منقاد وہ    تو ہو قہر سے میرے آزاد وہ

اگر مجھ سے وہ جنگ جوئی کرے    تو خود اپنی بے آبروئی کرے

اِدھر سے اُدھر کو پھراؤں اُسے    وہ بیٹھے جہاں میں بٹھاؤں اُسے

سکندر نامہ بری کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں، جن سے نوشابہ کی رہائی کا پتہ چلتا ہے ؎

کیا شاہ قنطال نے پھر خطاب    کہ نوشابہ کو وہ منگا دے شتاب

مع خادماں غنیمت شدہ    مع سازو سامان غارت شدہ

بفرمودۂ شاہ گیتی ستاں    ہوئی وہ پری جلد حاضر وہاں

سکندر اُسے دیکھ شاداں ہوا    چوں گل باد عشرت سے خندہ ہوا

کیا شہ نے پھر اس کو آراستہ    بہ پوشید نمائے پیراستہ

دیا گنج وافر و تاراج روس    کیا اس کو زیبا برنگ عروس

سکندر نامہ بری کے بعد دوسرا حصہ سکندر نامہ بحری کی ابتدا ہوتی ہے۔

# قدیم رنگ کی مثنویوں کا آخری دور

غدر کے ہنگامے کے بعد جب ایک طرف اُردو مثنوی کا قدیم رنگ بدل رہا تھا تو دوسری طرف جدید رنگ کی مثنویوں کی روایت مقبول ہو رہی تھی۔ قدیم رنگ کی مثنویوں نے تقریباً تین چار دہائی کی کشمکش کے بعد کہیں جاکر جدید رنگ کی مثنویوں کے لئے میدان خالی کیا۔ اس آویزش میں جو مثنوی نگار روایت پرستی پر قائم رہے ان میں قابلِ ذکر امیراللہ تسلیم، امیر مینائی، داغ دہلوی اور طوطارام شایاں وغیرہ تھے۔ علاوہ ان کے کچھ اور شعراء حضرات مثلاً بہار میں شاد عظیم آبادی۔ پنجاب میں برج نرائن ناظم نے بھی مثنویاں لکھیں۔ نیز کچھ شعراء نے نثری تاریخی کتابوں کو پیش نظر رکھ کر منظوم تاریخی مثنویاں لکھی ہیں۔ جن کا مقصد اپنی قوم کے کم تعلیم یافتہ بچوں کو اپنی ابتدائی تاریخ سے اچھی طرح واقف کرانا تھا۔

## تسلیم

احمد حسین نام عرف امیراللہ کا تخلص تسلیم تھا۔ اس نے طویل عمر پائی۔ ان کے مفصل حالات زندگی تعلیم و تربیت علمی و ادبی کارنامے اور دربارِ رام پور کی ملازمت کے بارے میں ان کے شاگرد رشید عرش گیاوی نے "حیات تسلیم" اور حسرت موہانی نے "رسالہ اُردوئے معلیٰ" جولائی ۱۹۱۱ء میں لکھے ہیں۔

امیراللہ تسلیم کے والد کا نام مولوی عبدالصمد تھا۔ تسلیم ۱۲۳۵ھ موضع منگلیسی ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، عربی کی تعلیم اپنے بھائی مولوی عبداللطیف سے پائی۔ انہوں نے فن خوش نویسی مولوی عبدالحی سندیلوی سے سیکھا۔ تسلیم فن خوش نویسی میں روش خاص کے مالک تھے اور شعر و شاعری میں نسیم کے شاگرد تھے۔

Marfat.com

تسلیم کے والد بڑے جاگیردار تھے مگر زمانے کی گردش کے ہاتھوں جاگیر جاتی رہی تلاش معاش میں پہلے فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ پہنچے۔ محمد علی بادشاہ کے ملازم ہو گئے۔ تسلیم نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد رامپور کا سفر کیا' جہاں شہزادہ مرزا رحیم الدین ولد نواب یوسف علی خان کے ایک طرحی مشاعرے میں ان کی اپنی غزل کا درج ذیل مطلع تعارف کا ذریعہ بنا ؎

یادگارِ ہستیٔ موہوم ہم رکھتے ہیں صورتِ عمرِ رواں نقشِ قدم رکھتے ہیں

مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں یہ مطلع زبان پر آیا ہی تھا کہ شہزادہ سن کر پھڑک اٹھا خوب داد دی پوچھا کس کے شاگرد ہو۔ فرمایا تسیم شاگرد مومن کے۔ کہا میری حیرانی بے وجہ نہ تھی۔ انگیا کرتی کے مضامین باندھنے والے لکھنؤ کے شعراء یہ رنگ کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ تسلیم رامپور سے واپسی پر مطبع نول کشور لکھنؤ میں ملازم ہو گئے۔ جب نواب کلب علی خاں ریاست رامپور کی گدی پر جلوہ فگن ہوئے تو انہوں نے تسلیم کو دوبارہ بلایا۔ آپ رامپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس وغیرہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ تسلیم کی تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ اصناف سخن میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس، مسدس، رباعی قطعہ، تاریخ وغیرہ موجود ہیں۔ ابتدائی غزلوں کا مجموعہ غدر کے ہنگامے کی نذر ہوا شعرو شاعری میں تسلیم کا مرتبہ غزل و قصیدہ گوئی کے بجائے مثنوی کی بدولت ہے۔ اس میدان میں ان کا مرتبہ اپنے معاصرین میں بلند ہے۔ ان کی درج ذیل مثنویوں کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ نالۂ تسلیم، شامِ غریباں، صبحِ خنداں، سنبلستانِ خیال، نغمۂ بلبل، شوکت شاہجہانی، تواریخ بدیع، تواریخ کامل، سفرنامہ خسروی، دل و جان، گوہر انتخاب وغیرہ ہیں۔

ان مثنویوں میں سے ہمارے موضوع سے متعلق تاریخ رامپور ہے۔ تسلیم کے شاگرد رشید عرش گیاوی، حسرت موہانی نے ان مثنویوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنی تصنیف "اُردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" تسلیم کی مثنویوں پر اظہار خیال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" تسلیم مثنویوں کے متعلق تقریباً بیس صفحات لکھے مگر تاریخ رامپور کے متعلق صرف دو صفحات

Marfat.com

کی گنجائش نکالی۔ اس ضخیم مثنوی کے متعلق رواروی میں گفتگو کرنا درست نہیں ضرورت ہے کہ مثنوی کے متعلق مفصل بحث کی جائے۔

**مثنوی کا تاریخی پس منظر**

مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے نواب حافظ رحمت اللہ خاں کو خطرہ لاحق ہوا اور انہیں خیال ہوا کہ کہیں مرہٹے روہیل کھنڈ پر حملہ نہ کردیں اس خطرے کے پیش بندی کے لئے مرہٹوں کو اپنی سرحدوں سے ہٹانے کے معاوضے میں نواب اودھ شجاع الدولہ کو چالیس لاکھ روپے دینے کا اقرار کیا۔ جب شجاع الدولہ نے مرہٹوں کو روہیل کھنڈ کی سرحدوں سے دُور دھکیل دیا تو حافظ رحمت اللہ خاں نے نواب اودھ کو چالیس لاکھ روپے دینے سے انکار کردیا۔ لہٰذا شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے اس پر چڑھائی کردی۔ حافظ رحمت اللہ خاں نے نہ صرف شکست کھائی بلکہ میدان جنگ میں راہی ملک عدم ہوا دوسری طرف لال ڈانگ میں فیض اللہ خاں کی سرکردگی میں روہیلے سر اُٹھا رہے تھے ۔چونکہ شجاع الدولہ روہیلوں کی طاقت کو یک قلم ختم کرنا چاہتا تھا ۔چنانچہ فیض اللہ خاں کی سرکوبی کے لئے لال ڈانگ کا رُخ کیا۔ نواب فیض اللہ خاں نے اس وقت نہایت دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ اور کرنل چیمپین کو اس معاملے میں ڈالا اور شجاع الدولہ سے صلح کرلی۔ "اخبار الصنادید" کے مصنف مولوی نجم الدین نے لکھا ہے:

> "صلح نامہ کے تحت نواب فیض اللہ خاں کو چودہ لاکھ چھتر ہزار روپے کی آمدنی کا علاقہ ملا اور ۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ شجاع الدولہ اور فیض اللہ خاں کے مابین کرنل چیمپین کی موجودگی میں تحریری اقرار نامہ ہوا جس میں نواب فیض اللہ خاں نے شجاع الدولہ کا تابع وفرمانبردار رہنے کا وعدہ کیا اور اس طرح ریاست رامپور کی بنیاد ڈالی۔"

**مثنوی تواریخ رامپور**

امیر اللہ تسلیم نے تاریخ رامپور کو تین حصوں میں ترتیب دیا ہے۔ پہلے حصے کا تاریخی نام تواریخ بدیع[1] ہے جس سے

---

[1] تسلیم امیر اللہ تواریخ بدیع در مطبع افتخار عالم رامپور با ہتمام محمد مہدی علی خاں ۱۲۹۶ھ کل صفحات ۱۱۶

Marfat.com

۱۳۰۳ھ بر آمد ہوتے ہیں مگر اس میں ۱۳۰۴ء تک کے واقعات درج ہیں۔ پہلی بار یہ نسخہ در مطبع افتخار عالم میں شائع ہوا۔ اس میں حسب ذیل آٹھ نوابین رامپور کے انتظام ریاست کے احوال درج ہیں۔

(۱) نواب سیّد علی محمد خاں بہادر۔ بانیٔ خاندان سنہ ۱۱۳۹ھ
(۲) نواب سید فیض اللہ خاں بہادر سنہ ۱۷۷۴ء سے سنہ ۱۷۹۴ء
(۳) نواب سید محمد علی خاں بہادر سنہ ۱۷۹۴ء سے سنہ ۱۷۹۵ء
(۴) نواب سید غلام محمد خاں بہادر سنہ ۱۷۹۵ء
(۵) نواب سید احمد علی خاں بہادر سنہ ۱۷۹۵ء سے سنہ ۱۸۴۰ء
(۶) نواب سید محمد سعید خاں بہادر سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۸۵۵ء
(۷) نواب سید محمد یوسف علی خاں سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۶۵ء
(۸) نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر سنہ ۱۸۶۵ء سے سنہ ۱۸۸۷ء ۱۳۰۴ھ

مثنوی کا آغاز قدیم رنگ کی مثنویوں کی طرح حمد سے ہوتا ہے۔ پھر مناجات و نعت کے بعد نواب سید کلب علی کی مدح کی ہے۔ حمد کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

الٰہی ہے تو پادشاہِ جہاں    تجھی سے ہے پشت و پناہِ جہاں

مصنّف نے نواب کلب علی خاں کے عنوان کے بعد "در بیان تالیفِ کتاب مستطاب" کا عنوان قائم کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کلب علی خاں امیر اللہ تسلیم کو ریاست رامپور کے احوال نظم کرنے کے لئے ایک نثری تاریخ کا نسخہ پیش کیا جسے تسلیم نے نظم میں پیش کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہ تو اس ریاست کے احوال کو    اکابر کے اعزاز و اقبال کو
تقارب میں کر نظم آغاز سے    سخن ساز ہو فکر دم ساز سے
خلافت حقیقت سے وقت رقم    رہے پاک نطقِ زبانِ قلم
کم و بیش کا پاس ہر دم رہے    ہر اک بات صحت سے توام رہے
خبر کیا مجھے واقعی حال سے    کروں کس کی تفصیل اجمال سے

Marfat.com

ہوا حکم تم کو ملے گی کتاب ۔۔۔ بہت معتبر منتخب لاجواب
چنانچہ پس مدّتِ چند روز ۔۔۔ عنایت ہوا نسخۂ دلفروز
اُسے میں نے دیکھا تو آیا نظر ۔۔۔ سراپا صحیح و ہمہ معتبر
اُسی نثر کو میں نے موزوں کیا ۔۔۔ جگر کو دمِ فکر پُرخوں کیا
تصرّف سر مو کسی جا نہیں ۔۔۔ کم و بیش کا دخل اصلا نہیں۔

داؤد خاں نے کمایوں کے راجہ دیبی چند سے ایک معرکہ میں غداری کی تھی مگر راجہ نے اس غداری کے لئے داؤد خاں پر ناراضگی کا ذرا بھی شک ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ ازراہِ مہربانی تنخواہ دینے کے بہانے اُسے پہاڑ پر بلایا اور وہیں قید کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لکھے ولولے شوق جانکاہ کے ۔۔۔ بُلایا بہانے سے تنخواہ کے
چلے گھر سے سردار داؤد خاں ۔۔۔ سرِ قافلہ کوہ گردوں نشاں
ملا پہلے راجہ مدارات سے ۔۔۔ کیا قید آخر کسی گھات سے
گرفتار بندِ عقوبت ہوئے ۔۔۔ اسیرِ کمندِ مصیبت ہوئے

جو ماتمی اندازِ بیان سردار داؤد خاں کے متعلق لکھا گیا ہے غور فرمائیے۔ زبان و اندازِ بیان کا حسن ہر جگہ نظر آتا ہے ؎

نہ بن آئی برگشتہ تقدیر سے ۔۔۔ کوئی کام نکلا نہ تدبیر سے
ستمگر نے آخر اُسی کوہ پر ۔۔۔ کیا قتل سردار کو بے خطر
لہو سے ہوا لالہ گوں پیرہن ۔۔۔ بنا غیرت ارغوان نسترن
کیا بے بسی نے گریباں چاک ۔۔۔ اُڑائی بگولوں نے اٹھ اٹھ کے خاک
سرِ آسماں خم الم سے ہوا ۔۔۔ پشیمان ظالم ستم سے ہوا
سیہ پوش سب داغ مہتاب تھا ۔۔۔ ستاروں کی آنکھوں میں خوں آب تھا

۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ مغلیہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کے شانہ بشانہ نواب شجاع الدولہ نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ بکسر کی

Marfat.com

فتح سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو نہ صرف پیر جمانے کا موقعہ ملا بلکہ ریاستوں کے نوابین کی داخلی و خارجی پالیسیوں میں دخل اندازی کرنے کا موقعہ ملا۔ نواب شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین بکسر کی شکست کے بعد جو صلحنامہ اور عہد نامہ ہوا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس سے ظاہر ہوتا ہے سرکارِ انگلشیہ کو نوابین کے اندرونی معاملات میں کس قدر دخل تھا ؎

کیا مسترد ملک اون کو مگر　　کئی شرط پر چند اقرار پر
وہیں میر منشی نے لے کر قلم　　کیا عہد نامہ یہ باہم رقم
کہ سرکار انگلینڈ کے خیر خواہ　　رہے ابن منصور شام و پگا
وہ کنپنو کا رہنا گوارہ کریں　　دوانی مصارف کا دمہ کریں
ہر اک افسر انگریزی مدام　　رہیگا شریک اودھ صبح و شام
جو ہوگا درونی بیرونی عدو　　کریں گے اوسے دفع بیک گفتگو
یہ مضموں مرقوم خامہ ہوا　　بہم دستخط صلحنامہ ہوا

گو نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں میں صلح ہو گئی تھی مگر شکست کا داغ نواب کے دل میں متواتر قائم رہا اور اس شکست کا بدلہ لینے کی خاطر نواب شجاع الدولہ نے فوج کی نگرانی اور اس کو از سر نو تربیت دینی شروع کر دی۔ اس فوجی تیاریوں کو دیکھ کر نواب حافظ رحمت خان کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں نواب شجاع الدولہ اس سے انتقام نہ لیں۔ اس نے نواب شجاع الدولہ کا وہ خط جو انہوں نے حافظ رحمت خان کو بکسر کی لڑائی کے بعد اور صلح نامہ سے پیشتر لکھا تھا اور جس میں انگریزوں کے خلاف مدد دینے کی بابت ذکر تھا۔ وہ گورنر جنرل ہیسٹنگز صاحب کو کسی حکمت عملی سے اس پر سن ہجری بدل کر بھیج دیا۔ جس کا مقصد شجاع الدولہ اور انگریزوں میں دشمنی پیدا کرنا تھا۔ اس خط کو گورنر جنرل نے جب شجاع الدولہ کو بنارس کی ملاقات پر دکھایا تو اس موقعہ کے چند اشعار قابلِ غور ہیں ؎

خریطہ دیا ابن منصور کو　　کہا دیکھئے اپنے مسطور کو
نہیں ہے اگر صلح نامہ غلط　　تو پھر کیا بلا ہے یہ مضمون خط

Marfat.com

لکھا واقعی راست تحریر ہے | یہ پہنچی ہوئی میری تحریر ہے
مگر اس زمانے میں سرکار سے | نہ تھی صلح اس شرط واقرار سے
لڑائی تھی بکسر کے میدان میں | میں تھا ساتھ لشکر کے میدان میں
نہ تھی اس میں تاریخ تحریر کی | غلط تھی بن جملہ تقریر کی

جب گورنر نے پوچھا تو پھر یہ فوجی تیاریاں کس لئے ہو رہی ہیں ؎

نگہداشت لشکر ہے کس کے لئے | قواعد برابر یہ ہے کس کے لئے
عدو کون ہے کس نے کی سرکشی | یہ منظور کس پر ہے لشکر کشی
گورنر بہادر سے کر کے خطاب | دیا ابن منصور نے یہ جواب
کہ دشمن تو پوشیدہ میرا نہیں | کوئی جن نہیں ہے فرشتہ نہیں
زمانہ ہے واقف کہ جب کے ہو پست | مرہٹوں سے حافظ نے کھائی شکست
دمے صلح دلوا کے چالیس لاکھ | بڑھائی کہٹر کے ملکوں میں ساتھ
وہ میرا زرِ قرض دیتے نہیں | کبھی نام دینے کا لیتے نہیں
شب و روز بدلے میں احسان کے | شرارت کیا کرتے ہیں جان کے

نواب آصف الدولہ اور نواب سید غلام محمد خان کے درمیان ۱۷۹۵ء میں لڑائی ہوئی۔ انگریزی فوج نواب آصف الدولہ کی پشت پر تھی۔ نواب سید غلام محمد خان نے اپنی فوج کو حصار کوہ میں اکٹھا کر لیا جہاں آصفی وانگریزی فوج گزند نہیں پہنچا سکتی تھی۔ جب آصفی وانگریزی فوج سے کچھ نہ بن آئی تو حصار کوہ سر نہ ہو سکا۔ لاچار اس معاملے کو باہمی گفتگو سے طے کرنے کے لئے انگریزوں نے سید غلام محمد خان کو مراسلہ لکھا جس میں واضح تھا کہ تم یہاں چلے آؤ، تمہارے قصور معاف کر دیئے جائیں گے۔ مگر جب نواب، جارج فریڈرک چیری صاحب کے پاس چلے آئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ آصف نامہ میں لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے انگریزوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں نواب سید غلام محمد خان کو ملک نہیں دوں گا۔ کیونکہ نواب سید محمد علی خاں کے بیٹے نواب سید احمد علی خاں مستحق ریاست تھے۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

Marfat.com

اوسی وقت آصف نے لے کر قلم — کیا چیری صاحب کو نامہ رقم
کہ احمد علی کو میں بیشتر — سمجھتا ہوں حق دار ملکِ پدر
طلب کر کے تم نے جو اجاب سے — کیا دعدہ ملک نواب سے
رہے آپ کو یہ برابر خیال — کہ ملک کٹہر ہے میرا محال
میرے سامنے آپ کو زینہار — کسی طرح کا کچھ نہیں اختیار

نواب محمد سعید خاں نے ۱۸۴۰ء ۱۸۵۵ء کے عہد حکومت کے ریاست نے بڑی ترقی کی جس کی طرف تسلیم اشارہ کرتے ہیں ؎

کچھ ایسا کیا آپ نے بندوبست — کہ سر ہو گئے سربلند ان کے پست
ریاست سیاست کے صدہا اصول — نکالے طبیعت سے زیبا اصول
مقرر کئے محکمے جا بجا — عدالت سے ہر کام ہونے لگا
قواعد حکومت کے جاری کئے — موافق شریعت کے جاری کئے
کیا خوب لشکر کو آراستہ — ہوا شور شر فتنہ برخاستہ
متاع گراں قیمت آنے لگی — ترقی تجارت دکھانے لگی
جو نایاب اسباب تھا دہر میں — وہ کثرت سے ملنے لگا شہر میں
ہوئے آپ جس سال مسند نشیں — کیا ملک اجداد زیر نگیں

۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ میں جب ہندوستان میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی تو اس وقت رام پور میں نواب یوسف علی خاں کا دور دورہ تھا۔ مگر خوش قسمتی تھی کہ غدر کا اثر رام پور پر نہ ہوا اور اس پر آشوب دور میں رام پور میں کوئی خرابی نہ ہوئی ؎

اوس آشوب میں آپ نے صبح و شام — فراست سے ایسا کیا انتظام
کہ راضی رہے دونوں انجام تک — نہ آیا کبھی غدر کا نام تک
ریاست کو صدمہ نہ پہنچا کبھی — نہ آیا ادھر اہلِ بلوا کوئی
ستم کا نہ خطرہ نہ لٹنے کا ڈر — رعایا رہی روز و شب بے خطر

اور اس غدر میں تسلیم رامپور آئے ؎

Marfat.com

اسی غدر میں لکھنؤ سے یہاں | یہ راقم بھی آیا تھا ہمراہ ماں
شب و روز راحت سے بےخوف و بیم | رہا قلعے میں دس مہینے مقیم

تسلیم نے اس مثنوی میں نواب کلب علی خاں کے عہدِ حکومت ۱۸۶۵ء سے ۱۸۸۷ء تک حالات پیش کیے ہیں انہیں کے عہدِ حکومت میں ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۵ھ میں روس و روم میں لڑائی ہوئی اور کلب علی خاں نے روم کی زرِ بےبہا سے مدد کی جس کے بارے میں مصنف یوں رقم طراز ہے ؎

کہ بارہ سو پچانوے میں بہم | لڑے دو سلطاں گردوں حشم
صف آرا ہوا لشکرِ روم و روس | گیا تا فلک غلغلِ بوق و کوس
چلی خوب شمشیر توپ و تفنگ | ہوئی مدتوں تک قیامت کی جنگ
ہزاروں ہوئے دونوں جانب ہلاک | بنا لالہ گوں خوں سے روئے خاک
اوس آشوب میں آپ نے بے خطر | کمر باندھی تائیدِ اسلام پر
مدد زر سے کی قیصرِ روم کی | ہوئی دھوم مقدار معلوم کی

اخبار الصنادید جلد دوم میں درج ہے کہ نواب نے زخمیوں کی مدد کے لئے روم کو ڈیڑھ لاکھ روپے اپنے خزانے اور ہزاروں روپے شرفائے شہر سے چندہ کراکر بھیجے۔ جس کے صلے میں سلطان عبدالحمید خاں والئ روم نے ۱۲۹۶ھ میں نواب کلبِ علی خاں کو ایک تمغائے مجیدی دوسرے درجے کا عطا کیا۔ نواب کلب علی خاں کا انتقال ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اس کے عہد کے حالات تسلیم نے تواریخ رام پور کے حصہ دوم میں بیان کئے ہیں۔ جس کا نام "تواریخ کامل" ہے۔ جس کا ذکر اگلے صفحات پر آئے گا۔

## تواریخ کامل

مثنوی تواریخ رام پور کے دوسرے حصّے کا تاریخی نام "تواریخ کامل" ہے جس سے ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ اس حصّے میں ۱۳۱۱ھ تک کے حالات نظم کئے گئے ہیں اس لئے تاریخ کامل کہنا ٹھیک نہیں۔ تاریخ کامل کے دو جز ہیں۔ پہلا جز نواب مشتاق علی خاں بہادر کی دو سالہ حکومت ۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۹ء تک کے حالات پر محیط ہے۔ نواب مشتاق علی خاں کے انتقال کے وقت ولی عہد

Marfat.com

نواب سرسید حامد علی خاں کی نابالغی کی وجہ سے ریاست کا انتظام سرانجام دینے کے لئے ایک ریجنسی کونسل مقرر ہوئی اس لئے اس حصے کا دوسرا نام "تاریخ ریجنسی کونسل" بھی ہے۔ جب محمد حامد علی خاں ۴؍ اپریل ۱۸۹۴ء/۱۳۱۱ھ میں سن بلوغ کو پہنچے تو ریاست کے اختیارات انہیں سونپے گئے۔ چونکہ حصہ دوم میں ۱۸۹۳ء/۱۳۱۰ھ تک کے حالات ہیں اور اس وقت نواب حامد علی خان کو ریاست کے اختیارات حاصل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے اس میں نواب حامد علی کے حالات کا ذکر نہیں ہے۔

"تواریخ کامل کا ایک قلمی نسخہ نستعلیق بخط تسلیم رامپور رضا لائبریری میں موجود ہے۔ جس کی ابتدا حمد، نعت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے "سبب تالیف کتاب" کا عنوان قائم کیا ہے، جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی محمد علی نے تاریخ رامپور جس میں تاریخی واقعات کی غلط بیانی کے علاوہ ریجنسی کونسل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خوشامدانہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا لکھی تھی۔ تسلیم نے تاریخی حقائق کو مؤرخانہ ذمہ داری کے ساتھ پیش کرنے کے لئے ازسرِنو تواریخ کونسل آف ریجنسی لکھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اوسی وقت میں ایک ہرزہ خیال　　　سراپا پریشان آشفتہ حال
چرٹ کوٹ پتلون کا آدمی　　　نئی روشنی کا نیا آدمی
اُسے کہتے ہیں شہر کے خاص و عام　　　محمد علی خاں عالی مقام
کہیں سے یہاں وارد آکر ہوا　　　فقط اس ضرورت سے نوکر ہوا
کہ لکھے ریاست کے احوال کو　　　کرے جمع ملکی خیالات کو
ہر اک خانداں کی اولعزمیاں　　　جو سابق نے کی ہیں کرے وہ بیاں
جو میرے بزرگوں کا ہوا اقتدار　　　نہ ہو وہ کسی اور کا زینہار
لکھی اس نے تاریخ الدخراب　　　خوشامد مہمل سراپا خراب
خلاف اصل کے بیشتر کردیا　　　تصنع سے ہر اک حتیٰ بھر دیا
تمع کی اُمید میں یک قلم　　　تراشیدہ مضموں کیے سب رقم

خوشامد کہیں اہل کونسل کی ہے | ستائش کہیں حد سے جنرل کی ہے
مؤرخ کا ہرگز یہ منصب نہیں | کرے حال میں دخل اپنا کہیں
کہا اس میں ہر ایک اصرار نے | محبت سے شائستہ گفتار نے
کہ آپ ابھی کچھ غور فرمائیے | اسے نظم فی الفور فرمائیے

مسند نشینی نواب مشتاق علی خاں بروز چہارشنبہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء واقع ہوئی مگر ۲۵ مارچ کو لنگ صاحب کمشنر نے رسم مسند نشینی ادا کرائی۔ چونکہ اس روز صاحب زادہ سید محمد علی خاں عرف چھمٹن صاحب کو حسب مراتب کرسی نہیں ملی اور وہ رسم مسند نشینی میں شریک نہیں ہوئے۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اراکین دولت ہوا خواہ جاہ | گھروں سے بڑھے جانب بارگاہ
موافق مراتب کے ہر نامور | ہوئے اپنی اپنی جگہ جلوہ گر
ولی عہد کے عم عنوان سے | وہیں لائے جنرل بڑی شان سے
مگر آئے جس وقت ہو کر سوار | محمد علی خاں والا تبار
ملی بے محل ان کو کرسی وہاں | اُٹھے ہو کے برہم وہ رفعت نشاں
خفا ہو کے جنرل کے کردار سے | چلے آئے گھر اپنے دربار سے
یہی امر اس روز گزرا خلاف | اسی سے عداوت بڑھی صاف صاف
اُسی سے پڑا خانداں میں فساد | یہی باب بے شک ہے وجہ عناد

کمشنر کا خطاب غور فرمائیے ؎

کمشنر نے کرسی سے اُٹھ کر شتاب | کئے وا بلاغت فصاحت کے باب
مخاطب کیا اہل دربار کو | سنائی یہ اسپیچ حضار کو
کہ فرزند نواب مغفور کو | ولی عہد بیمار معذور کو
گورنر بصد شکوہ و وقار | دیا حکمران ریاست قرار
ہوئے جانشین پدر آج سے | کریں گے کرم خلق پر آج سے

جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام مقرر ہوئے ؎

Marfat.com

ریاست میں جنرل پئے انتظام — مقرر ہوئے ہیں مدار المہام

جس کے متعلق نواب صاحب فرماتے ہیں ؎

کہ میں ایک کونسل مقرر کروں — فراہم کئی اس میں افسر کروں

رہوں میر مجلس شب و روز میں — کروں حکم بے بہرہ اندوز میں

امور اہم جو ریاست کے ہیں — مفوض وہ سب اس عدالت کے ہیں

دوئم یہ کہ جنرل مقدم رہیں — میری پیش دستی میں ہر دم رہیں

یہ نامی گرامی ہیں وہ محترم — کہ رہے عہد والد میں ذی حشم

اخبار الصنادید کے مصنف نجم الغنی نے لکھا ہے کہ ۳۰ مئی کو نواب صاحب نے ایک دربار منعقد کر کے فرمایا :-

" گو میں نے یوم مسند نشینی سے جنرل عظیم الدین خاں کو مدارالمہام ریاست مقرر کیا ہے، لیکن آج کی تاریخ بصلاح صاحب ایجنٹ و نواب لفٹیننٹ گورنر آپ سب صاحبوں کو مطلع کرتا ہوں کہ آپ لوگ اُن کے ہر ایک حکم کے مثل میرے احکام کی تعمیل کریں۔ اور اُن کی اطاعت مثل میری اطاعت کے فرض و واجب جانیں ۔" ص ۲۵۴

نواب مشتاق علی خاں کے انتقال کے وقت نواب سید حامد علی خاں کی عمر ابھی پندرہ سال کی پوری نہیں تھی اور بوجہ صغر سنی کے کونسل آف ریجنسی مقرر ہوئی جس کے پریزیڈنٹ سید صفدر علی خاں، وائس پریزیڈنٹ جنرل عظیم الدین خاں جوڈیشل کونسل کے ممبر نواب یار جنگ اور ممبر مال سید علی حسن مقرر ہوئے۔ اور نواب صاحب سید حامد علی خاں کو تحصیلِ علم کے لئے نینی تال بھیجا گیا۔ جس کے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جنرل صاحب نے گورنر صاحب کو لکھا ؎

گورنر کو لکھے بصد حیف و غم — کہ نواب جم جاہ و کسریٰ حشم

شب و روز ہیں محو سیر و شکار — نہیں ہے اُنہیں لکھنے پڑھنے سے کار

اگر بے پڑھے ہو گئے وہ جواں — ریاست کی پھر عقل و دانش کہاں

اگر حکم والا ہو دو سال کو | اُنہیں بھیج دوں نینئی تال کو
جو صفدر علی خاں ہے نامِ رئیس | معظّم مکرّم ہے گرامی رئیس
یگانے ہیں اوصاف اخلاق میں | لیاقت کے شہرے ہیں آفاق میں
وہ اس خانداں میں دُرِ تاج ہیں | ولایت کے قابل وہی آج ہیں
نہ حیدر علی خاں نیابت کریں | نہ حامد علی خاں ریاست کریں
فقط آپ ہی آپ رہ جائیں گے | جو چاہیں گے تجویز فرمائیں گے

۳ اپریل ۱۹۱۸ء کو جب جنرل عظیم الدین خاں ایک تقریب سے رات کو ۹ بجے ایک ٹمٹم پر سوار ہو کر گھر واپس آرہے تھے کہ راستے میں انہیں مار ڈالا گیا اور اس قتل سے پریشان ہو کر صفدر علی خاں نے پریزیڈنٹ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ دیارِ غیر میں مارے مارے پھرتے رہے جس کی تصدیق اخبار الصنادید سے ہوتی ہے۔

"اگرچہ کونسل کے اغراض و اعزاز کے خیال سے سید صفدر علی خاں کے دامن پر بظاہر کوئی داغ نہ لگا۔ تاہم اس کے بعد وہ رام پور نہ ٹھہر سکے۔ باہر ہی باہر پھرتے رہے۔ کبھی لکھنؤ گئے، کبھی دلّی، کبھی کلکتہ، یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء کو ۴۸ سال کی عمر میں قیام کلکتہ میں لاولد انتقال کیا۔"

پسِ قتل جنرل پریشاں ہوئے | بدولت نیابت کے حیراں ہوئے
ہوئے منصف عہدہ سے برطرف | زمانے میں حکماً پھرے ہر طرف
کہ منصب کی تنخواہ باقی رہے | وہ اعزاز و جاہ باقی رہے
یہی دل میں اپنے لئے آرزو | پھرا کرتے تھے دہر میں چارسو
کبھی لکھنؤ میں رہے چند روز | رہے دہلی میں گاہ رونق فروز
کہیں آگرے میں سحر گاہ شام | رہے جلوہ افزائے جائے قیام
اسی غم تردد میں انجام کار | گئے سوئے کلکتہ ہو کر سوار

مثنوی کا آخری شعر ملاحظہ ہو، جس سے مثنوی کے سنہ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔

Marfat.com

سن مسیح تھے وقفِ زباں      اٹھارہ سو ترانوے بیگماں

امیر اللہ تسلیم نے مورخانہ ذمہ داری کا جو ثبوت دیا ہے وہ تواریخ کامل کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست رامپور کے احوال کو جس خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے یہ تسلیم کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔

**سفرنامہ خسروی**

تیسرے حصے کا تاریخی نام "سفرنامہ خسروی" ہے۔ چونکہ اس حصے میں تسلیم نے نواب محمد حامد علی خاں کی سیاحت ممالک ایشیا، امریکہ، یورپ، اور مصر کے بعض دیار میں جو انھوں نے ۱۳ مارچ ۱۸۹۳ء سے ۳ جنوری ۱۸۹۴ء میں کی تھی کے حالات نظم کئے ہیں۔ اس لئے اس حصہ کی حیثیت محض سفر کی ہے۔

حسرت موہانی نے "سفرنامہ خسروی" کے متعلق لکھا ہے کہ تسلیم نے جو پہلا سفرنامہ لکھا تھا اس کے کھو جانے کے بعد انھوں نے اسے دوبارہ نظم کیا جو نقشِ اول سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ شاعرانہ اعتبار سے مثنوی تاریخ رامپور تسلیم کی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں پھیکی ہے۔

Marfat.com

# شاد عظیم آبادی

سید علی محمد نام ۔ شاد تخلص ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ طویل عمر پائی ۱۳۴۵ھ میں ۸۲ سال کی عمر میں عظیم آباد میں پیوند خاک ہوئے۔ شاد کے والد بزرگوار نہایت متقی اور قاری کلام پاک تھے۔ بزرگوں کی صحبت نے ان پر اخلاقی تعلیم کا خوب اثر ڈالا۔ اُردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اس نے تقریباً ۱۹ سال کی عمر میں مثنوی "نالۂ شاد" نظم کی۔ ابتدا میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں سے متاثر ہوئے مگر جلد ہی ان کے مزاج نے اپنا رنگ اختیار کیا۔ "یاد عظیم آبادی" کے عنوان سے اخلاقی و تاریخی مسدس لکھ کر تاریخ بہار میں اس کا شمار کیا۔ شاد عظیم آبادی نے اُردو فارسی دونوں زبانوں میں مثنویاں کہیں، غزلیں بھی کہیں مگر ان کا مرتبہ بحیثیت مثنوی نگار بلند ہے۔ شاد کی مثنویوں کی فہرست میں ہمارے موضوع سے متعلق "نوید ہند" اور "مادر ہند" سیاسی مثنویاں ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع تاریخی مثنویاں ہے اور سیاست اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے یہاں پر شاد عظیم آبادی کی مثنوی "نوید ہند" اور اس کی ترمیم شدہ شکل "مادر ہند" پر اجمالاً روشنی ڈالیں گے۔

**مثنوی نوید ہند**

شاد عظیم آبادی نے یہ مثنوی ۱۸۸۴ء میں کہی جو پہلی بار صبح صادق پریس میں چھپی۔ وقتی تقاضہ کے پیش نظر شاد نے کوئین وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر تصنیف کر کے لارڈ ڈفرن گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی۔

مثنوی کا مختصر لب لباب یہ ہے۔ ایک زمانہ کی بات ہے مادر ہند کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ لوگ یہاں جوق در جوق آتے، تجارت کرتے سیاحت کرتے اور تعلیم حاصل کرتے۔ اس کے دو فرزند دل بند تھے۔ بڑے کا نام رام اور چھوٹے کا نام رحیم تھا۔ دونوں بھائیوں مراد ہندو مسلمان میں بے پناہ محبت تھی۔ مادر ہند کی نظام حکومت

Marfat.com

پہلے بڑے بیٹے رام کے سپرد تھی۔ جب ماں نے دیکھا کہ بڑا بیٹا نظام سلطنت سے دل چُرا رہا ہے تو ملکی بندوبست کا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے چھوٹے بیٹے کے کندھے پر ذمہ داری ڈالی۔ ابتدا میں تو چھوٹے بیٹے نے ہر طرح سے کمال دکھایا انصاف و ایمانداری کو اپنا شعار بنایا اور بڑی چابک دستی سے ملک کا انتظام کیا۔ مگر بعد میں اپنے بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ ملک میں نا اتفاقی پھیلنے لگی۔ دونوں بھائی آپس میں برسرِ پیکار رہنے لگے اور اپنی بوڑھی ماں کا خیال کسی کو نہ رہا۔ ملک میں بدنظمی افراتفری اور طوائف الملوکی پھیلنے لگی۔ جس نے بیرونی حملہ آوروں کو موقعہ دیا۔ مغربی تاجروں کا بھی ادھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے اس ضعیفہ کی قدر و منزلت کو جلدی پہچان لیا۔ اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ عمدہ علاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس ضعیفہ کے بھاگ کھُل گئے۔ ہر طرح کی ہر طرف ترقی ہونے لگی۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں نے اس شان و شوکت کو دیکھا۔ اپنی میانوں سے تلواریں نکال لیں اور باہم اتحاد کر کے تاجر حکومت سے برسرِ پیکار ہوئے۔ مگر منہ کی کھانی پڑی۔ تاجروں سے تجارت تو بہتر ہو سکتی ہے مگر حکومت کرنا ان کے بس کی بات کہاں۔ مادرِ وطن نے اپنے آپ کو شاہِ برطانیہ کے سپرد کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعہ پر مادرِ ہند نے اپنی اولاد اور پوتوں کے ساتھ دربار شہنشاہ انگلستان میں دُہائی دی اور اپنی اولاد کے حق میں کرم فرمائی کی درخواست کی۔ شاد عظیم آبادی اس تاریخی واقعہ کو بڑے شاعرانہ انداز میں فنکارانہ طریقے سے بغیر تصنع کے بڑی سادگی کے ساتھ استعارے میں پیش کیا ہے جس سے شاد کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ چکی تھی۔ ملک انقلاب کے دور سے گزر رہا تھا۔ دینی، علمی، اور تعلیمی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ روز افزوں سیاسی ہلچل اپنا رنگ دکھا رہی تھی، حب الوطنی کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گو شاد عظیم آبادی کو سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا مگر زمانے کی رفتار اور ماحول کے اثرات نے اپنا تاثر شاد پر ڈالا۔ آئے روز کے ہنگاموں سے متاثر ہو کر شاد عظیم آبادی نے "نوید ہند" پر اصلاح کی۔ "نوحۂ مادرِ ہند" ۱۹۰۵ء میں تصنیف ہوئی۔

Marfat.com

## مادرِ ہند

مثنوی مادرِ ہند' اور نوید ہند کا لب دلباب ایک ہے جس کا اجمالاً ذکر اوپر ہو چکا ہے۔" مادرِ ہند" نوید ہند کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ مادرِ ہند میں بعض اشعار ترمیم شدہ ہیں اور بعض جوں کے توں پیش کئے گئے ہیں۔ دونوں مثنویوں میں عنوانات اردو نثر میں ہیں مگر اضافہ اور ترمیم کی وجہ سے عنوانات کی تعداد میں فرق ہے۔" نوید ہند" میں ۲۰ عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ اور"مادرِ ہند" میں انتیس[۲۹]۔ دونوں مثنویوں کے مطالعہ سے سیاسی رجحان اور ترقی فن کا صاف پتہ چلتا ہے۔ شاؔد عظیم آبادی نے مثنوی میں راہِ نو اختیار کی اور تاریخی واقعات کو استعارات میں سلیقے سے پیش کیا۔ جس کی مثال ہمیں اُردو مثنویوں میں شاؔد سے پہلے نہ کہیں ملتی ہے اور نہ بعد میں۔

مادرِ ہند میں شاؔد نے دکھایا ہے کہ سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے تلوار کا استعمال کرنا اور خون کی ندیاں بہانا مناسب نہیں۔ بلکہ اخلاقی اقدار کا حربہ استعمال کرکے سیاسی آزادی حاصل کرنا صحیح راستہ ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو حق بجانب نہیں مانتے ان کے خیال میں حکومت انگلستان مناسب وقت پر خود بخود آزادی دے دے گی آخر کار ایسا ہی ہوا۔ شاؔد کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ انگریزوں نے ۱۹۴۷ء میں ہند کو آزاد کر دیا۔ اگرچہ شاؔد نے ہندوستان کی تاریخ کو مختصراً نظم کے لباس میں پیش کیا۔ مگر تاریخ کو تاریخ کے آئینہ میں پیش نہ کرکے اخلاق کے آئینہ میں پیش کیا۔

مثنوی "مادرِ ہند" کی ابتدا "سرزمین ہندوستان" کے عنوان سے ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خدام شہی کا کہنہ ہمراز[۱] | عرشی قلم و ملک ہم آواز
ہے اپنے وطن کا خیر اندیش | یہ مخلص راز داں وفا کیش
غمخوار وطن اور غم اندوز | یوں نوحہ کناں ہے ایک سید سوز

---

[۱] نوید ہند میں یہ اشعار اس طرح ہیں۔ ہے شاہ کا ایک طالب خیر۔ لکھتا ہے یہ نامۂ فلک سیر

Marfat.com

یاد آگئی اس کو ایک کہانی — یوں کہتا ہے شاد کی زبانی
خود صدق پہ اس کا استعارہ — ہر لفظ میں کرتا ہے اشارہ
اک ملک جو ایشیا کی ہے جان — فردوس بریں ہو جس پہ قربان
[1] وہ قطعۂ ارض پاک و مشہور — ہم صورت خلد چشم بد دور
[2] عظمت میں گزشتہ سے فزوں تر — خوبی میں بہشت سے فزوں تر
[3] بتخانۂ چین وہاں کے بازار — ہر ایک دکان دکانِ عطار
[4] دیکھے اگر اس زمین کی گرد — آتش کدۂ عجم بھی ہو سرد

اس طرح شاد اپنے وطن کے جملہ صفات گنواتا چلا جاتا ہے۔

ہر شئے کو بیاں کروں میں کیونکر — گر نام لکھوں کئی ہوں دفتر

دوسرے عنوان " جناب عالیہ متعالیہ عصمت مآب مادرِ ہند کے تحت ' مادر کی عظمت بزرگی اور اس کی فیاضی کو شاد نے کس طرح نظمایا ہے ملاحظہ ہو۔

[5] ایک محتشمہ وہاں کی ساکن — اس مادرِ دہر کی تھی ہمسن
دیکھے ہوئے سینکڑوں زمانے — دنیا کے پڑھے ہوئے فسانے
خورشید فلک کی تھی وہ ہم عمر — تھے اہلِ زمیں سب اس سے کم عمر
آدم سے ملی تھی وہ خوش اوقات[6] — [7] قائم حوّا سے تھی مدارات
[8] ہم رتبۂ نوح اک یہی تھی — طوفاں سے زندہ بچ رہی تھی
پہنچی تھی جو دور دور شہرت — [9] پھیلی تھی جہاں میں اس کی عظمت
دولت کے وفور میں تھی مشہور — خلق و کرم و عطا سے معمور [10]
مشہور تھا فیضِ عام اس کا — تھا مادرِ ہند نام اس کا

---

(نویدِ ہند میں یہ اشعار اس طرح ہیں) [1] اک جا کہ فضا میں بھی ہے مشہور، غیرت وہ خلد چشم بد دور [2] رتبہ میں گزشتہ سے فزوں تر، خوبی میں بہشت سے فزوں تر [3] بت خانۂ ہند اس کے بازار، ہر۔۔ و۔ در دکان عطار [4] یہ شعر دونوں مثنویوں میں مشترک ہے [5] مصرعہ اولا دونوں میں مشترک ہے [6] حوا سے بھی کر چکی تھی ملاقات [8] دونوں مثنویوں میں مشترک ہے [9] مصرعہ ثانی یوں ہے "ہر شخص کے دل میں اس کی عظمت" [10] تھا دولت و آبرو میں مشہور، اخلاق و کرم سے تھی وہ معمور۔

آتے تھے جب اس کے گھر مہماں     کرتی تھی وہ سب طرح کے احساں ؎[1]

آتا جو کوئی تو مال دیتی     طالب کو بحسب حال دیتی ؎[2]

مادرِ ہند کے دونوں بیٹے رام اور رحیم جو ہر طرح سے قوی، دانا، ذکی اور فخرِ خاندان تھے کسی طرح سے وہ کچھ دنوں بعد عیش و آرام میں پھنس کر غفلت شعار بن گئے۔ عدل و انصاف کو بالائے طاق رکھ دیا۔ دلوں میں نفرت نے جگہ لے لی، ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لیکن افسوس کچھ دنوں بعد     بگڑا دونوں کا طالعِ سعد
عیش آ کے ہوا شریکِ صحبت     رہتی تھی سدا جلیسِ غفلت
جاتے رہے دل سے عدل و انصاف     جس چیز کو دیکھو اس میں اسراف
دل دونوں کے ہو گئے دگرگوں     دونوں کا سفید ہو گیا خوں
ایک ایک پہ چاہتا تفوّق     بدخواہ سے کرتا تملّق
آپس کی یہ جنگ تھی بہت سخت     جاتی رہی شان و شوکتِ تخت

سلطنتِ مغلیہ کے فرماں روا' فرخ سیر، محمد شاہ، اور عالمگیر ثانی کے دورِ حکومت میں، طوائف الملوکی بدنظمی اور پارٹی بازی زوروں پر تھی۔ ایک طرف دربار میں ایرانی تورانی تھے تو دوسری طرف لطف الدولہ خاں صادق صمصام الدولہ تھے۔ مرہٹے کہاں خاموش ہو کر بیٹھنے والے تھے، شمال و جنوب جدھر کا رُخ کرتے، تباہی مچاتے، گویا ملک بغیر والی وارث کے تھا۔ خزانہ عیش و عشرت کی بدولت خالی ہو گیا تھا۔ فوج کی تنخواہ کئی مہینوں کی چڑھ گئی تھی۔ وہ کیا کرتے خدمت کی بجائے لوٹ میں شریک ہو گئے۔ زوال کا نقشہ ملاحظہ ہو ؎

نوکر ہوئے مالکوں سے بدظن     آقا ہوئے خادموں کے دشمن
دو دوست کہ ظاہرا تھے وہ نیک     باطن میں عدو تھا ایک کا ایک
جس شخص میں کچھ نہ تھی لیاقت     اپنی ہی وہ چاہتا تھا رفعت

---

(نوید ہند میں یہ اشعار اس طرح ہیں) ؎[1] مصرعہ ثانی۔ کرتی تھی بہم عجیب ساماں
؎[2] مصرعہ ثانی۔ ہر شخص کو حسب حال دیتی۔

Marfat.com

تقدیر جو اپنی چال چوکی | ہر سو تھی طوائف الملوکی
لٹنے لگے راہ میں مسافر | تھا کوئی نہ ملک بھر میں جابر
چوپال میں اپنی ہر زمیندار | کرنے لگا نائبوں سے تکرار
کیوں کر نہ ہو خدمتوں سے اکراہ | جب فوج کی چڑھ گئی ہو تنخواہ
ہتھیار تھے کام کے نہ وردی | کیا خاک دکھائے فوج مردی
جاری تھی نہ فوج کی قواعد | ہنگامہ تھا لشکرِ زوائد
بندوقوں کو مورچوں نے کھایا | توپوں کو زمین نے گلا یا
جس نے کئے کچھ کلام انصاف | بس ہو گیا اس کا گھر کا گھر صاف

کوئی بھی سنجیدہ مؤرخ مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔ بقول صاحب سیر المتاخرین :-

"شجاع الدولہ کی فوج میں دورانی لٹیروں کا جمِ غفیر تھا۔ شاہ آباد (بہار) کے دیہاتوں میں یہ رعیت کو لوٹتے تھے اور اس طرح گزارہ کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ مقرر نہ تھی یہ عالم وزیر سلطنت کا تھا جو ہند کی رعایا کو لوٹتی تھی"

ایک جگہ اور فرماتے ہیں :-

"آخری دور کے سلاطین جنگ میں بھی طوائفوں کو ساتھ لے جاتے تھے چنانچہ سراج الدولہ اور شوکت جنگ کی لڑائی میں، شوکت جنگ عین ہنگامِ کارزار میں مجرا سن رہا تھا۔ بکسر کی لڑائی میں شجاع الدولہ کے ساتھ کبوتر اور طوائفیں تھیں۔"

شاد نے خود مقدمہ نوید ہند میں فرمایا ہے :-

"اگر دیکھیئے تو محض خیال ہے، لیکن واقفان رموز تاریخ کے نزدیک حقیقتِ حال ہے۔"

شاد نے مادرِ ہند کا جو سراپا کھینچا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو اس سے فزوں شکستہ حالی اور وطن کی کس مپرسی کی تصویر اور کیا ہو سکتی ہے ؎

وہ زال جو دیکھتی تھی یہ حال — تھا کوفت سے اس کا غیر حال
بے آب تھی بے طعام تھی وہ — گویا کہ برائے نام تھی وہ
بستر سے جو اٹھتی تھی وہ غم کش — آجاتا تھا فرط ضعف سے غش
تھی کفش نہ پا میں پائتابہ — بے مقنع و چادر و عصابہ
ننگی بھنگی شکستہ احوال — الجھے ہوئے دوش پر کھلے بال
ٹوٹا تھا خیال کا جو ساکھا — دبلا پے سے ایک پیٹ پاکھا
باندھے ہوئے اک پھٹی سی چادر — گودڑ مشغل کا کہنہ بستر!
سوچے ہوئے پاؤں زرد رخسار — جھکنا وہ غنودگی سے ہر بار
بے ساختہ سر جھکا کے روتی — کچھ سوچ کے غل مچا کے روتی

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شاد نے مادرِ ہند کا جو سراپا کھینچا ہے وہ ایک پیرسالہ ہے، بیٹوں اور پوتوں والی ہے جیسے شاعر نے ردائے مقنع و چادر اور پائتابہ میں ملبوس دکھایا ہے۔ مگر دو قوموں کا نظریہ سامنے آنے کے بعد اب جو مادرِ ہند کی تصویر ہمارے سامنے ہے وہ پیرسالہ عورت کی نہیں بلکہ ایک دوشیزہ عورت جس کے سر پر تاج کالے کھلے دراز بال، تن پر عمدہ ساڑھی ہاتھ میں پرچم ہند اور لپشت پر بھارت کا نقشہ دکھاتے ہوئے پیش کیا گیا ہے دونوں تصویروں میں کونسی بھارت ماں کی اصل تصویر ہے، شاد کی پیش کردہ یا دو قوموں کے نظریئے کے سامنے آجانے کے بعد کی تصویر۔

جنگِ پلاسی اور بکسر کے بعد انگریزوں نے اپنے پیر جما لئے تھے۔ مادرِ ہند کے دونوں بیٹوں نے کمپنی کے تاجروں کے ساتھ صلح کرلی اور ان کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لپٹنے لگے اور مل کر مادرِ ہند کی خدمت کرنے لگے۔

کی پھر تو معاً دونوں نے شفقت — کرنے لگے جان و دل سے خدمت
صحت کے ہوئے نمودار آثار — گھٹنے لگا روز روز آزار
لڑتے تھے ہمیشہ جو زمیندار — سر ڈال دیا انھوں نے ناچار
اُگتی تھی نہ جس زمین میں کاہ — رتبے میں وہ ہوگئی فلک جاہ

Marfat.com

جس راہ میں کٹ گئے تھے لشکر　　چلتا تھا ہر اک اچھالتا زر
مشغول تھے بسکہ معدلت　　رونق تھی نظام سلطنت

مگر یہ دور زیادہ دیر نہ چلا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا شاہی فوج باغی ہوگئی۔

لیکن یہ فلک جو کینہ ور ہے　　حاسد ہے عدو ہے فتنہ گر ہے
لایا تو غضب کا رنگ لایا　　مئے کے عوض لہو پلایا
سچ کہتے ہیں بات ہونے والی　　اک وجہ جو آ پڑی نرالی
اس وجہ کو اتفاق کہئے　　یا دشمنی و نفاق کہئے
اشرار بنی گئی رعیت　　اس زال کی سب نے چاہی ذلت
تقدیر جو اس کی آہ بگڑی　　لشکر بگڑا سپاہ بگڑی
گھیرا اُسے باغیوں نے آکر　　خوش ہونے لگے اُسے ستا کر
اس زال کا جب ہوا یہ حال　　کیا ملک کا عرض کیجئے حال

ہر طرف طوائف الملوکی تھی۔ دفتر پھونکے جا رہے تھے۔ خزانے لوٹے جا رہے تھے لیکن بڑی ہشیاری و بربادی سے انگریزوں نے فتنہ پر قابو پا لیا مگر حقیقت تو یہ ہے تاجروں سے تجارت تو ہو سکتی ہے حکومت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ مادرِ ہند نے ۱۸۵۸ء میں اپنے آپ کو شاہِ انگلستان کے سپرد کیا اور اس کی سرپرستی قبول کی ہندوستان میں چاروں طرف ترقی ہونے لگی اور اس کا پوری دُنیا کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا۔ مشینی دور کا آغاز ہوا۔ ملیں بنیں۔ ریلوے جاری ہوئی۔ تعلیم پر کافی دولت خرچ ہونے لگی۔ میڈیکل، انجینئرنگ، اور اگریکلچر کالج کھولے گئے۔ ہسپتال کھولے گئے۔ نہریں کھدوائی گئیں۔ اور آب پاشی کی توسیعات کا کام ہوا۔ پریس اور چھاپہ خانہ قائم ہوا۔ ڈاک و تار کا کام ہونے لگا۔ گویا مادرِ ہند کا کوئی پہلو اس مراعات سے محروم نہیں رہا۔ اب اگر تصویر کے دوسرے رُخ پر نظر ڈالیں اور سوچیں، جیسا کہ پورا ہندوستان الگ الگ صوبوں میں بٹا ہوا تھا راجوں مہاراجوں اور نوابوں نے چھوٹی

Marfat.com

چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں جو آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اگر انگریز پورے ملک کے رجواڑوں کو ایک مالا میں نہ پرو دیتے تو کیا مندرجہ بالا ترقیاں اس صورت میں ممکن تھیں، نہ جلدی سے قدیم طرز کی زندگی کو خیرباد کیا جاتا، نہ عوامی عدالتیں جلد قائم ہوتیں نہ مفتی و قاضیوں کی جگہ جج لے پاتے۔ ہندوستان میں شہنشاہ انگلستان کوئین وکٹوریہ کے دور کی ترقی ملاحظہ ہو ؎

| | |
|---|---|
| ہے اب جو بہار کا زمانہ | یوں ہے لبِ خامہ پر ترانہ |
| بدلا ہے جو رنگ آسماں نے | پہنی ہے نئی قبا جہاں نے |
| پھولوں نے کہیں لباس اُتارا | باغوں کو بہار نے سنوارا |
| لائی جو نسیم صبح گہنا | اترا کے عروسِ گل نے پہنا |
| سبزا کا پلٹ گیا زمانہ | بیگانہ تھا اب ہوا یگانہ |
| جب خاک طلا کا رنگ پکڑے | ہر ذرہ خوشی سے کیوں نہ اکڑے |
| ہے تیس برس سے عیش و عشرت | پائی ہے جہاں نے جو راحت |
| کاغذ کا لگا ہوا جو پر ہے | ایک طائرِ تیز پر خبر ہے |
| اسٹیم نے پائی اب وہ طاقت | رد کیے اُسے کیا افلاک کی طاقت |
| ہر لب پہ خوشی کا ہے ترانہ | یوں تینتس برس کٹا زمانہ |

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا زمانہ تھا۔ ہند میں برٹش راج کے تینتس سال پورے ہوئے تھے۔ جوبلی کے موقعہ پر شہنشاہ انگلستان کا جو اعلان ہوا غور فرمائیے ؎

| | |
|---|---|
| القصہ یہ حکم خاص آیا | حاضر ہو حضور میں رعایا |
| رحمت کی نگاہ سب پہ ہے آج | ہوا کس میں غنی کوئی کہ محتاج |
| کرنی ہو اگر کسی نے فریاد | سب طرح سے آج وہ ہے آزاد |
| جو چاہے کہے کرے نہ کچھ شک | پہنچے گی وہ عرض اس کی مجھ تک |

یہ اعلان سنتے ہی مادرِ ہند اپنے دونوں بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کے ساتھ دربار

Marfat.com

شہنشاہ میں پہنچی اور داد خواہ ہوئی۔ ؎

خواہش ہے مال کی نہ زر کی — اولاد کی دھن ہے اور گھر کی
کچھ حد سے شہنشاہ گزرتی ہوں میں — اولاد کی سعی کرتی ہوں میں
ہر طرح سے بردبار بھی ہیں — ذی فہم بھی ذی وقار بھی ہیں
ظاہر کی ہو یہ سفید پوشاک — باطن میں نہیں ہے پاس کچھ خاک
طاقت میں بھی مال و زر میں بھی کم ہیں — ہیں علم میں کم ہنر میں بھی کم ہیں
اُمید عطائے خسروی ہے — اس آس پہ ان کا دل قوی ہے
شاہا اگر آستاں پہ آئیں — منہ مانگی مراد تجھ سے پائیں
دولت کی ترقیاں ہوں ہر دن — اور عمر میں ہو ہمارا ہم سن
چپ ہوئی عرض کر کے وہ زال — حضرت نے سُنا تمام احوال

مادرِ ہند کی فریاد پر شہنشاہ انگلستان کا جواب بھی قابلِ غور ہے ؎

بیٹوں میں ترے ہے گو شرافت — صورت سے ٹپکتی ہے نجابت
دونوں میں مگر دلی نہیں میل — سمجھتے ہیں وہ اس نفاق کو کھیل
جب علم و عمل میں ہوں گے کامل — تب ہوگا نفاق دل سے زائل
کچھ اور دنوں ابھی سبق لیں — تب مانگ کے مجھ سے اپنا حق لیں
پوتا میرا ہوگا زینتِ تخت — چمکے گا ترا ستارۂ بخت
سوراج عطا کرے گا وہ شاہ — بڑھ جائے گی تیری شوکت و جاہ
بیٹے ترے حکمراں بنیں گے — سردارِ جہانیاں بنیں گے
بر آئے گی سب طرح کی اُمید — ہوگا تیرے واسطے وہ دن عید

شاد عظیم آبادی کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ بغیر کشت و خوں بہائے مادرِ ہند کو ۱۹۴۷ء میں سوراج ملا۔

افسوس یہ ہے کہ "مادرِ ہند" جیسی عمدہ تاریخی و سیاسی مثنوی کو وہ قدر منزلت نصیب نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق تھی۔ شاد عظیم آبادی نے

تاریخی موضوع کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے کہ اُسے کہیں بھی خشک نہیں ہونے دیا۔ ابتدا سے انتہا تک موصوف نے مثنوی کو محاکات نگاری کی کیفیات سے موج زن رکھا۔ اس میں سادہ صاف ستھری رواں زبان، عام فہم استعارے فصیح محاورے کا استعمال کیا ہے جو مصنف کے پیش رووں کا دستور تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سوتا سنسار جاگتا رب — الحق یہی سچ ہے اور غلط سب

پھل پھول کا جنگلوں کے لیا مول — بک جاتے تھے وہ سونے کی تول

دل دونوں کے ہو گئے دگرگوں — دونوں کا سفید ہو گیا خوں

بنیاد اماں کو بھی ہلا دے — گھر لاکھ کا خاک میں ملا دے

الفت سے ہر ایک پر نظر کی — کس جوش سے لیں بلائیں سر کی

جس راہ میں کٹ جاتے تھے لشکر — چلتا تھا ہر اک اچھالتا زر

پھر خبر کہاں سے آ گیا شر — منڈلاتی تھیں شامتیں سروں پر

جس طرح بنے خودی مٹاؤ — دل سے من و تو کو بھلاؤ

مثنوی میں کچھ مقامات ایسے بھی آئے جہاں رزمیہ شان پیدا کی جا سکتی تھی۔ مگر شاد کا اصل مقصد رزم نامہ لکھنا نہیں تھا۔ اس لئے اس نے تاریخی واقعات کو استعارے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا۔ غرض تاریخی نظم میں جہاں محاکات واقعہ نگاری اور مصوری لازمی عنصر ہیں ان سے مثنوی عاری نہیں، بلکہ واردات قلبی اور کیفیات سے لبریز ہے۔ تاریخ جو خشک موضوع ہے شاد نے شاعرانہ کمال سے اُسے خشک نہیں ہونے دیا۔

مثنوی کے اختتام پر شاد نے اپنے عہد کے شعرا کی توجہ کلام کی بے قدری اور اُردو زبان کی کس مپرسی کی طرف مبذول کی

Marfat.com

ہے ہے

اب عرض میری ہے شاعروں سے — والا نظروں کے ماہروں سے
یہ فن شریف شاعری نام — ہوتا بخیر جس کا انجام
جاتا رہا رکھ رکھاؤ اس کا — دُنیا سے ہے چل چلاؤ اس کا
معدوم اب اس کے ہیں خریدار — اُردو کا اجڑ رہا ہے بازار

شاد عظیم آبادی نے آج سے تقریبًا اسی نوے سال پہلے محسوس کر لیا تھا کہ اُردو زبان کا مستقبل تاریک ہے۔ حالانکہ اس وقت اُردو انگریزی کے ساتھ ساتھ ملک کی سرکاری زبان تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اس پر کیا گزری ہے۔ قاری اندازہ لگا سکتے ہیں، اور سوچ سکتے ہیں اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس وقت جب کہ اُردو ملک سرکاری زبان بھی نہیں ہے۔

Marfat.com

# ناظم

نام برج نرائن ورما۔ تخلص ناظم تھا۔ سنہ ولادت، وفات کے بارے میں پتہ نہ چل سکا۔ مثنوی کا نام سال تصنیف حسب و نسب خاندانی حالات زندگی اور ریاست جنید کے دربار سے وابستگی کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ ان کی اپنی تصنیف مثنوی "پھول نامہ" کے عنوانات، تمہید اور ریاست جنید، کے تحت درج ہیں۔ ناظم کے والد کا نام رگھبیر چرن تھا۔ قصبہ علی گنج کے رہنے والے تھے۔ مثنوی "پھول نامہ" کی تصنیف کے وقت پنجاب ضلع سنگرور میں سکونت پذیر تھے۔ قوم کے کائستھ، ذات سکسینہ، مذہب آریہ بریا کاشپ گوت تھا۔ وزیر دوئم کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ منجھلے بھائی کا نام اودھ نرائن تھا جو قانون کی اچھی واقفیت رکھتا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی گوکل نرائن کی فرمائش پر مثنوی "پھول نامہ" مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں لکھی۔ اپنے بھائی کو ہی تالیف کا حق بخشا۔ تمہید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سن عیسوی بستی صدی کا — دوراں میں سال دوئمی تھا
سوجھا مجھے پر بہار مضموں — لکھی تاریخ جنید موزوں
مضموں ہیں خوشگوار عامہ — موسوم بنام "پھول نامہ"
میں برج نرائن اس کا ناظم — رکھتا ہوں تخلص اپنا ناظم
منشی رگھبیر چرن کا فرزند — ہوں راسخ الاعتقاد و دلبند
ہوں ساکن قصبہ علی گنج — ہر شخص ہے اس جگہ سخن سنج
ہے مسکن حال میرا سنگرور — کائستھ کی قوم ہے جو مشہور
سکسینہ ہے ایک ذات اس میں — موصوف بہر صفات اس میں
کاشپ گوت آل ہے بسریا — آباد ہے قرب گنگ دریا

Marfat.com

اس قوم و ذات و ذیل کا ہوں　　مذہب کا میں آز ساحر یا ہوں

اور "ریاست جنید" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں ؎

ہے معتمد ایک بہر خدمات　　صوبہ پنجاب میں تعینات
اس معتمدی پہ میں ہوں ممتاز　　ما قبل جو پائے میں نے اعزاز
ناظم النہار و میر منشی　　دیوان ریاست اور بخشی
ناظم ملکی اور بند و بستی　　اور صدر میں ممبر کمیٹی [1]

**مثنوی پھول نامہ** قدما کی طرح ناظم نے اس مثنوی کی ابتدا حمد باری تعالےٰ سے کی ہے۔ مثنوی کا مختصر پس منظر اس طرح ہے۔ صوبہ پنجاب چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ والیان نابھ، پٹیالہ، جنید، کیتھل، ہانسی، لاہور وغیرہ آپس میں اکثر برسر پیکار رہتے تھے۔ ناظم نے مثنوی "پھول نامہ" میں ریاست جنید کے راجاؤں، مہاراجاؤں کے نظم و نسق ان کی شادیاں، اولاد، عوام کی فلاح و بہبود کے انتظامات، تعمیرات و توسیعات آب پاشی کے کاموں کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ راجہ جبیل کے بیٹے راجہ بیم راؤ جبیل ۱۴۳۶ سنہ بکری میں گدی پر بیٹھے۔ ان کی وفات کے بعد راؤ جوندھر ۱۴۷۱ سنہ بکری میں مسند نشین ہوئے۔ جب مغل بادشاہ بابر نے ہندوستان کا رُخ کیا اور لاہور پر چڑھائی کی تو راجہ سنگر نے دو سال تک اس کی مدد کی۔ بعد میں سنگر کے بیٹے بیرم نے پانی پت کے میدان میں بابر کی مدد کی، دہلی کے بادشاہ لودھی کو شکست ہوئی۔ بابر کو دہلی کا تخت ہاتھ لگا۔ بدلے میں بابر نے بیرم کو سنگر چودھر کا خطاب دیا اور مالوہ کی صوبہ داری بھی پیٹہ میں عطا کی۔ چودھر خاندان خوب پھلا پھولا۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اپنے دورِ حکومت میں پھول کے راجہ کو سنہری سند لکھ دی اور اپنا دایاں بازو سمجھنے لگا۔ مگر بعد میں دہلی کے ناظم عبدالاحد خاں نے فرخ افسر شمرو کو ریاست

---

[1] رائے بہادر لالہ موہن لال "مثنوی پھول نامہ" در مطبع مفید عام لاہور ۱۹۱۳ء کل صفحات ۲۲۴

جنید پر چڑھائی کرنے کے لئے شاہی لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں جم کر لڑائی ہوئی جس میں شاہی فوج کو منہ کی کھانی پڑی۔ شاہ عالم کے زمانے میں مرہٹہ مادھوجی سندھیا کا بول بالا تھا۔ ایک بار موقعہ پاکر شاہ عالم کے وزیر غلام قادر روہیلہ نے شاہ کی آنکھیں نکلوادیں اور خود تخت دہلی پر بیٹھ گیا۔ مادھوجی سندھیا کو جب معلوم ہوا تو فوراً دہلی پر دھاوا بول دیا۔ روہیلہ وزیر غلام قادر کو قلعہ کے اندر موت کے گھاٹ اُتار کر بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد سندھیا نے پٹیالہ کا رُخ کیا مگر شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ ۱۸۰۲ء میں انگریز جنرل لیک نے مادھوجی سندھیا کو شکست دی۔ اگرچہ سکھوں نے سندھیا کی مدد کی مگر ریاست پھول کے رؤسا نے نہ صرف اپنے آپ کو لڑائی سے دُور رکھا بلکہ برٹش جنرل کی اطاعت قبول کرلی۔ ۱۸۰۵ء میں ملک میں افراتفری کا دَور تھا جسونت راؤ ہولکر نے انگریزوں سے ٹکر لی۔ سکھوں کو بھی ترغیب دی وہ بھی انگریزوں کے خلاف شورش کرنے پر آمادہ ہوں لڑائی میں کامیابی نے انگریزوں کے قدم چومے۔ جب ہولکر کو کہیں کامیابی نہ مل سکی تو مجبوراً انگریزوں سے صلح کر کے اندور کا رُخ کیا۔ ۱۸۴۲ء میں برٹش فوج نے کابل پر چڑھائی کی راجہ جنید نے برٹش فوج کی مدد کی پیشکش کی، جسے قبول نہیں کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں شاہی فوج اپنے حاکم سے باغی ہوگئی۔ طوائف الملوکی کا دَور تھا۔ دفتر پھونکے جارہے تھے، خزانے لوٹے جارہے تھے۔ صوبہ پنجاب کی ریاست نے برٹش کا غدر میں ساتھ دیا اور انہیں خطاب ملے۔ مہاراجہ نراندر سنگھ کو ۱۸۶۳ء میں جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ ابھی رسم اعزاز پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مہاراجہ نراندر سنگھ کا انتقال ہوگیا۔ ۱۸۶۲ء میں مہاراجہ رگھبیر سنگھ کی مسند نشینی ہوئی۔ اس کے عہد میں دارالخلافہ سنگرور میں جوبلی کالج اور جوبلی ہسپتال کی تعمیر ہوئی۔ ترقیات و توسیعات آبپاشی عہد رنبیر سنگھ میں بھی ہوئی۔ دریائے ستلج اور جمنا سے نہریں نکلیں۔ ۸ فروری ۱۸۹۰ء میں شہزادہ وکٹر پٹیالہ آیا۔ ۱۸۹۰ء میں خالصہ کالج امرتسر ۱۸۹۳ء میں سنگرور میں تار برقی کا سلسلہ شروع ہوا۔

Marfat.com

مہاراجہ جنید نے مہم افغان اور مہم مصر میں برٹش کا ساتھ دیا تھا اور لڑائی میں مدد کی تھی۔ جنگ یویز مہم چین کے دوران بھی جنید نے برٹش حکومت کی مدد کی بجنتہ ۱۹ء ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے بعد ایڈورڈ ہفتم بادشاہ بنا۔ ادھر دیوان سنگھ کی وفات کے بعد شمشیر سنگھ مالکِ جاگیر ہوئے۔ جاگیر بڈردکھاں جاگیر دیال پور۔ میں سردار بلاقی سنگھ کا بیٹا سکھ جیون سنگھ کے عہد ۱۹ء پر مثنوی اپنے اختتام پر پہنچتی ہے۔

"کشورِ ہند" کے عنوان کے تحت ہندوستان کی تعریف ملاحظہ ہو ؎

اقطاعِ زمیں ہیں جتنے معمور
ہے کشورِ ہند ان میں مشہور

زرخیزی میں ہے وہ سب سے بڑھ کر
اور آب و ہوا کمالِ خوشتر

پھل پھول جو ہیں وہ خوشنما ہیں
اور پاک ہیں جتنی دریا ہیں

اسی عنوان کے تحت آگے فرماتے ہیں۔ انگلستان میں ایڈورڈ ہفتم کا دور دورہ ہے۔ ہندوستان میں لارڈ کرزن شہنشاہ انگلستان کا نائب مقرر ہے۔ برٹش راج میں جہاں ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بے پناہ ترقی ہوئی وہاں پنجاب بھی اس کی کرم فرمائی سے محروم نہ رہا ؎

برٹش کی ہے اب جو بادشاہی
حقا کہ ہے سایۂ الٰہی

ہے ملک میں اس کے وہ کرامات
روشن رہتا ہے مہر دن رات

قیصر جو ہیں ایڈورڈ ہفتم
ہیں اپنے زمانے کے وہ حاتم

تعلیم کو عام کر دیا ہے
تہذیب کو اس میں بھر دیا ہے

نہروں کا وہ کام کر دیا ہے
قحطوں کو تمام کر دیا ہے

سڑکیں اور ریلوے بنا کے
رہ رو کئے بے خطر سفر سے

ہر شہر میں ہسپتال بنایا
امراض کو خاک میں ملایا

از بہرِ رفاہِ خاص و عام
جاری کیا تار و ڈاک کا کام

"ریاست جنید" کے عنوان کے تحت بڑی تفصیل سے ریاست جنید کی تعریف کی اس کا رقبہ مہاراجہ کی سپاہ کی تعداد مہاراجہ کے اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ دربار کا نقشہ ایک شعر

Marfat.com

میں یوں کھینچا ہے ؎

سردار و اہلِ سیف دائیں　　　اور اہلِ قلم تمام بائیں

"بلدۂ جنید" اور "دار الخلافہ سنگرور" کے ذکر کے بعد تاریخ کے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے ناظم نے راجہ جیسل کے عہد سے منظوم تاریخ کی ابتدا کی ہے۔ اختصار سے راجہ کا نام، ریاست میں اس کی مسند نشینی کی مدت نیز مغلیہ بادشاہوں کے ساتھ سیاسی تعلقات کا ذکر کرکے ایک جگہ فرماتے ہیں۔ راجہ سنگر کے بیٹے بیرم نے بابر بادشاہ کی پانی پت کے میدان میں لودھی بادشاہ کے خلاف مدد کی۔ بابر دہلی کے تخت پر قابض ہوا۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سنگر کا پسر جو تھا دلاور　　　بیرم مشہور تھا بہادر

بابر نے کردی جو فتح دہلی　　　اور واقع ہوئی شکستِ لودھی

بیرم کو دیلا کے دے کے عزت　　　کریاد پدر کی اس کے خدمت

چودھر کا خطاب اس کو بخشا　　　پٹہ دیا نیز مالوہ کا

مہاراجہ جنید کی شہرت مغلیہ بادشاہوں کے امراء و وزراء کے ذہن میں اکثر باعث شک و حسد بنی رہتی تھی۔ ۱۷۶۶ء میں صوبہ دہلی کے ناظم عبد الاحد خان نے ایک فرنچ فوجی شمرو کو لشکر شاہی کے ساتھ جنید پر چڑھائی کرنے کے لئے روانہ کیا۔ لڑائی میں شاہی فوج کو دھول چاٹنی پڑی ؎

صوبۂ دہلی کا تھا جو ناظم　　　تسخیرِ جنید کی تھا عازم

تھا نام کا عبد الاحد خاں وہ　　　تھا جنگ میں سخت جانستاں وہ

تھا ایک فرنچ نام شمرو　　　فوجی افسر جوان خوش رو

اس کو دیا حکم دے کے لشکر　　　کیجئے تسخیر جنید جا کر

پانی پت میں تھا ایک میداں　　　دشمن پہ ہوئے وہاں خروشاں

دشمن بھی مقابلہ پہ آیا　　　پہ تاب مقابلہ نہ لایا

اس طرح جہاں کہیں جنگ کی منظر کشی یا لڑائی کا ذکر کیا ہے کلام میں بلند آہنگی اس

Marfat.com

طرح سے نہیں پائی جاتی کہ جس سے مثنوی میں رزمیہ شان پیدا ہو جائے۔ ۱۸۵۷ء میں جب شاہی فوج میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی اُس وقت جنید کی ریاست پر مہاراجہ نراندر سنگھ کی حکومت تھی۔ اس نے برٹش حکومت کا ساتھ دیا برٹش حکومت نے اس کو ۱۸۶۳ء میں جی۔سی۔ایس۔آئی کا خطاب دیا۔ مہاراجہ نراندر سنگھ کی ۱۸۶۴ء میں وفات ہوئی۔ مہاراجہ رگھبیر سنگھ مسند نشین ہوئے۔ ان کے عہد میں تعمیرات ترقیات و توسیعات آب پاشی کا اعلیٰ پیمانہ پر کام ہوا۔ ؎

از بہر علاج خشک سالی — ستلج سے بنائے نہر ڈالی
ہمسایہ ریاستیں و برٹش — شامل ہوئیں اور شریک کوشش
گیارہ لکھ لگ کے خرچہ جنید — قائم ہوا اُس میں حقہ جنید
روپڑ سے وہ نہر ہے نکالی — سنگرور میں اُس کی شاخ ڈالی
جو غرب جمن سے نہر نکلی — صورت برٹش نے اُس کی بدلی
تھی جنید میں اس کی آبپاشی — برٹش نے حوالہ جنید کے کی

ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعہ پر عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دارالخلافہ سنگرور میں جوبلی ہسپتال اور جوبلی کالج کی تعمیر ہوئی۔ ۸ فروری ۱۸۹۰ء میں شہزادہ وکٹر پٹیالہ تشریف لائے۔ پنجاب کی کئی ریاستوں کی ترقی ہوئی گویا صوبہ پنجاب کے بھاگ کھل گئے۔ امرتسر میں خالصہ کالج کی تعمیر ہوئی ۱۸۹۰ء میں سنگرور تار برقی کا کام جاری ہوا۔

۱۹۰۷ء میں جاگیر دیال پورہ میں سردار ٹلا قی سنگھ کا بیٹا سکھ چین سنگھ کے عہد پر مثنوی کا اختتام ہو جاتا ہے۔

۱۹۰۲ء میں مثنوی کی ابتدا ہوئی اور ۱۹۰۷ء میں پانچ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچی۔

مثنوی "پھول نامہ" ریاست جنید کے راجوں مہاراجوں کی منظوم تاریخ ہے۔

Marfat.com

اس میں جن شخصیتوں کا تذکرہ ہوا یا واقعات معہ سنہ وسال نظم ہوئے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے مستند ہیں۔ مصنّف نے مؤرخانہ فرائض کو کافی حد تک بخوبی سرانجام دیا ہے۔ مگر تاریخی و رزمیہ مثنویوں کے لیے جہاں زورِ کلام بلند آہنگی اور پُر شکوہ انداز بیان کی اشد ضرورت ہوتی ہے اس سے مثنوی عاری ہے۔ تاریخی مثنوی کے لئے واقعہ نگاری بھی بہترین لوازمات میں سے ہے جس سے بعض وقت چھوٹے چھوٹے واقعات کی مجمل تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی کمزور نہیں۔

ناظم نے آخری عنوان " جاگیر دیال پورہ " قائم کیا ہے۔ جس پر مثنوی اختتام پذیر ہوتی ہے ؎

ہے دیال پورہ مضاف یہاں کا — ہے جنید کا وہ بھی آل تمغا
سردار مُلاقی سنگھ کا بیٹا — لائق سکھ چین سنگھ کا تھا
آباد یہاں ہے اس کی اولاد — اوسطِ حالت میں شاد آباد

آخر میں " خاتمہ کتاب " کا عنوان ہے جس میں مجموعی طور پر راجاؤں کی شان، ان کے اوصاف، عادات اور ریاست کی آمدنی کو کس طرح عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کیا جاتا تھا غور فرمایئے ؎

دن بھر تو کیا کریں عدالت — فرمائیں وہ رات کو عبادت
دورہ میں رہیں بموسم سرد — شملہ میں رہیں بموسم گرد
برسات میں مے کشی دوا ہے — صیدافگنی ابر میں روا ہے
اوقات کو اس طرح سے دیں بانٹ — پھر آمدنی کو یوں وہ لیں بانٹ
یک عشرہ بخدمتِ شہنشاہ — دو عشرہ سول کا خرچ تنخواہ
یک عشرہ کیا کریں وہ خیرات — یک عشرہ برائے ذات و محلات
دو عشرہ بخرچ فوج و لوکل — یک عشرہ میں ہوں عمارتیں کل
یک عشرہ رفاہ عام کے بیچ — جو عشرہ بچا تمام کے بیچ

Marfat.com

اس کو رکھیں داخلِ خزانہ      کہتے ہیں جسے گنجِ خسروانہ

منشی بلدیو سہائے صاحب خلف چُنّی لال صاحب متوطن شمس آباد نے تقریظ تاریخ جنید کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جس سے مثنوی مسلول… کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

سبحان اللہ یہ راج تاریخ      اور دیکھئے اندراج تاریخ
ناظم کی وہ ہی یہ مثنوی ہے      تاریخ جو آج جنید کی ہے
نسخہ ہے یہ مستند و محکم      ہیں اس کی روائتیں مسلّم
درج اس میں واقعات اصح      حالات و معاملات اصح
شعروں میں توارد نہ الحاق      لفظوں میں مبالغہ نہ اغراق
ترمیم نہ تخرجہ نہ تنسیخ      تصنیف کا سن ہے یہ خاص تاریخ
۱۹۰۲

مختصر یہ کہ یہ مثنوی ریاست جنید کا اجمالی خاکہ ہے جو تاریخی اعتبار سے مستند اور حالات و واقعات حقیقت و صداقت پر مبنی ہیں۔

Marfat.com

# سلامت علی رفیق

سلامت علی نام رفیقؔ تخلص تھا۔فتح پور کے رہنے والے تھے۔ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔رفیقؔ کا اُردو میں منظوم غزنی نامہ جو شاہنامہ کے طرز پر ہے۔خواجہ حسن نظامی دہلوی نے رفیقؔ کو حق تصنیف ادا کرکے پہلی بار ستمبر ۱۹۲۶ء میں آرمی پریس دہلی سے تبلیغی رفیقوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے شائع کیا۔رفیقؔ نے غزنی نامہ میں بھی اپنے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کیں غزنی نامہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رفیقؔ کے پیشِ نظر تاریخ فرشتہ کے علاوہ چند اور یورپی مؤرخین کی تاریخیں بھی تھیں۔

**غزنی نامہ**

سلامت علی رفیقؔ نے غزنی نامہ تصنیف کرکے تبلیغی رفیقوں کی معلومات میں اضافہ کیا۔جس کی ابتدا قدیم شعرا کی طرح حمد و نعت سے ہوتی ہے۔اس کے بعد ایک عنوان "گزارش" قائم کیا ہے جس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف محمود غزنی کا طرزِ جنگ اس طرح بیان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے،جس سے زمانے میں پھر سے تاریخی دَور آجائے۔مثنوی غزنی نامہ کا مختصر تعارف اس طرح ہے۔

ناصر الدین سبکتگین غزنی کے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے میں لگ گیا۔جب وہ بخارا و طوس کے معرکوں میں الجھا ہوا تھا تو راجہ جے پال والئ پنجاب پشاور و کابل کی ہوس ملک گیری نے غزنی پر حملہ کردیا۔جب سبکتگین کو یہ خبر طوس کے میدان میں ملی تو وہ فوراً اپنی فوج کو لے کر کوہستانی علاقہ میں ایک چشمہ کے نزدیک جے پال کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے آگیا۔سردی اپنے عروج پر تھی۔جے پال کی فوج کوہستانی علاقے کی شہسوار نہ تھی۔سردی کے موسم میں پہاڑی علاقہ میں ہندوستانی فوج کا لڑنا بہت مشکل تھا،برعکس سبکتگین کی فوج کوہستانی علاقے اور سردی میں لڑنے کی عادی تھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جے پال کی فوج کا بے شمار مالی و جانی نقصان ہوا۔اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔میدان جنگ میں صلح نامہ ہوا،جس کی رُو سے جے پال سالانہ باج گزاری دینے

Marfat.com

پر رضامند ہوا، اور اطاعت گزار رہنے کا اقرار کیا۔ سلطان کو اپنے فوجی سرداروں نے مشورہ دیا کہ ہندو راجہ شرارت کا پتلہ ہے اس سے صلح نہیں کرنی چاہیئے۔ مگر سبکتگین نے فوجی سرداروں کو اسلامی تعلیم اور ہدایات رب العلائی پر عمل کرنے پر زور دیا اور کہا جب دشمن لڑائی میں عاجز آجائے تو پھر اس سے لڑنا مردانگی کے خلاف ہے۔ راجہ جے پال کا دل صاف نہیں تھا۔ واپسی پر پنجاب پہنچتے ہی اس نے چھوٹے بڑے سبھی راجاؤں کو چٹھیاں لکھیں کہ سلطان ناصرالدین حملہ کرنے والا ہے۔ پنجاب کو فتح کرنے کے بعد کسی بھی راجے کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ قنوج۔ اجمیر۔ کالنجر تھانیسر۔ متھرا۔ گجرات کے راجاؤں نے جے پال کی مدد کی۔ اپنی فوجیں لڑنے کے لئے روانہ کیں۔ دوسری بار راجہ جے پال بے شمار فوج لے کر لمغان[1] پہنچا، جہاں اس کا ناصرالدین کی فوج سے سامنا ہوا۔ جے پال نے لڑائی میں شکست کھائی تیسری بار ۱۰۰۱ء میں جے پال نے غزنی پر حملہ کیا۔ اس وقت سلطان ناصرالدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا بیٹا محمود غزنی کا سلطان تھا۔ جے پال کی تیسری لڑائی محمود غزنی سے ہوئی۔ تیسری بار شکست کا منہ دیکھنے کے بعد جے پال نے خودکشی کر لی۔ انند پال راجہ بنا۔ ملتان سے قرمطی محمود کو نقصان پہنچانے اور پریشان کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ تو محمود نے ان کو سزا دینے کی خاطر ان پر چڑھائی کر دی۔ راجہ انند پال نہیں چاہتا تھا کہ محمود اس کے علاقے سے گزر کر ملتان پر حملہ کرے۔ اس لئے پہلے محمود نے انند پال پر چڑھائی کی۔ انند پال شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان نے پنجاب سے گزر کر ملتان پر حملہ کیا اور سازشیوں کو سخت سزا دی۔ محمود غزنی نے شکھو پال کو ملتان کا نگراں مقرر کیا اور واپس غزنی چلا گیا۔ انند پال نے راجہ پرم دیو، راجہ رام دیو، راجہ دیپال ہری، راجہ ہردت، راجہ کلچند، راجہ چندیل، راجہ چندرائے، راجہ بھیم پال اور راجہ دھرم دت کو اپنے ساتھ ملا کر غزنی پر چوتھا حملہ کیا۔ اس بار بھی انند پال کو شکست ہوئی۔

---

[1] ایک جگہ کا نام ہے جو جلال آباد کے جنوب اور غزنی کے شمال میں ہے۔ یہ مقام بھی سلطنت غزنی کا حصہ تھا۔

Marfat.com

انند پال کا ہاتھی میدان جنگ سے پیچھے مڑ گیا جسے دیکھتے ہی ہندوستانی فوج میں افراتفری پھیل گئی۔ ہندوستانی راجاؤں کی یہ فیصلہ کن شکست تھی۔ اس کے بعد محمود نے یکے بعد دیگرے ہندوستان پر کئی حملے کئے۔ بقول ایک مؤرخ تھانیسر سازش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سازشیوں کو سزا دینے کی خاطر ۱۰۱۲ء میں تھانیسر پر محمود نے حملہ کیا۔ بے شمار قرمطی قتل و گرفتار ہوئے۔ قنوج، متھرا پر حملے کے دوران بیشمار دولت غزنی کے ہاتھ لگی۔ خراج میں پانچ لاکھ بیس ہزار نقرئی سکے کے علاوہ تین سو پچاس ہاتھی بھی ملے۔ محمود نے ۱۰۲۳ء میں کالنجر پر حملہ کیا۔ جب محمود کو معلوم ہوا کہ گجرات بھی سازشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ تھانیسر اور متھرا کے برہمن مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے کے لئے یہاں اکٹھے ہو رہے ہیں، تو سازشی اجتماع کو منتشر کرنے کے لئے سومناتھ پر حملہ کیا۔ سومناتھ تین جانب سے سمندر سے گھرا ہوا تھا صرف ایک طرف خشکی کا راستہ تھا۔ محمود نے خشکی کے راستے سے حملہ کیا۔ حملہ سے پیشتر محمود کی فوج نے سمندر ساحل پر جتنی بھی کشتیاں تھیں ان پر پہلے قبضہ کر لیا جس میں سلطان کی کچھ سپاہ بیٹھ گئی۔ تاکہ باہر سے بحری امداد کہیں سے نہ آنے پائے۔ سومنات کو لوٹنے کے بعد دولت لے کر ۱۰۲۶ء میں سلطان غزنی لوٹ گیا۔ ۱۰۳۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔

غزنی نامہ کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے اس کے بعد عنوان "گذارش" قائم کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے غزنی نامہ کو تصنیف کرنے کے مقصد کا پتہ چلتا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں سلطان محمود کا طرز جنگ دکھا کر بدل دوں گا دنیا کا رنگ
سوا اس کے مقصد نہیں کوئی اور زمانے میں آجائے تاریخی دور

مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کی سلطان محمود غزنوی سے دلی ہمدردی ہے، جس کے جنگی معرکوں کی سطوت، شان و شوکت کے نغمے اپنی تصنیف "غزنی نامہ" میں الاپنا چاہتا ہے۔

سبکتگین نے جب غزنی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت کوہ سلمان کے قبائل

Marfat.com

بخارا کا خاں ایلک اور طوس کا حکمراں غزنی سلطنت سے ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ اپنی سلطنت کو مستحکم اور استواری سے حکومت کرنے کے لئے ان چھوٹے قبائلی حکمرانوں کو اپنے زیر کرنا ضروری تھا۔ جب ناصر الدین ان معرکوں میں الجھا ہوا تھا تو راجہ جے پال غزنی سلطنت پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ ناصر الدین کو یہ خبر طوس کے میدان میں ملی۔ طوس کا میدان فتح کرنے کے بعد سبکتگین جے پال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک کوہستانی چشمہ کے پاس فوجیں لے کر آ گیا۔ سبکتگین کی ہندوستانی فوج کے ساتھ یہ پہلی لڑائی تھی، جس میں راجہ جے پال کو شکست ہوئی اس کی فوج کا بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ جے پال میدانِ جنگ میں صلح پر آمادہ ہوا۔ جے پال کے ساتھ جنگ کا منظر ملاحظہ ہو۔

ہوا فتح میدان جب طوس کا
سُنا ناصر الدیں نے یہ ماجرا

تعجب نہیں شہر غزنی پہ بھی
کریں قبضہ افواج جے پال کی

ہوئی ایسے چشمے کے نزدیک جنگ
کہ دُنیا سے جا کر الٹے تھے ڈھنگ

کچھ ایسا ہوا برف باری کا زور
ہوا سرد ٹھنڈک سے پنجابی شور

اکڑنے لگی ہندی افواج سب
ہوا گویا نازل خدائی غضب

ٹھٹھر کر بہت آدمی مر گئے
اُتر موت کے گھاٹ اکثر گئے

ہزاروں ہوئے ہائے بے دست و پا
کہ سردی میں ہر آدمی سرد تھا

چلا ہندیوں کا نہ سردی سے زور
قیامت کا برپا تھا لشکر میں شور

جو تھی ناصر الدیں کی جنگی سپاہ
وہ عادی تھی کس طرح ہوتی تباہ

یہ جب دیکھا جے پال نے اپنا حال
کہ سردی سے جی ہو رہا ہے نڈھال

شکست اپنی سلطان سے مان کر
طلب جان بخشی بھی کی آن کر

ہوا فتح کا جب یہ چشمہ سبب
پریشان ہندی ہوئے سب کے سب

پھر اک بھیجی درخواست سلطان کے پاس
بصد عجز کی اس نے یہ التماس

رہوں گا ہمیشہ اطاعت گزار
یہ اقرار کرتا ہوں اے شہریار

Marfat.com

جے پال کی طرف سے جب صلح کی درخواست ناصر الدین کے پاس پہنچی تو سلطان نے اپنے فوجی افسروں سے مشورہ کیا۔ فوجی افسروں کی رائے ملاحظہ ہو ؎

نہیں اس طرح صلح منظور ہے — کہ جو فہم و ادراک سے دور ہے
ہمیں ایسی کب صلح درکار ہے — حقیقت میں جو ننگ ہے عار ہے
پسند ایسا ہرگز نہیں ہے طریق — شرارت کا پتلا ہے ہندو فریق
جو قابو میں آجائے دشمن شریر — نہ اس کو رہا پھر کرے اے امیر

ناصر الدین نے اپنے افسروں کے مشورہ سے اتفاق نہ کر کے یوں فرمایا ؎

یہ سن کر کہا ناصر الدین نے — بہت خوب ہیں آپ کے مشورے
مگر دیکھو اسلامی تعلیم کو — ہدایات رب العلائی پڑھو
کرو حسب تعلیم اسلام کام — زمانے میں باقی رہے جس کا نام
میری رائے میں ہے مناسب یہی — نہ فرمانِ رب میں ہو پہلو تہی
جو ہو جائے عاجز عدو کر کے جنگ — تو زیبا نہیں پھر کرے اس کو تنگ
نہ رد اس کی درخواست ہو صلح کی — اسی کے ہے پردے میں مردانگی

دوسرا حملہ جے پال نے غزنی پر کیا یا سبکتگین نے پنجاب پر۔ اس کے متعلق مصنف "غزنی نامہ" اور ہندو و یورپی مؤرخین کی الگ الگ رائے ہے۔ ؎

یہ حملہ بھی تھا راجہ جے پال کا — جسے بڑھ کے سلطان نے رد کیا تھا
یہ راجہ کا تھا دوسرا حملہ جو — اسی کو تو کہتے ہیں ہندو سنو
یہ ہے دوسرا حملہ سلطان کا — تعجب ہے بس اور لکھوں میں کیا
مؤرخ مگر جو تھا یورپی — غلط اس نے تاریخ ہے یہ لکھی

چونکہ رفیق کی دلی ہمدردی غزنی حکمران کے ساتھ ہے اس لئے اس نے ہر دفعہ جے پال۔ آنند پال اور جے پال ثانی کو حملہ آور قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے کئی حملے کئے۔ ہندوستان کے مندروں میں سالہا سال سے جمع بے شمار دولت ہیرے جواہرات سونے چاندی کے

Marfat.com

زیوات لوٹنے کی غرض سے متواتر حملے کئے۔ مگر رفیق نے یہ ظاہر کیا ہے کہ محمود غزنوی کے ان سبھی حملوں کا محرک بھی ہندوستانی راجے مہاراجے تھے۔ جو ہر وقت غزنی سلطنت کے خلاف سازش بناتے رہتے تھے۔ جس کو دبانے کی خاطر محمود غزنوی نے مجبوراً ہندوستان پر حملے کئے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں کرتا ہوں اس جنگ کا اب بیاں — جو پردوں میں تاریخوں کے ہے نہاں
جو لمغان[1] میں فوج جے پال ہے — وہ لڑنے کو آئی بہر حال ہے
روانہ ہوا مُلکِ مُلتان کو — یہی اصل میں واقعہ ہے سُنو!
حملہ (سنہ ۳۹۶ھ) جو تھے شہر میں قرمطی امن سوز — وہ تھے فتنہ انگیزیاں کرتے روز
ضروری سمجھتا تھا سُلطان یہی — سزائیں انہیں دے جو ہیں قرمطی
تھانیسر تھا سازش کا مرکز جناب — اُسی واسطے شاہ نے بے حساب
حملہ (سنہ ۴۰۲ھ) کئے قتل آکر بہت قرمطی — گرفتار صدہا ہوئے سازشی
سوا اس کے کوئی نہ مقصد تھا ادھ — کہ ہو دور سازش یہاں کی بغور
جو راجہ ہے کشمیر کا پُر غضب — مگر اس کی تادیب کی جائے اب
حملہ (سنہ ۴۰۶ھ) کرے تا نہ گمراہ جے پال کو — نہ امداد دینے کی بھی جرأت ہو
حقیقت میں یہ حملہ گجرات پر — ضروری تھا محمود کو سَر بسر
جو تھا سازشی اجتماع اب یہاں — اُسے منتشر کرنا تھا بے گماں
ضروری بہت تھا کہ ان لوگوں کو — کرے ٹھیک محمود باغی ہوں جو

مندرجہ ذیل اشعار اور ان میں مستعمل الفاظ قابلِ غور ہیں جن سے ایک ہندوستانی شاعر کو ہندوستانی فوج کے متعلق جن الفاظ سے مخاطب کیا ہے اس سے نہ صرف مصنف کے ذہنی خلفشار کا پتہ چلتا ہے بلکہ تاریخ کے موضوع کے ساتھ مورخانہ ذمہ داری کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

یہ کفار کے روکنے کی تھی جنگ — نہ تھا اس میں شامل کوئی اور رنگ
عدو کے جو حملوں کو روکا گیا — اسی سے گنہگار سلطاں ہوا
یہ دیکھو تو ہے کتنی حیرت کی بات — جو بکتے ہیں سب آریہ واہیات

---

[1] ایک جگہ کا نام ہے جو جلال آباد کے جنوب اور غزنی کے شمال میں ہے۔ یہ مقام سلطنت غزنی کا حصہ تھا۔

Marfat.com

پسند ایسا ہرگز نہیں ہے طریق
شرارت کا پتلہ ہے ہندی فریق

جو قابو میں آجائے دشمن شریر
نہ اُس کو رہا پھر کرے اے امیر

ہوا نعرہ تکبیر کا جب بلند
ہوا گھٹ کے دم ہندی والوں کا بند

کئے قتل آکر بہت قرمطی
گرفتار صد ہا ہوئے سازشی

رفیق نے غزنی نامہ میں جہاں کہیں بھی یورپی، ہندو مؤرخ کا حوالہ دیا ہے اُس کا نام یا تاریخی کتاب کا حوالہ کی وضاحت نہیں کی صرف دو جگہ مؤرخ فرشتہ کا حوالہ ضرور دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کے سامنے "غزنی نامہ" نظم کرتے وقت کئی مؤرخین کی تاریخیں تھیں ؎

یہ راجہ کا تھا دوسرا حملہ جو
اسی کو تو کہتے ہیں ہندو سنو

مؤرخ مگر جو کہ تھا یورپی
غلط اُس نے تاریخ ہے یہ لکھی

میں کرتا ہوں اس جنگ کا اب بیاں
جو پردوں میں تاریخوں کے ہے نہاں

سنو قصہ اب لوٹ کے مال کا
کہ ایک ہندو مؤرخ نے ہے جو لکھا

موافق فرشتہ کے ہے عرضِ حال
جو تحریر کرتا ہوں بے قیل و قال

اُسے بلکہ غزنی وہ لے کر گیا
فرشتہ میں اس طرح سے ہے لکھا

رفیق کا مقصد ہندوستانی قوم کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اپنی ابتدائی تاریخ سے آگاہ کرنا نہیں تھا بلکہ ہندوستانی قوم کے ایک طبقہ مسلمانوں کے کم تعلیم یافتہ عورت مرد کو تاریخی حقائق سے گمراہ کرنا تھا، ان کے دلوں میں نفرت کا بیج بونا تھا۔ جس میں مصنف اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوا مصنف تاریخی واقعات کو پیش کرتے وقت نہ صرف غیر محتاط رہا بلکہ "غزنی نامہ" میں غیر مہذب و غیر شائستہ الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

مثنوی کی زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے جس کے پڑھنے سے کم تعلیم یافتہ قاری تاریخ جیسے خشک مضمون کے تاریخی واقعات کو جلدی سے ذہن نشین کر سکتے ہیں اور گمراہ ہو سکتے ہیں۔

بلند آہنگی و شکوہ الفاظ جو رزمیہ مثنویوں کی جان ہوتے ہیں، مثنوی اس لحاظ سے قدرے کمزور ہے، مگر روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

Marfat.com

# مسلم

حکیم حافظ محمد بشیر خاں صاحب کا تخلص مسلم تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ جنہوں نے تاریخ ہندوستان موسوم بہ "ہندوستانی شاہنامہ" چھوٹے چھوٹے حصوں میں تلخیصی انداز میں نظم کیا۔ بڑے بڑے واقعات کو بشیر محمد مسلم نے ہندوستان کے کم تعلیم یافتہ مسلمان عورتوں اور مردوں کے لئے خوبصورت انداز میں آسان ترین زبان میں اختصار سے نظم کیا ہے جو بڑی آسانی سے بچوں کے ذہنوں میں اتر جاتے ہیں۔ یہ کام تبلیغی سلسلہ کی ایک کڑی تھا، تاکہ مسلمان قوم کے بچوں کو اپنی ابتدائی تاریخ سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو سکے۔ خواجہ حسن نظامی نے بشیر محمد مسلم کو حق تصنیف ادا کر کے جون ۱۹۲۷ء میں پہلی بار دلی پرنٹنگ پریس سے پہلے دو حصے شائع کئے تھے۔

**ہندوستانی شاہنامہ**

بشیر محمد مسلم نے ہندوستانی شاہنامہ کی ابتداء حمد و نعت سے ہوتی ہے۔

"ذکر سببِ تالیف و تصنیفِ کتاب" کے عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ کچھ شاعری سے سروکار ہے — نہ اپنی لیاقت کا اظہار ہے
نہ دیو و پری کا یہ افسانہ ہے — نہ اس میں کوئی رنگ مستانہ ہے
نہ عشق و محبت کی ہے داستاں — نہ وصل اور ہجر کا ہے بیاں
جو تاریخی احوال ہے سر بسر — ہوا ہے وہ اشعار میں جلوہ گر
بہ ترکیب و ترتیب رسمِ عوام — رکھا ہند کا شاہنامہ ہے نام
جو مردانِ غزنی و غوری لقب — خلج تغلق و نیز لودھی ہیں سب
ازاں بعد اولادِ تیمور کا — بیاں نظم میں ہے مسلسل لکھا
اس طرح سے پھر بغور اور فکر — لکھا ہے تمام اہل لندن کا ذکر
اب آغاز کرتا ہوں اس کام کو — سنبھالے خدا اس کے انجام کو

Marfat.com

مذکورہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ بشیر محمد مسلم نے ہندوستان کی تاریخ کو نظم کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی کا دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

" پہلے حصے میں حضرت نوح کے فرزندوں تک کا تذکرہ ہے، اور دوسرے میں راجہ مالدیو تک کا حال ہے۔ جو ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کا ہمعصر تھا ......... ہندوستانی شاہنامہ کی اصل کیفیت تیسرے حصے سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلے دونوں حصے تو محض تمہید کے طور پر تھے۔ ہندوستان کی مفصل تاریخ رزم بزم تیسرے حصے سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد چوتھے پانچویں اور آگے کے سب حصوں میں نہایت عمدہ اور دلچسپ مسلسل تاریخی حالات لکھے گئے ہیں۔ پٹھانوں اور ان کے بعد مغلوں اور انگریزوں اور مرہٹوں اور سکھوں کے تاریخی حالات سلسلہ وار نہایت عمدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔"

" ہندوستانی شاہنامہ " کے دوسرے حصے کے آخری چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

توَلّد ہوئے سرورِ انبیاءؐ — محمدؐ بن مصطفٰے مجتبےٰ
شریعت ہوئی ان سے یاں آشکار — مسلماں ہوئی خلق یا کردگار
جو احوال ہے اہلِ اسلام کا — بیاں اُن کے ہے فوجی اعلام کا
وہ ہے حصۂ سیومی میں رقم — کہ تھے سب کے سب محترم محتشم
وہ حصہ جو کل طبع میں آئے گا — تو رنگ اپنا مضموں کا دکھلائے گا
کہ اُس میں ہے ذکر جدال و قتال — کسی کا ہے اوج اور کسی کا زوال
کیے نظم میں وہ بکوشش تمام — لیا طبعِ ناقص سے پیہم ہے کام

Marfat.com

کہ اک دم تواریخی حالات پر　　اٹھانا قلم کا تھا دشوار تر
خصوصاً وقوعاتِ رزمیہ کا　　نہیں نظم کرنا تھا آساں ذرا
خدایا ہوں آساں مری مشکلات　　چھپیں شاہنامہ کے کُل حصہ جات
خلائق کے مقبول ہوں دمبدم　　میرے دل میں باقی رہے پھر نہ غم

مندرجہ بالا اشعار پر مثنوی "ہندوستانی شاہنامہ" کا دوسرا حصہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے بشیر محمد مُسلم نے تاریخی واقعات کچھ تاریخوں کو پیشِ نظر رکھ کر نظم کئے ہوں گے۔ چونکہ ہندوستانی شاہنامہ کی اصل کیفیت تیسرے اور بعد کے حصوں میں بیان کی گئی ہیں، اور وہ حصے راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہو سکے۔ آیا چھپے ہیں یا نہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کی اہمیت اور مرتبہ کیا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے حصے کے عنوان " ذکر سببِ تالیف و تصنیف کتاب " اور خواجہ حسن نظامی کے مقدمہ کے مطالعہ سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ مُسلم نے "ہندوستانی شاہنامہ منظوم" کئی حصوں میں تصنیف ضرور کیا ہے۔

Marfat.com

# میر ایوب علی

میر ایوب علی علوی کے والد کا نام میر ذو الفقار علی علوی تھا۔ میر ایوب علی تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یو۔ پی میں ۲۶ جمادی الاوّل ۱۲۹۱ھ میں پیدا ہوئے ۶ ماہ رجب ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۱ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمقام حیدر آباد وفات پائی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ میر ایوب علی نے اُردو کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کی ایک مثنوی " یادِ علوی " دو نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔

## مثنوی یادِ علوی

میر ایوب علی نے " مثنوی یادِ علوی " ۱۳۶۱ھ میں تصنیف کی جو دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل میں ۹۱۶، اشعار اور حصہ دوم میں ۷۷۶، اشعار ہیں۔ " مثنوی یادِ علوی کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ایک مصنّف کا اصل قلمی نسخہ ہے جو م۔ع۔ علوی التھانوی ثم حیدر آباد کے پاس موجود ہے۔ دوسرا نسخہ نقل مطابق اصل جناب منشی حیدر علی علوی برادر عموی مصنّف کے پاس ہے جو دہلی میں محلہ بلیماران بارہ دری شیر افگن میں سکونت پذیر ہیں۔ اس مثنوی میں مصنّف نے اپنے دادا منشی میر امداد علی علوی قلندر تھانوی کی پیدائش سے لے کر تیس سال تک کی عمر کے حالات بطرز مثنوی قلمبند کئے ہیں۔ حضرت علوی کے حالات ممدوح کی روحانی فضیلت کی تفصیل کے ساتھ رموز و نکاتِ تصوف بھی تحریر کئے ہیں۔

حضرت میر امداد علی کے زمانہ نو عمری میں سانحہ ہندوستان یا غدر ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا جو در حقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی کی پہلی سب سے بڑی کوشش تھی۔ اور حالات ناموافقت میں کامیابی کی منزل کو نہ پہنچ سکی مگر تاجر حکمرانوں کو ہندوستانیوں کے جذبات کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ چونکہ میر ایوب علی نے " مثنوی یادِ علوی " میں غدر کے سانحہ کو اور اس کے تعلق سے قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یو۔ پی جو غدر کا ردِ عمل ہوا یا جنگ آزادی کی جو چنگاری بھڑکی تھی کے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اس لئے مثنوی کا دہ باب ہمارے موضوع " اُردو کی تاریخی مثنویاں " کا حصہ بنی ہے اور اہمیت کی حامل ہے۔

Marfat.com

جنگِ آزادی یا غدر کی ابتدا سب سے پہلے میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ سرکاری فوج نے بغاوت کردی اور اپنے حاکموں کو قتل کرنے لگے۔ دیکھا دیکھی ہند کی دوسری فوجیں بھی اس میں شریک ہوگئیں۔ یہاں تک کہ رعایا نے بھی بغاوت کردی۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حضرتِ علوی[1] بعد موت پدر ۔۔۔ رہے بے شغل کچھ دنوں گھر پر
گزری جب ایک سال کی مدت ۔۔۔ آئی ہندوستاں پہ اک آفت[2]
تھی جو میرٹھ میں فوج انگریزی ۔۔۔ اس نے سرکار سے بغاوت کی
قتل انگریز حاکموں کو کیا ۔۔۔ پھونکے دفتر خزانہ لوٹ لیا
دوسری فوجیں ہند کی بھی یونہیں ۔۔۔ ایک ہی ساتھ سب بگڑ اٹھیں[3]
ہوگئے سارے ملک میں ایکدم ۔۔۔ انتظامات درہم و برہم
منتشر ہر طرف جو فوج ہوئی ۔۔۔ تو رعایا نے بھی بغاوت کی

بغاوت کی چنگاری میرٹھ کے گردونواح میں بھی پھیل گئی۔ قصبہ تھانہ بھون کے قاضی مفتی اور عالموں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ جب انگریز حکومت کو اس کا علم ہوا اس چنگاری کو دبانے کے لئے فوج روانہ کی۔ مصنف کے دادا میر امداد علی نے بھی اس آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ قصبہ تھانہ بھون والوں کو پہلی کامیابی حاصل ہوئی قصبہ کے لوگ لاپرواہ نہیں تھے انہوں نے باہم صلاح کی کہ انگریزی فوج انتقام لینے کے لئے دوبارہ ضرور آئے گی۔ اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ بال بچوں کو کہیں محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔ حضرت علوی کو بھی اپنے خاندان کو لے کر نزدیک کے قصبہ کرانہ میں کچھ دنوں کے لئے جانا پڑا۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بگڑے تھانہ بھون کے بھی قاضی ۔۔۔ عالموں نے بھی ان کو ہمت دی
فوج و لشکر تو پاس کچھ بھی نہ تھا ۔۔۔ ہوگیا اک جہاد کا فتویٰ

---

[1] منشی میر امداد علی علوی [2] غدر ۱۸۵۷ء [3] یہ اشعار اصل قلمی نسخہ جو مصنف کا ہے اور م۔ع۔ علوی التھانوی حیدرآباد کے پاس موجود ہے سے لئے گئے ہیں۔

Marfat.com

سب مسلماں کئے گئے مجبور — کہ حکومت کا ساتھ چھوڑیں ضرور
مستعد ہو گئے خصومت پر — حملے کرنے لگے حکومت پر
جب حکومت نے دیکھا بگڑا رنگ — فوج ایک بھیجا دی برائے جنگ
فوج نے آ کے گھیرا قصبے کو — نکلے باشندے اس سے لڑنے کو
حضرت علوی بھی شریک ہوئے — لوگ مجبور کر کے لے آئے
نہ ادھر فوج تھی نہ ساماں تھا — کیا پھر بھی مقابلہ پورا
کام لینے لگے وہ توپوں سے — یہ بھی بندوقیں کچھ چلاتے رہے
فوج انگریزی نے کیا یہ کام — کہ جو قصبہ کا تھا حصارِ خام
مار کر گولے توڑ ڈالا اُسے — داخلِ قصبہ سب سپاہی ہوئے
اہلِ قصبہ نے جب یہ دیکھا حال — تو دکھایا بہادری کا کمال
نہ سنبھلنے دیا ذرا بھی اُنہیں — پھینکی بندوقیں کھینچی تلواریں
ان کے ذہنوں میں تھا یقین جہاد — تو ملی غیب سے بھی کچھ امداد
رہی کچھ دیر جنگ دست بدست — فوج کا حوصلہ ہوا پھر پست
آب شمشیر کی تھی طغیانی — فوج انگریزی جس میں ساری بہی
بھاگا جس کا جدھر کو منہ اُٹھا — ایک بچے تک ایک بھی نہ رہا
بھاگنے میں وہ بدحواسی تھی — ندی ہنڈن میں بارہ توپیں پھنسی
فوج کے جو سپاہی مارے گئے — گور کھے ان میں کچھ تھے کچھ سکھ تھے

پنجاب کے سکھوں اور نیپال کے گورکھا فوج نے غدر میں انگریزوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا جس کا پتہ اوپر کے اشعار سے چلتا ہے ۔

فتح جب پائی اہلِ قصبہ نے — تو وہ باہم صلاح کرنے لگے
فوج انگریزی اب پھر آئے گی — انتقام اس شکست کا لے گی
ہے مناسب ہمیں کہ گھر چھوڑیں — بال بچے کہیں بھی پہنچا دیں
حضرتِ علوی نے بھی چھوڑا گھر — چل دیئے اپنا خانداں لے کر

Marfat.com

ہے جو اک چودہ کوس پر قصبہ | تام پایا ہے جس نے کیرانہ
تھے وہاں رشتہ دار حضرت کے | کچھ دنوں ان کے پاس جا کر رہے

اسی اثنا میں سرکاری لشکر دوبارہ آ پہنچا، قصبہ کو خالی پایا۔ سبھی گھروں کو لوٹ لیا آخر کار جب غدر کی آگ بجھ گئی انگریزوں کو کامیابی ملی۔ دہلی بھی ان دنوں فتح ہوئی اور انگریزی اختیار میں آگئی۔ باغیوں کی تلاش ہوئی کچھ پکڑے گئے اور سزا پائی اور کچھ نے جھوٹ سچ بول کر رہائی پائی جب حضرت کو تلاش کی خبر ملی تو دہ کرانہ میں اپنا خاندان چھوڑ کر ضلع کرنال کی بستی کنجپورہ میں اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے۔ جہاں ماموں کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سن کے حضرت تلاش کی وہ خبر | مستعد ہو گئے برائے سفر
چھوڑ کرانہ خانداں سارا | تن تنہا سفر وہاں سے کیا
رہ گئے جا کے پاس ماموں کے | کنجپورہ میں جو کہ رہتے تھے
ضلع کرنال میں ہے یہ بستی | مختصر سی ہے اس کی آبادی
ماموں صاحب کی ایک تھی لڑکی | اس سے حضرت کی ہو گئی شادی
تھی جوان کی تلاش میں سرکار | سخت تر احتیاط تھی درکار
رات کو رہتے گھر میں ماموں کے | دن کو جنگل میں گھومتے پھرتے

شروع سے آخر تک "مثنوی یاد علوی" میں بلا کی روانی ہے۔ نہایت سلیس و عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے حالانکہ مصنّف نے کافی عرصہ کے بعد اپنے دادا سے سُنے سُنائے واقعات کو مثنوی کا موضوع بنایا ہے۔ مگر محسوس ایسا ہوتا ہے جیسے غدر کا حادثہ اس کا چشم دید حادثہ ہو۔

مصنّف کا مقصد اس سانحہ کو نظم کرنا نہیں تھا اس کا مقصد تو اپنے دادا کے اوائل عمر کے بیس تیس سالوں کے حالات کو نظم کرنا تھا۔ چونکہ یہ حادثہ بھی ان کے دادا کے جوانی کے دنوں کا ہے اس لئے مثنوی "یاد علوی" میں جگہ پا گیا۔

Marfat.com

# ناز

نانک چند نام، نازؔ تخلص تھا۔ مشورہ سخن ابوالفصاحت جوشؔ ملسیانی سے رہا۔ "روزنامہ پربھات۔ جالندھر" کے ایڈیٹر تھے انہوں نے دسویں گورو گوبند سنگھ کلغی دھر مہاراج کے فارسی زبان میں لکھے ہوئے منظوم "ظفرنامہ" کا اُردو مثنوی میں تشریحی ترجمہ ۱۹۵۲ء میں کیا۔ شری پنڈی داس سرورؔ نے بھی ۱۹۶۶ء اور سردار گوردیال سنگھ بھولا نے ۱۹۶۷ء میں "ظفرنامہ" کا ترجمہ کیا۔ نانک چند نازؔ نے گورو گوبند سنگھ صاحب کے "وچتر ناٹک" جس میں گورو جی نے اپنی زندگی کے بارے میں اپنے عہد کی مروجہ ہندی بھاشا یا انچی بانی میں لکھا تھا، اس کا بھی اُردو مثنوی میں تشریحی ترجمہ کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا جس کا اجمالاً ذکر آگے آئے گا۔

**مثنوی ظفرنامہ**[1]

نازؔ کا ظفرنامہ گورو گوبند سنگھ کے منظوم فارسی ظفرنامہ کا تشریحی ترجمہ ہے جو گورو جی نے اورنگ زیب کو لکھا تھا۔ اس منظوم رزمیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ ماچھی واڑہ میں لکھا گیا جس کی تکمیل کانگڑ میں ہوئی۔ اس ظفرنامہ میں گورو مہاراج نے ان معرکہ آرائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں انہوں نے چھوٹے چھوٹے ہندو پہاڑی سرداروں اور مغل فوج سے سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مطالعہ سے اس وقت کے پنجاب کے تاریخی واقعات نیز قوم میں ازسرِنو بیداری، خالصہ پنتھ کی بنیاد، انند پور صاحب سے اپنی روانگی، سری فتح گڑھ میں اپنے دونوں صاحب زادوں کی گرفتاری اور قتل، دو چھوٹے صاحب زادوں کا اورنگ زیب کے حکم سے زندہ دیوار میں چنوائے جانے کا ذکر نجف خاں اور ناہر خاں پٹھان فوجیوں کا قلعہ چمکور پر دھاوا بولنا۔ مرہٹوں اور راجپوتوں کا اورنگ زیب کو شکست دینے کے علاوہ شاہجہان کی گرفتاری اور قید ہونا۔ دارا اور دوسرے بھائیوں کی قسمت کا فیصلہ جس شاطرانہ و مکارانہ طریقے سے

---

[1] نانک چند نازؔ۔ ظفرنامہ تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء وزیر ہند پریس امرتسر۔ گورو گوبند سنگھ نے کبھی اپنے منظوم خط کو ظفرنامہ سے موسوم کیا۔

Marfat.com

کیا ہے اس کا بھی اجمالاً ذکر ہے ۔ چونکہ اورنگ زیب ہندوؤں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہا تھا۔ اس لئے خط میں اورنگ زیب کو بہت لعن طعن کی گئی ہے۔ ظفرنامہ کا اختتام نصیحت پر مبنی ہے۔

اس منظوم ظفرنامہ کا تعارف سب سے پہلے گر سبھا کے مصنف سیناپت نے کیا۔ سیناپت گر سبھا میں لکھتے ہیں ۔ جونہی یہ خط دیا سنگھ کی معرفت اورنگ زیب کو ملا وہ بہت شرمندہ اور متاثر ہوئے ۔ فوراً ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے گورو گوبند سنگھ سے کسی حد تک صلح ہو گئی ۔ موصوف نے مختصر یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اورنگ زیب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ گورو گوبند سنگھ اس سے ملے ۔ چونکہ اورنگ زیب کے ایلچیوں نے قلعہ چمکور کے محاصرہ کے وقت گورو گوبند سنگھ سے دھوکہ کیا تھا۔ جس کی ساری ذمہ داری اورنگ زیب پر عائد ہوتی ہے ۔ اگر اورنگ زیب نیک نیتی سے چاہتا کہ گورو جی ان سے ملے تو ساری دشمنی ختم ہو جاتی۔

جونہی سیناپت کی گر سبھا مکمل ہوئی گورو گوبند سنگھ جی کے چیلے بھائی منی سنگھ نے اپنے گورو کے کلام کو " دسم گرنتھ " کے نام سے ترتیب دیا " دسم گرنتھ " کے جتنے نسخے دستیاب ہیں ان میں یہ ظفرنامہ فارسی یا پنجابی زبان میں موجود ہے ۔

اس منظوم خط کا تعارف بابو جگن ناتھ داس نے بعد میں بنارس کے "اخبار ناگری پرچارنی پتر کا" ۱۹۲۲ء کے شمارہ جولائی اگست میں کرایا ۔ جسے بابو جگن ناتھ داس نے پٹنہ کے شری ہری مندر کے ایک پجاری بابا سمیر سنگھ صاحب کے پاس ۱۸۹۲ء میں دیکھا تھا ۔ کوہاٹ کے ایک ہندو کو بھی گورو گوبند سنگھ کے ظفرنامہ کی نقل کہیں سے دستیاب ہوئی تھی ۔ جس کا انہوں نے پنجابی زبان میں ترجمہ کر کے مع متن شائع کر دیا تھا۔ ظفرنامہ کا ایک قلمی نسخہ تاجور نجیب آبادی کے پاس بھی موجود تھا۔ جو نانک چند ناز کے لئے مطالعہ کا باعث بنا اور جس کا ناز نے پہلی بار ۱۹۵۲ء میں تشریحی ترجمہ اردو میں کر کے مع متن شائع کیا۔

ہم عصری مؤرخوں کی تاریخوں کی روشنی میں ظفرنامہ کی تاریخی اہمیت کسی حد تک بڑھ

Marfat.com

جاتی ہے۔ اس عہد کی تاریخوں کے مطالعہ سے تصدیق ہوتی ہے کہ گورو گوبند سنگھ کی ابتدائی لڑائیاں چھوٹے چھوٹے پہاڑی ہندو سرداروں سے ہوئیں۔ یہ پہاڑی سردار بُت پرست تھے، اور وحدانیت کے قائل نہ تھے۔ اس مذہبی نقطۂ نگاہ کی بنا پر جب گورو گوبند سنگھ پہاڑی سرداروں سے برسرِ پیکار تھے تو مغل فوجی دستہ پہاڑی سرداروں کی پشت پناہی پر آیا۔ ممکن ہے کہ فوجی کمک اورنگ زیب کے حکم سے نہ بھیجی گئی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کی رضامندی اس میں کارفرما نہ ہو۔ اورنگ زیب اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ چمکور کی لڑائی میں گورو جی کے دو بڑے صاحبزادے جامِ شہادت پی چکے تھے۔ اور جب آنندپور صاحب پر قبضہ ہوا تو دو چھوٹے صاحبزادے بھی گرفتار ہو گئے۔ ہم عصر مصنفین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ کے چند اشعار غور فرمائیے ؎

تیرا اس قدر بڑھ گیا تھا غرور | کھٹکتا تھا آنکھوں میں آنندپور
اسے جیتنے کا جب آیا خیال | تو اس خطہ کو کر دیا پائمال
پہاڑی علاقے کے راجے تمام | وطن ناشناسی میں مشہور عام
میری دشمنی پر کمر بستہ تھے | تری دوستی سے وہ پیوستہ تھے
تیری شہ سے فتنے اٹھاتے تھے وہ | مری راہ میں کانٹے بچھاتے تھے وہ
کئے میں نے ان میں سے اکثر ہلاک | چلا اس طرح خنجرِ خوفناک
میں وحدت پرست اور وہ بت پرست | انہیں مجھ سے پھر کیوں نہ ہوتی شکست
کروں اُن کی خاطر میں قربانیاں | مگر حیف پہنچائیں مجھ کو زیاں ۔ ص ۱۳۵

اورنگ زیب نے گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کے دو چھوٹے صاحبزادے دیوار میں چنوائے تھے، فرماتے ہیں ؎

نہ بچوں کی معصومیت کا خیال | کئے قتل تو نے مرے نونہال
پکڑ کر وہ چنوائے دیوار میں | نمونہ تھے جو اپنے ایثار میں
نہ تیرے ستم پر ہوئے سرنگوں | نہ غالب ہوا ان پہ تیرا جنوں

Marfat.com

مسلمان بننے سے منکر رہے — کئے جو تشدد وہ ہنس کر سہے
لڑائی میں دوا در بچوں نے بھی — تیرے جور سے جان قربان کی

اخبارات دربار معلّیٰ جے پور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے گورو گوبند سنگھ کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اُن کے سامنے پیش کر دیں۔ مرزا عنایت اللہ کی "احکام عالمگیری" کے ایک فرمان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ گورو گوبند سنگھ نے اورنگ زیب کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اورنگ زیب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ "احکام عالمگیری" کے دوسرے فرامین کے مطالعہ سے سینا پت کے بیانات کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اورنگ زیب کو گورو کا خط ملنے سے دونوں کے درمیان کسی حد تک صلح ہو گئی تھی۔ اورنگ زیب کے ایک گرزبردار اور ایک منصب دار محمد بیگ اور شیخ یار محمد کو مختار کر کے بھیجا کہ وہ منیم خاں کے ذریعہ گورو گوبند سنگھ سے ملیں اور انہیں ملاقات کے لئے راغب کریں۔ ان عام سچے تاریخی واقعات کے علاوہ ظفر نامہ میں اس بات کا بھی مفصل ذکر ہے کہ مغل سردار نے قلعہ چمکور صاحب کے محاصرہ کے دوران گورو جی سے عہد و پیمان کئے تھے کہ وہ بے خطر قلعہ چھوڑ دیں ان پر کسی قسم کا حملہ نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی کسی قسم کے انہیں مزاحم اٹھانے پڑیں گے۔ جونہی گورو جی کے ساتھیوں نے قلعہ سے باہر قدم رکھے مغل فوج نے دھاوا بول دیا۔ سب عہد و پیمان اللہ کی قسمیں توڑ دی گئیں۔ گو ہم عصر مصنفین کی تحریریں اس قسم کے عہد و پیمان کے بارے میں خاموش ہیں، مگر یہ عین ممکن ہے کہ کافی عرصہ تک قلعہ چمکور محاصرے کے بعد جب مغل فوج اُسے سر کرنے میں ناکام رہی ہو تو اس قسم کے عہد و پیمان کئے گئے ہوں۔ ۵

فریب اور دغا تیری ہر بات میں — فساد اور فتنہ تیری ذات میں
کیا لکھ کے وعدہ میری فوج سے — کہ ہوں گے مزاحم نہ ہم آپ سے
نکل جائیں گے اپنے قلعہ سے ہم — نہ ہوگا کوئی ہم کو حملے کا غم
مگر تو نے قول اپنا توڑا ہے خود — سر اپنی حکومت کا پھوڑا ہے خود
کیا تم نے حملہ میری فوج پر — وہ حملہ جو آخر ہوا بے اثر

Marfat.com

تو وعدہ خلاف اور پیماں شکن     تو بے اعتبار اور دریدہ دہن ۔ ص۲۵ ظفرنامہ

دوسری بار وعدہ خلافی کے موقعہ پر یوں فرماتے ہیں ؎

میری فوج نے جب تیری فوج پر     کیا حملہ تیغ و تبر تول کر
اچانک تیرے ایک سردار نے     میری سمت قاصد روانہ کئے
یہ قاصد بظاہر تو درویش تھے     مگر درحقیقت ریاکیش تھے
انہوں نے قسم کھائی قرآن کی     نمائش یہ تھی ان کے ایمان کی
کہا یہ کہ اب روکئے کشت و خون     بُرا ہے یہ جنگ و جدل کا جنوں
کریں گے نہ ہم آپ پر کوئی وار     یہ طے پائے آپس میں قول و قرار
مگر چند لمحے بھی گزرے نہ تھے     قسم توڑ دی تیرے سردار نے
کیا اُس نے حملہ میری فوج پر     سنبھالے پھر اُس نے بھی تیغ و تبر
یہ وعدہ خلافی روا ہے کہاں     تیری دوستی اب بتا ہے کہاں ۔ ص ۱۷ ـ ۳۷
نیا تو نے پیغام بھیجا ہے آج     نیا ایک قاصد بھی آیا ہے آج
تیرا یہ نیا وعدہ بھی ہے فریب     یہ خط یہ تیری دوستی ہے فریب
کرے گا جو اُس جھوٹ پر اعتبار     قیامت میں ہوگا ذلیل و خوار

علاوہ ازیں "ظفرنامہ" میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسے تاریخی پس منظر میں پرکھنا قدرے مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ظفرنامہ ایک منظوم خط ہے۔ مؤلف کتنا ہی ایماندار اور مؤرخانہ ذمہ داریوں کا پابند کیوں نہ ہو۔ شاعری کے لوازمات بعض اوقات اُسے مقصد اور حقائق سے دُور لے جاتے ہیں۔

مثلاً ظفرنامہ میں گورو گوبند سنگھ نے ذکر کیا ہے کہ میرا ایک ایک شورویر آپ کے دس لاکھ جوانوں پر حاوی ہے، کیوں نہ ہو جب ایشور مہربان ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ میدان جنگ میں چالیس آدمیوں نے دس لاکھ جوانوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر فتح پائی۔ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ چمکور کے قلعہ میں گورو گوبند سنگھ کے ساتھ صرف چالیس ہی آدمی تھے۔ لیکن ظفرنامہ کے یہ بیانات کسی ہم عصر شواہد کے بغیر

Marfat.com

نہیں مانے جا سکتے ؎

وہ تعداد میں صرف چالیس تھے | مِلا تھا نہ کھانا کئی روز سے
مگر بازوؤں میں تھی تاب و تواں | رگوں میں تھا خونِ شجاعت رواں
مگر ان پہ جو حملہ آور ہوئے | وہ تعداد میں پورے دس لاکھ تھے
یہ دس لاکھ کی فوج کچھ کم نہیں | حقیقت سے نا آشنا ہم نہیں

ایضاً ص ۸۵

"ظفر نامہ" کی اس قدر و منزلت کا تعین اس کے عام بیانات کی روشنی کے علاوہ اخلاقی پس منظر میں بھی کیا جانا چاہیے۔ گورو گوبند سنگھ کو پرماتما کی طاقت اس کی مہربانی پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بھگوان ہر وقت اپنے سچے بھگتوں کی مدد کرتا ہے، مصیبت کے وقت اُن کا ساتھ دیتا ہے اور انہیں دشمن پر قابو پانے کی قوّت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورو گوبند سنگھ کا آخری وقت تک بھی مغلیہ فوج بال بیکا نہ کر سکی۔ فرماتے ہیں ؎

کرشمہ اُسی کی خدائی کا ہے | کہ سب مرحلے کر لئے میں نے طے
میری فوج جب شہر میں گھر گئی | تیری فوج چاروں طرف سے بڑھی
تو میرے خدا نے بچایا مجھے | وہیں سر سے پار لایا مجھے
مصیبت میں وہ بن گیا میری ڈھال | میں اس کا پجاری "وہ میرا کال"
تیری فوج کی فوج اندھی ہوئی | یہی غیب سے میری امداد تھی
وہیں تیرا گھیرا ادھر رہ گیا | نکل آیا بچ کر میرا خالصہ

ایضاً ص ۱۴۷

گورو گوبند سنگھ کا مغلیہ سلطنت سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے سرداروں نے گورو گوبند سنگھ پر بے بنیاد لڑائی ٹھونسی۔ قرآن پاک اور خداوند کریم کی قسمیں کھائیں اور پھر انہیں توڑا۔ یہ سب کچھ شہنشاہ کی ایما پر ہوا۔ ایسے حالات میں جان بچانے کے لئے ہتھیار کا سہارا لینا ان کا آخری ذریعہ تھا۔ ؎

"چوں کار از ہمہ حیلتے در گزشت
حلال است بردن بہ شمشیر دست"

Marfat.com

قسم کی کسی نے بھی پروا نہ کی — اچانک ہوئی ہم پر لشکر کشی
یکایک وہ پیماں شکن آ گئے — یکایک وہ چاروں طرف چھا گئے
جب اس پر رہا کوئی چارہ نہ اور — ان اسباب پر جب کیا میں نے غور
تو مجھ کو بھی تلوار اٹھانی پڑی — جوانوں کی ہمت بڑھانی پڑی
کوئی اور حیلہ اگر رہ نہ جائے — تو دھرم آدمی کا ہے تلوار اٹھائے

ایضاً ص ۸۵-۸۶

تاہم یہ گورو گوبند سنگھ کا سوچا سمجھا فیصلہ تھا کہ اپنے بچاؤ کے لئے طاقت کا استعمال ضروری ہے اور وہ بھی اُس وقت جبکہ چاروں صاحبزادے قتل کئے جا چکے تھے مگر خالصہ پنتھ اب بھی ان کی پشت پر تھا۔ ۵

مجھے فخر ان کی شہادت پہ ہے — بہت ناز ان کی فضیلت پہ ہے
مجھے ان کے مرنے کا کچھ غم نہیں — مرا دیدۂ صبر پُرنم نہیں
ہے فوجِ ظفر موج جتنی یہاں — یہاں جس قدر بھی ہیں سکھ نوجواں
یہ خونخوار ہیں ڈسنے والے ہیں سانپ — تیرے ہی لئے تو یہ پالے ہیں سانپ

ایضاً ص ۱۲۱-۱۲۷

انصاف کے اصول بالائے طاق رکھ کر اورنگ زیب نے اپنے آپ کو ایک سچے بھی شخص اور خدا دونوں کے سامنے ایک اجنبی ثابت کیا ہے۔ اقتدار کے نشے میں بادشاہوں یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ اُس کی طاقت بے گناہوں کی مدد اور حفاظت کے لئے ہوتی ہے نہ کہ ناحق خون بہانے کے لئے۔ وہ اپنی عزت اور اقتدار دونوں کھو بیٹھتا ہے۔ ایسا ہی اورنگ زیب کو آخری دنوں میں ہر طرف سے منہ کی کھانی پڑی۔ ۵

تری سلطنت اب ہے رعشہ بدست — ترا دل ہے پھر بھی تشدد پرست
تُلا ہے بغاوت پہ ہندوستاں — مٹانے کو ہے ترا نام و نشاں
دکن کے وہ جنگ آزما مرہٹے — کہ دشمن کے سر جن کے ہاتھوں کٹے
بڑھی جس طرف سیواجی کی سپاہ — کٹے تیرے لشکر کے لشکر تباہ
اُسی وقت میواڑ بھی جاگ اٹھا — ہر اک لب پہ تھا نام پرتاپ کا
وہ لشکر ترے پہ برسنے لگے — تجھے سانپ بن کے وہ ڈسنے لگے

Marfat.com

دکن سے پھرا ہے جو ناکام تو | تو میواڑ سے بھی بد انجام ہو
اب اس جانب آنکھیں اٹھاتا ہے تو | ادھر دیکھ کر تلملاتا ہے تو
نگاہوں میں تیری پھرا ہے غرور | تیری عقل میں آگیا ہے فتور
ملے گا نہ پانی بھی پنجاب سے | تو جائے گا پیاسا ہی تالاب سے

ایضاً ص ۴۱-۴۴-۴۵

"ظفر نامہ" کا اختتام بھی نصیحت آمیز ہے۔ گورو گوبند سنگھ اورنگ زیب سے کہتے ہیں، تو اس دُنیا کے انجام سے غافل نہ ہو۔ کئی حاکم یہاں آئے کیخسرو، جام جمشید، شاہ آدم فریدوں، دارا اسفند یار اور سکندر۔ ان میں سے ایک بھی باقی نہیں ہے ؎

کئی تجھ سے پہلے بھی ظالم ہوئے | کئی تجھ سے پہلے بھی حاکم ہوئے
مٹائے گئے ان کے نام و نشاں | ہیں ماتم کناں ان پہ ویرانیاں

"ظفر نامہ" ایک تاریخی رزمیہ ہے۔ رزمیہ مثنوی کے لئے فعولن فعولن فعولن فعول بحر موزوں قرار دی گئی ہے۔ فردوسی نے بھی شاہنامہ کو اسی بحر میں نظم کیا، گورو گوبند سنگھ کا فارسی ظفر نامہ اور نانک چند ناز کا اردو تشریحی ترجمہ بنام ظفر نامہ بھی اسی بحر میں ہے۔ ایسی مثنوی کے لئے واقعہ نگاری اور بلند آہنگی اس کی شان ہوتی ہے۔ جس سے اُس کا حسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ واقعہ نگاری کا ایک منظر ملاحظہ ہو ؎

کہ ساری زمیں ہو گئی لالہ رنگ | بہا زخمیوں کا لہو بے درنگ
زمیں پر تھے دھڑ اور سر اس قدر | کہ کھا کھا کے تھکتے نہ تھے جانور
کہیں پاؤں تھے اور بازو کہیں | سر و دوش پہلو بہ پہلو کہیں
کہیں نیم جانوں کے انبار تھے | کہیں سینکڑوں سینہ افگار تھے

اب ذرا بلند آہنگی غور فرمایئے ؎ فارسی کا شعر

بنامِ خداوند تیغ و تدبر | خداوند تیر و سنان و سپر

اور اس کا اُردو میں تشریحی ترجمہ ملاحظہ ہو ؎

خداوند تیغ و تبر کی قسم | کمان و سنان و سپر کی قسم
قسم خنجر سینۂ در کی قسم | قسم پنجۂ شیرِ نر کی قسم

Marfat.com

قسم تیر کی تیز تلوار کی — قسم تیز تلوار کے وار کی
قسم ہر پڑاؤ کی میدان کی — قسم مجھ کو گھنڈے کی کرپان کی

اس طرح شروع سے آخر تک مثنوی میں جوش و بلند آہنگی کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا رواں دواں ہے۔ چونکہ ناز کا ظفرنامہ گورو گوبند کے فارسی ظفرنامہ کا تشریحی ترجمہ ہے اس لئے ناز کی مثنوی کی زبان قدرے مفرس ہے۔

المختصر ظفرنامہ یا منظوم خط میں جہاں ایک اخلاقی فتح کا ذکر کیا گیا ہے وہاں تاریخی اعتبار سے بھی کسی حد تک مستند ہے۔

**وچتر ناٹک[۱]** نانک چند ناز نے خالصہ پنتھ کے جنم داتا گورو گوبند سنگھ جی کے ظفرنامہ کے علاوہ گورو جی کے وچتر ناٹک کے ۱۹۲، اشعار کو جس میں گورو جی نے اپنی خود نوشت سوانح لکھی ہے کا اُردو مثنوی میں ۷۷، اشعار پر مشتمل تشریح و ترجمہ کر کے مع متن شائع کیا ہے۔ وچتر ناٹک کو مہاراج نے اپنے عہد کی مروج زبان میں یا اپنی بانی میں لکھا تھا۔ یہ نہ تو ڈرامہ ہے نہ ڈرامہ کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس میں گورو جی نے نہ صرف اپنی زندگی کا مقصد بیان کیا بلکہ اپنی پچھلی زندگی کے واقعات، ایشور سے اپنی گفتگو، دُنیا میں اوتار کا نصب العین۔ سید اور لودھی خاندانوں کے تاریخی واقعات، پہلے گورو نانک دیو جی سے، نویں گورو تیغ بہادر تک مختصر سلسلہ وار بیان، مغلیہ خاندان کے بے رحم ظالم جابر بادشاہ اورنگ زیب کا برہمنوں پر مذہبی ظلم و ستم کے علاوہ گورو تیغ بہادر کا کشمیری پنڈتوں کی مدد کے لئے اورنگ زیب کے پاس دربار دہلی میں جانا اور شہید ہونا نیز خالصہ سا جنا اور مغلیہ سلطنت سے معرکہ آرائیوں میں اپنے چار شہزادوں کی قربانیاں، بالآخر اورنگ زیب پر فتح۔ ایشور کی بڑائی کا ذکر۔ وچتر ناٹک کے اختتام پر اس کے لکھنے کا مقصد بیان کیا ہے اور اپنی خواہش ظاہر کی ہے کہ جو باتیں وچتر ناٹک میں بیان کی گئی ہیں وہ پوری دُنیا میں پھیل جائیں۔

---

[۱] ناز نانک چند" وچتر ناٹک" دوسرا ایڈیشن ذوسیر بند پریس امرتسر مارچ ۱۹۵۹ء کل اشعار ۷۷

Marfat.com

جس طرح قدیم اُردو فارسی شعراء نے مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے کیا ہے اسی طرح ناز نے بھی تشریحی ترجمہ میں مثنوی کی ابتدا میں محبوبِ حقیقی سے دُعا مانگی ہے کہ جس گرنتھ کا میں آغاز کر رہا ہوں وہ تیری کرم فرمائی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ کیوں کہ گورو جی کرپان کو ایک مقدس ہتھیار تصوّر کرتے ہیں اسی لئے اس کے آگے سرنگوں ہو کر فرماتے ہیں۔ گوربانی کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

نمسکار شری کھڑگ کو کرد سوہت چیت لائے
پورن کروں گرنتھ اِیہ تم موہے کرو سہائے

ناز نے اُردو نظم میں اس طرح تشریح کی ہے ؎

نمسکار کھنڈے کو کرپان کو | نمسکار ہر چیز کی جان کو
نمسکار جیون کے ہتھیار کو | نمسکار کرپان کی دھار کو
نمسکار اُس کو کہ جس سے ہوئے ، | فزوں سے فزوں تر مرے حوصلے
نمسکار کھنڈے کی تقدیس کو | اور اس کے اشارات تدریس کو

وچتر ناٹک ص "

پھر البشور کی تعریف کرتے ہوئے اس کو شہنشاہوں کا شہنشاہ مانتے ہیں جو ایک ناقابلِ تسخیر ہستی ہے۔ اور زندگی کے چکر سے بالا تر ہے فرماتے ہیں ؎

تیرے روپ کا ہے مدام ایک روپ | بدلتی نہیں چھاؤں اس کی نہ دھوپ
تجھے لوگ کہتے ہیں پرم آتما | کبھی تیرا ہوتا نہیں خاتمہ
تو راجوں کا راجہ تو شاہوں کا شاہ | نہیں تیری عظمت کی کوئی بھی تھاہ
جنم مرن سے تو سدا بے نیاز | اسی بے نیازی سے ہے سرفراز
نہ دکھتے ہوئے رُوپ بھی تو ہے رُوپ | یہ سنسار کیا ہے تیرا ہی سروپ
ہے اتنا مکمل تیرا بندوبست | کبھی بھی نہیں اس کو ممکن شکست

گورو گوبند سنگھ نے اپنے سوڈھی اور بیدی خاندان کی تاریخ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے ؎

سُنانے لگا ہوں میں اپنی کتھا | چلانے لگا ہوں میں اپنی پرتھا
سنو سوڈھی ونش اب سے پہلے تھا کیا | میرے پوروجوں کی سنو داستاں

Marfat.com

سناتا ہوں سب کچھ میں تفصیل سے ۔۔۔ مکمل سناؤں گا تا دیل سے
میرے سودھ بنسی کہاں سے اٹھے ۔۔۔ رہے کس جگہ اور کہاں سے بڑھے
ہوا کال سین ایک راجہ بڑا ۔۔۔ یہی پہلا راجہ تھا اتہاس کا
ہوا تیسرا کال کیت اس کا نام ۔۔۔ بہت اچھے جگ میں کئے اس نے کام
ہوا چوتھا راجہ وہاں کال دھوج ۔۔۔ اٹھی جس کی سنسار بھر میں گرج
اسی سے یہ سنسار اتپن ہوا ۔۔۔ وہی اس سرشٹی کا سادھن ہوا

اسی راجہ کال دھوج کے ہاں ایک چاند جیسی خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی جس کی شادی سور یہ ونش میں ہوئی۔ بیدی خاندان کے ذکر میں فرماتے ہیں ؎

گزرتا گیا انت اس حال میں ۔۔۔ کہ داخل ہوا جگ نئے سال میں
نئے سال کے لکشن اچانک ہوئے ۔۔۔ کہ پرگٹ زمانے میں نانک ہوئے
انہوں نے چلایا یہ کلجگ میں دھرم ۔۔۔ منش کو بتایا یہ کلجگ میں دھرم ص ۸۵
نئی نیک لوگوں کو دی روشنی ۔۔۔ یہی روشنی سب کی رہبر بنی

پہلے گورو، گورو نانک دیوجی کے بعد بڑے اختصار سے آٹھ گوروؤں کے نام گنواتے ہوئے فرماتے ہیں۔ مغل بادشاہ جہانگیر کا عہد تھا کہ بلیدان کی رسم تازہ ہوئی ؎

ہوا کند خنجر جہانگیر کا ۔۔۔ صفایا ہوا اس کی تدبیر کا
گورو ہرگوبند آگئے سامنے ۔۔۔ لرزتے ہوئے دھرم کو تھامنے
پتا کی شہادت سے لے کر اثر ۔۔۔ چڑھایا نیا رنگ یوں پنتھ پر

پھر آگے فرماتے ہیں ؎

چمکنے لگی پھر بہادر کی تیغ ۔۔۔ کڑکنے لگی پھر بہادر کی تیغ
ہوئے ان کے پشچات میرے پتا ۔۔۔ گورو پنتھ کے محترم رہنما
کوئی چیز کھوئی ہوئی مل گئی ۔۔۔ تلاش اُن کی پرماتما کو بھی تھی
گورو گوبند اُن کے پیارے پتا ۔۔۔ انہیں دے گئے درس تلوار کا

جب اورنگ زیب کے ظلم کا جنون اپنے عروج پر تھا ہندو پنڈتوں اور کشمیری برہمنوں کو

Marfat.com

بزور شمشیر مسلمان بنایا جا رہا تھا، تلک دھاری پنڈتوں اور جنیو دھاری برہمنوں کے جنیو جلائے جا رہے تھے، تو سب نے مل کر گورو تیغ بہادر سے مدد مانگی۔ گورو تیغ بہادر نے ہندوؤں کی مدد کے لئے تلوار کا سہارا لیا۔ جب اورنگ زیب کو معلوم ہوا تو بہت طیش میں آ گئے اور گورو جی کو دربار میں بلوا بھیجا۔ دربار میں گورو تیغ بہادر اورنگ زیب کے سوال و جواب شامل ذکر ہیں ؎

مہاراج اتنے میں خود ہی مگر — رواں ہو کے جا پہنچے ظالم کے گھر
کہا اس کے منہ پر کہ سب جنوں — تیرا کر کے چھوڑوں کا حال زبوں
نہیں مجھ کو اسلام تیرا قبول — نہیں چھوڑنا دھرم میرا اصول
تو تلوار اپنے ستم کی چلا — ہمارا ابھی نانک پہ ہے آسرا
شہادت سے ہم زندہ ہو جائیں گے — زمانے میں پائندہ ہو جائیں گے

گورو جی کا دنداں شکن جواب سن کر اورنگ زیب غصے میں لال پیلا ہو گیا اور جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ ان کا سر دھڑ سے جدا کرنے کے لئے تیار ہو جا۔ اور پھر گورو جی سے یوں مخاطب ہوئے ؎

مسلماں بن جا ابھی وقت ہے — میرے دیس میں آ جا ابھی وقت ہے
نہیں تو ابھی سر اتر جائے گا — تڑپتے تڑپتے تو مر جائے گا

گورو جی اپنے ارادے میں ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو ؎

پھرا تنے میں جلاد آگے بڑھا — جدا تن سے سیس آپ کا کر دیا
کٹا یا مہاراج نے اپنا سیس — کوئی بھی نہ کر پائے گا ان کی ریس
وہ کوہ تعصب سے ٹکرا گیا! — گرا کر اُسے کھائی میں ڈھا گیا

جب گورو گوبند سنگھ دسویں گورو بنے اور ان کے سر پر تاج رکھا گیا۔ بادشاہوں کی طرح راج کرنے لگے تو انہیں خیال آیا کہ حکومت بغیر طاقت کے کرنا درست نہیں اور دل میں ٹھان لی کہ جب تک طاقت اکٹھی نہ کی جائے فائدہ نہیں۔ اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خالصہ ساجا۔ ؎

Marfat.com

تو ہم نے کیا دل میں یہ فیصلہ
کہ سکھوں سے پیدا کریں خالصہ
سجایا گیا اس طرح خالصہ
نگہبان جو بن گیا دھرم کا
لڑائی کی پیدا ہوئی پھر اساس
کیا پاؤنٹہ شہر میں جا نواس
وہیں ہم نے شکتی بڑھائی پھر اور
نگارے پہ چوٹ اک لگائی پھر اور

دھرم کی رکھشا کے لئے جب خالصہ فوج تیار ہو گئی تو مغلیہ سلطنت کی نیند حرام ہو گئی۔ اور گورو گوبند سنگھ سے بلاوجہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی گورو گوبند سنگھ کے صاحبزادے جھجھا سنگھ نے ایک جھڑپ میں مغلیہ فوج کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اور اپنی فتح و کامرانی کا جھنڈا گاڑ دیا۔ ؎

بگل بج گیا سارے پنجاب میں
اُمنگیں اُٹھیں بزمِ احباب میں
حکومت کے ایوان گھبرا گئے
تشدّد کے ارکان گھبرا گئے
ادھر دھرم راسخ میں جوشِ شکیب
ادھر یاس میں فکر اورنگ زیب
بہت زور سے یہ ہوا دھرم یُدھ
بہت شور سے یہ ہوا دھرم یُدھ
بڑھا اس قدر جذبہ بے پناہ
گئی بھاگ اورنگ زیبی سپاہ
میرا ایک فرزند جھجھا سنگھ
ہوئے جس پہ لاکھوں ہی بلہار سنگھ
وہ دشمن کی اس نے کمر توڑ دی
وہ شیطاں کی بجی کھوپڑی پھوڑ دی
کہ ان میں ہمارے علم گڑھ گئے
عدو کی صفوں میں شکن پڑ گئے

اورنگ زیب اس شکست کو برداشت نہیں کر سکا اور مکّارانہ چالیں چلنے لگا۔ اپنے لڑکے کو چھوٹے چھوٹے پہاڑی ہندو راجاؤں پر اثر ڈالنے کے لئے بھیجا اور وہ چھوٹے راجے جو ابتدا میں گورو گوبند سنگھ کے ساتھ تھے جن کی گورو جی نے مدد کی تھی، مغل فوج سے مل گئے اور گورو سے غدّاری کر دی۔ ملاحظہ ہوں اس موقعہ کے چند اشعار ؎

پریشان ہوا اس سے اورنگ زیب
کیا اس نے لیکن نیا اک فریب
مگر اپنے لڑکے کو بھیجا ادھر
کہ وہ ہندو راجوں پہ ڈالے اثر
یہ راجے ہمارے مددگار تھے
اگرچہ حقیقت میں غدّار تھے

Marfat.com

ہم ان کے لئے لڑ رہے تھے یہ جنگ | کہ تھا عرصۂ زندگی ان پہ تنگ
حکومت کے ظلم اس قدر تھے عیاں | کہ یہ راجے خود ہی تھے نالہ کناں
مگر شاہی افواج سے مل گئے | ستوں اپنی بنیاد سے ہل گئے

آخر میں وچتر ناٹک کے رچنے کا مقصد اس طرح بیان کیا ہے ؂

یہ ناٹک وچتر اور چنڈی کی وار | ہمارے گرنتھوں میں ان کا شمار
رچے یہ کہ جیون ملے قوم کو | رچے یہ کہ بھارت کا کلیان ہو
اک اک لفظ میں ہم نے بھر دی ہے آگ | کچھ اس ڈھنگ سے جمع کردی ہے آگ
توجہ سے جو بھی سنے گا اُنہیں | عقیدت سے جو بھی پڑھے گا انہیں
اُٹھا دے گا دنیا میں طوفان وہ | بپا ہر سو کردے گا ہیجان وہ
رگوں میں نہ کم ہو گی رفتار خوں | دلوں میں نہ کم ہوگا جوشِ جنوں
اثر ہے یہ کھنڈے کا کرپان کا | جنم جن کے کارن ہمارا ہوا
ہمیں سے ہوا خالصہ کا جنم | یہیں ہیں ہمیشہ سے موجود ہم

تاریخی اعتبار سے وچتر ناٹک کے چند واقعات مستند ہیں جن کا ہم عصر مورخین نے بھی اجمالاً ذکر کیا ہے گورو تیغ بہادر دہلی میں اورنگ زیب کے ہاتھوں شہید ہوا گورو گوبند سنگھ کے دو بڑے صاحبزادوں کا مغل فوج سے لڑائی میں مارا جانا اور چھوٹے صاحبزادوں کا سرہند میں زندہ دیوار میں چنوا یا جانا گورو گوبند سنگھ کا دھرم رکھشا کے لئے خالصہ ساجنا وغیرہ تاریخی اعتبار سے درست ہیں مثنوی کی زبان نہایت سلیس عام فہم بلکہ ہندی کے قریب تر ہے چونکہ گورو جی نے اسی زمانے میں مروجہ اپنی بھاشا یا بانی میں وچتر ناٹک رچا تھا اور ناٹک چند ناز نے بھی تشریحی ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا۔ اُردو کے اس منظوم وچتر ناٹک میں بھی کچھ نہ کچھ گر بانی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جس کو آپ پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں ظفر نامہ چونکہ فارسی زبان میں تھا اس لئے جب ناز نے فارسی ظفر نامہ" کا تشریحی ترجمہ اُردو میں کیا تو اس میں مفرس زبان کی چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے۔

وچتر ناٹک میں جہاں کہیں رزمیہ واقعات آئے ہیں ان میں رزمیہ کی وہ شان جو ظفر نامہ میں تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے، یہاں نہیں پائی جاتی۔ نہ وہ بلند آہنگی و شوکتِ الفاظ ہے۔ شاید اس لئے کہ گورو جی کا مقصد رزمیہ لکھنا نہیں تھا۔

Marfat.com

# سرتیر

سید محمد عباس نام سرتیر تخلص تھا۔ قصبہ کابر، ضلع گیا بہار میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید شاہ رستم علی تھا جو اچھے مرثیہ گو تھے۔ سرتیر نے اپنے والد اور بڑے بھائی کی نگرانی میں فارسی کی اعلیٰ تعلیم پائی۔ چونکہ ان کے بزرگ بھی شعر و شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے اس لئے سرتیر کو بھی بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ موزوں طبیعت پائی تھی۔ جب سرتیر جوان ہوئے تو گیا میں سکونت اختیار کر لی۔ گیا کی شاعرانہ فضا نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ سرتیر نے شفق عماد پوری اور شمشاد لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ جلیل مانک پوری سے بھی اپنے کلام پر مدتوں اصلاح لی۔ سرتیر نے تقریباً تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی، ان کی شاعری میں متقدمین اور متاخرین دونوں شعراء کا رنگ پایا جاتا ہے۔ جہاں غزلوں میں قدیم رنگ جھلکتا ہے وہاں نظموں میں جدید رنگ بھی نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ سرتیر کا پہلا مجموعۂ کلام بہ عنوان "دلفگار" ۱۹۰۸ء میں منظرِ عام پر آگیا۔ اور نظموں کا مجموعہ بہ عنوانِ "صبح انقلاب" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ سیاسی، اخلاقی، ادبی اور مذہبی نظموں کا ایک مجموعہ "محشرِ انقلاب" بھی ہے۔ جلیل مانک پوری نے سرتیر کو بلبلِ بہار کہا ہے "تذکرہ خمخانۂ جاوید" میں لالہ سری رام نے سرتیر کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح فردوسی نے ایران کی تاریخ شاہنامہ میں بیان کی، سرتیر نے بھی "شاہنامہ ہند" میں ہندوستان کی عظمت و سطوت کو نظمایا ہے۔

**شاہنامہ ہند**[1] سید محمد عباس سرتیر کابری کی یہ تاریخی مثنوی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے عنوانات اردو نثر میں ہیں۔ سرتیر نے "شاہنامہ ہند" کو فردوسی کے شاہنامہ کے جواب میں لکھا۔ اس میں انہوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی شان و شوکت کے نغمے الاپے ہیں۔ "شاہنامہ ہند" کی تصنیف کے وقت

---

۱؎ سرتیر محمد عباس کابری۔ شاہنامہ ہند جلد اول مطبوعہ لیبل لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۵۵ء کل صفحات ۱۶۸

Marfat.com

شاعر کے پیشِ نظر تاریخ فرشتہ اور مولانا ریاست علی ندوی کی "عہدِ اسلامی کا ہندوستان" تھیں۔ اگر بعض دوسری مستند تاریخیں بھی پیشِ نظر ہوتیں تو مثنوی شاہنامہ کی تاریخی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہوتا۔ مثنوی کی ابتداء قدیم رنگ کے شعراء کی طرح حمد و نعت و منقبت سے ہوتی ہے۔ سببِ تالیف کے بعد مصنف نے ایک عنوان عرض حال بحضور امام الہند علامہ ابوالکلام آزاد وزیرِ تعلیم و نائب وزیرِ اعظم ہند قائم کیا ہے۔ اس کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مثنوی کا مختصر خاکہ یوں ہے۔

راجہ سامری والی مالا بار حضرت محمدؐ کے معجزۂ شق القمر سے بے حد متاثر ہوئے اور انتقال سے پہلے انہوں نے اپنے عزیزانِ وطن اور مشیرانِ حکومت کے نام وصیت نامہ لکھا جس میں اہلِ عرب کے لئے اپنی مملکت سنگل دیپ اور مالابار میں دینی اشاعت، تہذیب و تمدن اور تجارت کی راہیں کھلی رکھنے کی خواہش کی۔ بعد میں سنگل دیپ کے راجاؤں کی عقیدت کا سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ وہ حاکم بصرہ کو وقتاً فوقتاً تحائف بھیجا کرتے تھے ایک بار جب تحفوں کا لدا ہوا جہاز حاکم بصرہ کی خدمت میں جا رہا تھا۔ تو اس کو دیبل (کراچی) کے مقام پر سمندری قزاقوں نے لوٹ لیا۔ چونکہ یہ علاقہ راجہ داہر فرمانروائے سندھ کے زیرِ حکومت تھا اس لئے حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کو تنبیہہ نامہ لکھا اور نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ جب حجاج بن یوسف نے راجہ داہر سے کوئی مناسب جواب نہ پایا تو بدیل کی سپہ سالاری میں اسلامی فوج نے سندھ پر حملہ کر دیا اور شکست کھائی۔ جب شکست کی خبر بصرہ پہنچی تو خلیفہ ولید بن ملک نے محمد قاسم کی سپہ سالاری میں چھ ہزار جوانوں کا دستہ بھیجا جس نے آتے ہی شہر دیبل اور قلعہ نیرون کو فتح کر لیا۔ اسلامی فوج نے پہلے راجہ داہر کے بیٹے کو شکست دی اور پھر راجہ داہر بھی میدان جنگ میں بڑی بہادری سے لڑتے لڑتے مارا گیا۔ راجہ داہر کے انتقال کے بعد رانی نے فوج کی کمان سنبھال لی۔ مگر اسلامی فوج نے عورت کے خلاف ہتھیار اٹھانا شریعت اسلامی کے خلاف سمجھتی تھی اس لئے مقابلہ پر نہ آئی۔ سندھ کی فتح کے نتیجے میں بہت مال غنیمت ہاتھ لگا۔ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی دو لڑکیاں اور بے شمار مالِ غنیمت خلیفہ کی خدمت میں روانہ کیا جب دختران داہر دار الخلافہ دمشق پہنچیں تو اپنے باپ کا بدلہ لینے کی آگ ان کے دل میں بھڑک اٹھی اور

Marfat.com

بارگاہِ خلیفہ میں محمد بن قاسم کی بدسلوکی کی داستان سُنائی۔ خلیفہ نے غصے میں آکر تمیم انصاری کو سندھ روانہ کیا اور حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے اس کی سرکار میں روانہ کرے۔ چنانچہ تمیم انصاری نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے خلیفہ کے پاس روانہ کیا، زندگی نے قاسم کا ساتھ نہیں دیا۔ راستہ ہی میں راہی ملک عدم ہوئے۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے پہلے چند سال قابلِ تعریف ہیں، یہاں حاکم و محکوم میں کچھ فرق نہیں تھا۔ رواداریٔ اخوت اور محبت کا دَور دَورہ تھا۔ مندروں کے پہلو بہ پہلو مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ بعد میں تمیم انصاری کے دورِ حکومت میں کفر و ایمان کا جھگڑا کھڑا ہو گیا، محبت میں عداوت کی پیوند کاری ہونے لگی۔ ملک میں رفتہ رفتہ بغاوت پھیلنے لگی۔ فاتح و مفتوح کا بھید بھاؤ اور اختلافات کے علاوہ سندھ کا علاقہ بنجر ہونے سے فوج کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے حاکم بصرہ نے فوج کو واپس بلالیا۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومت صرف اڑتیس ۳۸ سال رہی۔

عربوں کی حکومت کے ڈھائی سو سال بعد دوبارہ مسلمانوں نے ہند پر اپنی آنکھیں لگائیں۔ ۹۷۷ء میں البتگین کے انتقال کے بعد سبکتگین غزنی کا بادشاہ بنا۔ راجہ جے پال والی پنجاب، پشاور و قابل کو ریاست غزنی کی روز افزوں ترقی اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ پیدا ہونے لگا۔ اس لئے سبکتگین کے عہدِ حکومت میں راجہ جے پال نے غزنی پر دو بار حملہ کیا اور دونوں بار شکست کھائی۔ صلح نامہ کے تحت راجہ جے پال نے تاوانِ جنگ سالانہ باج گزاری ادا کرنے کے علاوہ مسلمانوں کی فوج کو پنجاب، پشاور اور قابل میں رہنے کی اجازت دے دی۔ سبکتگین کے انتقال کے بعد محمود غزنوی تخت نشین ہوا اور ہندوستان پر پے در پے حملے شروع کر دیئے۔ سبکتگین کے عہد سے راجہ جے پال سالانہ خراج دیا کرتا تھا وہ بند کر دیا اس لئے کہ محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء میں جے پال پر چڑھائی کر دی اور اسے شکست دی۔ تین بار شکست کھانے کے بعد جے پال نے خودکشی کر لی۔ جے پال کے انتقال کے بعد انند پال والی پنجاب تخت نشین ہوا۔ محمود غزنوی نے دوسرا حملہ رائے بھاٹیا پر کیا جس کی مدد پر ابوالفتح[۱] داؤد والی ملتان اور راجہ انند پال والی پنجاب کیا۔ اتحادی فوج نے شکست

---

۱؎ عربی حکومت کی چھوٹی بچی بچائی حکومت کے فرمانروا کا نام ہے، جو ملتان میں تھی۔

Marfat.com

کھائی۔ انند پال کشمیر بھاگ گیا۔ محمود غزنی کے ہندوستان پر تیسرے حملے کے تحت قنوج، تھانیسر، کانگڑا کی فتوحات کا ذکر ہے۔ چونکہ ان رجواڑوں کے راجاؤں کے سامنے پنجاب پشاور کے راجہ جے پال اور انند پال کے جنگی ڈراموں کا منظر رقصندہ تھا اس لئے والئ قنوج سلطان کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا، نذرانہ پیش کر کے سالانہ باج گزار رہنے کا اقرار کیا۔ متھرا کے باشندے بت پرست تھے مندر کی مورتوں کو اپنا خدا سمجھتے تھے۔ یہ عقیدہ مذہب اسلام کے منافی تھا اس لئے سلطان محمود غزنی نے بتکدے توڑنے کا حکم دیا اور بے شمار دولت جو برسوں سے ان میں جمع تھی وہ لوٹ لی۔ تھانیسر کے راجہ نے بھی سالانہ باج گزاری پیش کرنے پر صلح کی۔ محمود غزنی نے کانگڑہ فتح کرنے کے بعد کشمیر کا قصد کیا۔ موسم سرما کی سختی سے سلطان کی فوج کو بہت تکلیف اٹھانی پڑی اور واپس غزنی روانہ ہو گئی۔ ہندوستان کی دولت بار بار محمود غزنی کو حملہ کرنے پر مجبور کرتی اور سلطان نے یکے بعد دیگرے، دہلی، اجمیر، کالنجر، گوالیار، گجرات اور سومنات پر حملے کئے۔ غزنی کی فوج کا دھڑکا ہندو راجاؤں پر بیٹھ گیا تھا، وہ جدھر کا رخ کرتا ادھر دہشت پھیل جاتی۔ کئی راجاؤں نے بغیر لڑائی کے اور کئی راجاؤں نے لڑائی میں شکست کھا کر باج گزاری منظور کی۔ جب کشمیر کا دوبارہ رخ کیا تو راجہ کشمیر نے اپنی عزت سلطان کی اطاعت میں سمجھی۔ کشمیر کی واپسی پر پنجاب میں ایاز کو یہاں کا حکمران مقرر کیا محمود غزنی کا ۱۰۳۰ء میں انتقال ہوا۔

محمود غزنی کے انتقال کے بعد ان کے لڑکوں محمود اور مسعود میں خانہ جنگی ہوئی۔ غوری اور سلجوقی فرقے بھی سلطنت پر قابض ہونے کے لئے زور آزمائی کرنے لگے۔ بالآخر علاؤالدین امیر غور کی بن آئی وہ تخت غزنی پر بیٹھ گیا۔ شہاب الدین غوری جو غوری حکومت کا گورنر تھا علاؤالدین کو قتل کر کے خود سلطان بن بیٹھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پرتھوی راج والئ اجمیر سے نگر کوٹ اور تھانیسر کے مقام پر لڑائی ہوئی سلطان نے شکست کھائی۔ قنوج پر جے چند کا پرچم لہرا رہا تھا، اجمیر پر پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ یہی دو ریاستیں زیادہ طاقتور تھیں اور دشمن کا مقابلہ بھی کر سکتی تھیں مگر بدقسمتی سے دونوں میں

Marfat.com

ایسی رنجش تھی کہ پرتھوی راج نے جے چند کی مرضی کے خلاف اس کی لڑکی سنجوگتا کو سوئمبر سے اُٹھا لایا تھا۔ اسی رنجش و دشمنی کی بدولت غوری کو پنجاب پر قبضہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ جے چند نے غوری کو حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اجمیر میں پرتھوی راج اور غوری کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ مقابلہ میں پرتھوی راج قید و قتل ہوا۔ غوری کی حکومت کا سکہ ہندوستان میں لاہور سے بنگال تک چلنے لگا تھا۔ غوری نے قطب الدین ایبک کو اپنا جانشین بنا کر عجلت میں ہندوستان سے غزنی کا قصد کیا۔ راستے میں دریائے جہلم کے کنارے ۶۰۲ھ میں شہید ہوئے۔ گکھر یا اسمٰعیلیوں میں سے کسی نے اس کو قتل کر دیا۔ محمد غوری نے اپنی سلطنت کے تین حصے کئے تاج الدین یلدز کو غزنی کا گورنر مقرر کیا۔ قطب الدین ایبک کو پنجاب و دہلی کا اور ناصر الدین قباچہ کو حکومت سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ یہاں پر مثنوی شاہنامہ کا پہلا باب اختتام پذیر ہوتا ہے۔

قدیم شعراء کی طرح شاہنامہ ہند کی ابتدا بھی حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ سببِ تصنیف کے عنوان کے تحت سرکیر فرماتے ہیں جس طرح فردوسی نے شاہنامہ میں ایران کی تاریخ کو نظم کر کے ایران کے حکمرانوں کو زندہ جاوید بنا دیا، اسی طرح اس نے بھی ہندوستان اور ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے تاریخی کارناموں کو زندہ و پائندہ بنانے کے لئے "شاہنامہ ہند" تصنیف کیا، تاکہ مسلمان بادشاہوں کے تاریخی کارناموں کے آثار جو مٹتے جا رہے ہیں ان کو نئی جلا بخشی جا سکے۔ اس عنوان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے عربوں کے حملے سے لے کر مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار کی تاریخ کو تین حصوں میں نظم کرنا چاہتا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

| | |
|---|---|
| سُنے فردوسی و محمود کے جب کہنہ افسانے | کہا مجھ سے عزیزان رضا جو صبر و صہبانے |
| کیا طوسی عالی فکر نے ایران کو زندہ | کریں اپنے قلم سے آپ ہندوستان کو زندہ |
| سلف کے کارنامے جن کے نظارے دکھاتے ہیں | وہ آثار قدیمہ رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں |
| زبانِ حال سے کہتی ہے یہ دلی کی ویرانی | نہیں کچھ اعتبار یادگارِ عالمِ فانی |
| نقوشِ رخنۂ ممتاز کے تا چند نظارے | کھڑے کب تک رہیں گے مسجد جامع کے مینارے |
| مٹے گا غزنوی کو ساتھ لے کر سومنات اک دن | فنا ہو جائے گی غوری کی تاریخ حیات اک دن |

Marfat.com

مزار تغلق و تیمور کے نام و نشاں کب تک
رہے گی تازہ عہدِ مغلیہ کی داستاں کب تک

بعد اندوہ و حسرت التمش کا قطب مینا را
کرے گا تا کبھی دلّی کی بربادی کا نظارہ

کہاں تک حسرتیں چلّائیں گی خلجی کے مدفن پر
رہا الزام خونِ پدری اب تیری گردن پر

رہا اک یادگارِ سلطنت سینے پہ داغ آخر
بجھا رنگون کے زنداں میں دلّی کا چراغ آخر

رہیں گے صورتِ اقبال ہم اک نوحہ خوانوں میں
ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

قلم سے کام لیجئے شوکتِ نو و کہن لکھئے
مکمل سرگزشتِ حکمرانانِ وطن لکھئے

یہ سن کر میرے دل میں بھی ہوا اک ولولہ پیدا
برائے بے سازو سامانی ہوا یہ حوصلہ پیدا

جب حجاج بن یوسف حاکم بصرہ کا ایلچی راجہ داہر والئی سندھ کے دربار میں پیغام لے کر حاضر ہوتا ہے اس موقعہ پر سریر نے دربار کا نقشہ اس کی شان و شوکت، مشیران درباری، فوجی افسران فوجی پوشاک و جنگی آلاتِ حرب و ضرب سے جس طرح سجے ہوئے ہیں اس طرح سے کھینچا ہے کہ اس کی نہ صرف جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے بلکہ مصنف کی رفعتِ تخیل اور وسعتِ خیال کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ؎

رئیسان و عمائد میں بھی اک جوشِ عقیدت تھا
مزین خلعتوں سے حلقۂ ارکانِ دولت تھا

کہیں تھے افسرانِ جنگ اپنی وردیاں پہنے
لئے حربہ کھڑے تھے جن کے پیچھے فوج کے دستے

کہیں تھے ناوک اندازانِ ہندوستاں قرینے سے
زرہ تھی اُن کے جسموں پر کمانیں دوش پر ڈالے

سواروں کے پرے سا دھات کی گویا تھیں دیواریں
سروں پر خود چہروں پر علم ہاتھوں میں تلواریں

شبیہ شان و شوکت راجگانِ ہند کا حلقہ
سریرِ زر پہ جس کے بیچ میں سردار داہر تھا

اسلامی فوج کی پہلی شکست کے بعد محمد بن قاسم کی سرکردگی میں دوبارہ چھ ہزار جرار فوج میدان کارزار میں راجہ داہر کے مقابلہ پر آئی۔ میدان جنگ میں قتل و غارت گری انسانی سروں کی بے توقیری کا ذکر کرتے جن الفاظ میں اور تشبیہات و استعارات کی ندرت و جدت سے تصویر کشی کی ہے وہ قابلِ غور ہے ؎

اُدھر میداں ڈھکا تھا نیزہ و شمشیر و خنجر سے
کہ گونج اٹھی فضا میں نعرۂ اللہ اکبر سے

بڑھے دانتوں میں اپنے داڑھیاں دابے ہوئے غازی
رگ و ریشہ میں رقصاں انبساطِ خونِ جانبازی

تصادم ہوتے ہی پیچھے کی جانب کی سبک گامی
گئی کچھ میمنہ کچھ میسرہ افواجِ اسلامی

Marfat.com

قضا کے منہ پہ جانبازانِ ہندی چڑھتے جاتے تھے
یہ پیچھے ہٹتے جاتے تھے وہ آگے بڑھتے جاتے تھے

بہت کچھ اپنے فوجی افسروں پر خوش ہوا داہر
بالآخر غازیانِ دیں کے حلقے میں گھرا داہر

چلیں تینوں طرف سے آندھیاں شمشیر و پیکاں کی
لہو کی ندیوں میں کشتیاں ڈوبیں تنِ و جاں کی

ہر اک رجوں کے طائر سینہ و سر چھوڑ کر بھاگے
کہ جیسے زلزلے میں آدمی گھر چھوڑ کر بھاگے

کہیں تلواریں چلتی تھیں کہیں خنجر برستے تھے
چمکتی بجلیوں کی بارشوں میں کر برستے تھے

ہوا اک ہُو کا عالم خوف سے دامانِ صحرا میں
لپک کر جا گرا داہر کا ہاتھی قعرِ دریا میں

نہ جانے پھر بہ عجلت کیوں سوئے ساحل پلٹ آیا
فرشتہ موت کا دریا سے شاید کھینچ کر لایا

کسی شامی نے بڑھ کر ناوکِ آتش فشاں مارا
گرا ہاتھی سے بالائے زمیں وہ ہو کے بیچارا

تو اک مسلم سپاہی نے نکل کر قلبِ لشکر سے
قلم سر کر لیا اک وار میں داہر کا خنجر سے

بہا سارا لہو سارے بدن کا پیچ و خم نکلا
بہت تڑپا بہت چیخا بہت مشکل سے دم نکلا

اسلامی عہدِ حکومت کے ابتدائی چند سالوں میں ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسی رواداری، محبت اور خلوص کا ایک بہترین دور تھا، اس کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

سرِ نو پھونک دی اک رُوح قانونِ حکومت میں
محبت کی پڑی بنیاد دنیائے عداوت میں

ہوئی تعمیر مسجد بھی، صنم خانے کے پہلو میں
نہ رکھا امتیاز عدل مسلم اور ہندو میں

فروزاں لو ہوئی وہ شمع قانونِ عدالت کی
بنیں ہل چل کے دونوں قوم ذرا آنکھیں حکومت کی

جھکا پلہ کسی جانب نہ میزانِ عدالت کا
نہ تھا کچھ امتیاز فاتح مفتوح کا جھگڑا

پڑی بنیاد سارے ملک میں ملکی اخوت کی
منائی ہندوؤں نے عہدِ اسلامی حکومت کی

حجازی بھرتے دم ہندیوں کی دلنوازی کا
تو ہندو پوجتے تھے پاؤں ترکانِ حجازی کا

اگر چھوتے تھے بامِ چرخ کو مسجد کے مینارے
تو مندر کے کلس بھی توڑتے تھے عرش کے تارے

عربوں کی حکومت ہندوستان میں صرف اڑتیس ۳۸ سال رہی اس کے تقریباً دو سو پچاس سالوں کے بعد سلطنتِ غزنی کے بادشاہ سبکتگین نے ہندوستان کا رُخ کیا جے پال والیٔ پنجاب پشاور و کابل کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دونوں طرف کی فوجوں کی صف بندی ملاحظہ ہو ؎

کماندارانِ ہندی کو ادھر جے پال نے للکارا
فضا گونجی کڑک سے جس کی میدان کانپ اٹھا سارا

ادھر تو لے ہوئے شمشیر جانبازانِ ہندوستاں | ادھر گھوڑے پہ ترکانِ ہنرمندی سرِ میداں
ادھر باندھے قطار اک سمت پیلانِ کہستانی | اُدھر تانے ہوئے نیزے سوارانِ خراسانی
ادھر اُمڈا ہوا بادل خدنگ و تیر و پیکاں کا | اُدھر بہتا ہوا سیلاب آبِ تیغ براں کا
ادھر ہر راجپوت اپنی کمانداری پہ نازاں تھا | اُدھر ہر ترک اپنی شانِ خودداری پہ نازاں تھا
اِدھر تیر سہ پہلو ہیں کہ ترکش میں چمکتے ہیں | اُدھر خونخوار نیزے ہیں کہ ہاتھوں میں لچکتے ہیں
تصادم ہوتے ہی حملہ برابر سے برابر کا | اِدھر جے ہند کا نعرہ اُدھر اللہ اکبر کا

لڑائی میں جے پال کی فوج کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ علاوہ ازیں چند روز کی اتفاقاً[1] موسلا دھار بارش نے بھی جے پال کی فوج کی کمر توڑ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جے پال نے سبکتگین سے صلح نامہ کیا اور سالانہ باج گزار رہنے کا اقرار کیا۔

بالآخر ہو گئی جے پال کے لشکر کی پامالی | کمانداران ہندوستاں سے میداں ہو گیا خالی
سدھارے کچھ تو زخمِ نیزہ و شمشیر و پیکاں سے | ہوئی برباد کچھ فوجیں وفورِ برق و باراں سے
مظفر معرکہ میں جب ہوئیں سلطان کی فوجیں | تو بھاگیں چھوڑ کر میدان ہندوستان کی فوجیں
نہ بن آیا تو آخر صلح[2] کی جے پال کو سوجھی | سبکتگین کی خدمت میں اک عرضی روانہ کی
علاوہ سکہ رائج کے ہوں گے نصف صد ہاتھی | زرِ محصول پہنچائے جو ہندوستاں سے تا غزنی

سبکتگین کی وفات کے بعد جے پال نے غزنی حکومت سے صلح نامہ توڑ دیا اور سالانہ باج گزاری دینا بند کر دیا۔ محمود غزنوی نے جے پال کی وعدہ خلافی کا مزہ چکھانے کے لئے ۱۰۰۱ء میں تیسرا حملہ کیا۔ راجپوتوں کی آپس میں نا اتفاقی کی بدولت جے پال کو اس بار محمود غزنوی سے بھی شکست کھانی پڑی۔ شکست کے بعد جے پال ندامت اور شرمندگی کو برداشت نہ کر سکا اور جل کر خودکشی کر لی۔

سرِ دربار فوجی افسروں کو اپنے بلوایا | تو پھر محمود نے سب سے مخاطب ہو کے فرمایا
ہمیں کچھ فوج لے کر سوئے ہندوستان جانا ہے | مزہ جے پال کو وعدہ خلافی کا چکھانا ہے

---

[1] اتفاق سے بارش اور برف باری کا سلسلہ کئی دن رہا (از عہدِ اسلامی ہندوستان) مولانا ریاست علی ندوی

[2] اقتباس (از عہدِ اسلامی کا ہندوستان) مولانا ریاست علی ندوی۔

Marfat.com

مورخ نامہ فرسا ہے کہ سارا ہند کانپ اٹھا  ہوا اس شان سے خونریز دشمن ہوا ایک کا حملہ
مگر محکومیت تھی راجپوتوں میں وہ ناچاکی  بجز اس کے نہ تھی تدبیر کوئی پاک ہونے کی
کہ وہ جل جائے[1] اور جل کر چتا میں خاک ہو جائے  بدل جائے نیا قالب تو قصہ پاک ہو جائے

محمود غزنی کا دوسرا حملہ رائے بھاٹیا پر ہوا۔ جس کی پشت پر ملتان کا حکمران اور انند پال تھے۔ اتحادی فوج کو شکست ہوئی۔ رائے بھاٹیہ قتل ہوا اور والی ملتان اور انند پال نے صلح نامہ کر کے سالانہ باج گزاری دینا قبول کیا۔

مگر حکمران بھاٹیہ نے جب خبر پائی  کہ محمود آ رہا ہے پھر بہ قصدِ رزم آرائی
تو بربادی کا اپنی اُس کے دل میں اک خیال آیا  معاً گھبرا کے گھر سے جانب آنند پال آیا
معافی اپنی نافرمانیوں کی آتے ہی چاہی  پھر اس کے بعد لائی لب پہ تمہید ہوا خواہی
کہ پشاور پہنچ کر تو اگر رستہ نہ روکے گا  نجانے پھر ہمارے ملک کا انجام کیا ہوگا
یہاں سے والیِ ملتان کی خدمت میں جاتا ہوں  میں اس کو مع فوجِ گراں ہمراہ لاتا ہوں
اگر مل جل کے تینوں جنگ کا طوفاں اٹھائیں گے  مزہ محمود کو اس کی حماقت کا چکھائیں گے
یہ سن کر سے کے فوج اپنی ادھر آنند پال آیا  جو شامت آئی تو باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا
ادھر بوا فتح داؤد[2] آیا لشکر لے کے میداں میں  اٹھا ایک اور طوفاں نیزۂ و خنجر کے طوفاں میں
سر میداں جب اکھڑے پاؤں افواجِ مخالف کے  کئے سجدے پہ سجدے غزنوی اور اس کے جنرل نے
لگے نقارے بجنے فتح و نصرت کے سرِ میداں  بہت ہاتھ آئے ترکانِ عجم کو جنگ کے ساماں

محمود غزنوی کا تیسرا حملہ قنوج، متھرا، تھانیسر، اور کانگڑا پر ہوا۔ مندروں میں جمع بے شمار دولت اس کے ہاتھ لگی اور یکے بعد دیگرے سبھی راجپوتوں نے محمود غزنوی کی اطاعت قبول کر لی۔

جو تھا پیشِ نظر نیچا بنے پشاور کا افسانہ  ہوا خود والیِ قنوج[3] حاضر لے کے نذرانہ
چلی بعد اس کے متھرا کی طرف افواجِ سلطانی  خس و خاشاک کو دھوتا گیا سیلابِ طوفانی
درونِ شہر ایسا بتکدہ آسماں رفعت  علاوہ اس کے مندر میں تھا اک گنجینۂ دولت

---

[1] اقتباس، از تاریخ فرشتہ۔ عہد اسلامی کا ہندوستان [2] عربی حکومت کی رہی سہی بچی بچائی حکومت کے فرمانروا کا نام ہے جو ملتان میں تھی جس نے اپنے ہم وطن ہندو فرمانروا کا ساتھ دیا۔ [3] بعض مورخین کا خیال ہے کہ انہوں نے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا پھر اس سے منحرف ہو گئے۔

Marfat.com

کچھ ایسا جذبۂ باطل پرستی پر عتاب آیا | کہ مندر توڑنے کا حکم صادر اس نے فرمایا
ہوا جب منہدم مندر تو وہ گنجینہ ہاتھ آیا | جو اگلے راجگان ہند کا تھا اس میں سرمایہ
ہوئی افواجِ سلطانی روانہ سوئے تھانیسر | یہاں تھا کانگڑا کے قلعہ کا مشہور سیم و زر
تھا راجہ بھیم سین[1] اس قلعہ کا فرمانروا پہلا | اسی کے عہد سے تھا جمع ہر راجہ کا سرمایہ

ہندوستان کے مندروں کی بے شمار دولت نے[2] محمود کو ہند پر بار بار حملہ کرنے کی دعوت دی۔ محمود غزنوی نے متواتر دہلی، اجمیر، گوالیار، گجرات اور سومنات پر حملے کئے۔ سرور نے سومنات کے مندر کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے ؎

تھا بت خانہ بلندی میں کہیں اونچا ہمالہ سے | کلس مندر کا باتیں کر رہا تھا عرشِ اعلیٰ سے
کیواڑ اور چوکھٹے سونے کے تھے سونے کا تالا تھا | کہ جس کی ضو فشانی سے اندھیرے میں اُجالا تھا
تھی دو سو من کی زنجیرِ طلائی اس میں آویزاں | علاوہ اس کے الماس و جواہر جا بجا پنہاں[3]
خلا میں ایک بت بے لاگ ہر سوئے معلق تھا | جو آتا بصد تعظیم کرتا تھا اُسے سجدہ
ضیا پھیلی ہوئی ہر سمت الماس و جواہر کی | اندھیری کوٹھری میں جس سے تھی اک چاندنی چھٹکی

سرور نے محمود غزنوی کی ہندوستان پر حکومت کی تعریف اور اس کی رواداری بلا امتیاز مذہب و ملت کا ذکر کیا ہے پھر اس کا موازنہ زمانۂ حال میں چاروں طرف پھیلے انتشار بے روزگاری چور بازاری رشوت کی دکانداری آئے دن کی سرد مہری سے جن الفاظ میں کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اپنے ماحول سے دل برداشتہ ہو چکا ہے ؎

ہوا جب ملک ہندوستان کا طے مرحلہ سارا | کسی راجہ نے جب اس کی اطاعت میں نہ دم مارا
امورِ سلطنت میں فارسی نے کی جو کوتاہی | تو ہندی میں چلایا اُس نے رینا سکہ شاہی
یہ مطلب تھا کسی کا حقِ خدمت رائیگاں کیوں ہو | عوام الناس کی سرزحمت کسب زباں کیوں ہو
کہیں پر امتیازِ مذہب و ملت نہیں رکھا | وزارت میں بھی ہندو فوج کا جرنل بھی ہندو تھا[4]

---

[1] بھیم سین قدیم ہندوستان کا فرمانروا تھا جس کی دولت کی بہت شہرت تھی۔ از تاریخ فرشتہ۔ [2] اس ایطا کو موجودہ شعرا نے مستحسن مانا ہے [3] محمود غزنوی کی فوج میں جو ہندو جنرل تھا اُس کا نام سوندرائے تھا۔ از عہدِ اسلامی کا ہندوستان، مولانا ریاست علی ندوی۔

Marfat.com

نگاہِ عدل پرور بے نیازِ کفر و ایماں تھی — وہی خدمت حکومت کی ملی جو جس کے شایاں تھی
تجارت اک بڑی توہین تھی شانِ حکومت کی — رعایا کے لئے راہیں کھلی تھیں ہر تجارت کی

پھر زمانۂ حال سے مقابلہ ؎

بہ صورت لہسے جاری طلائی نقرئی سکے — کبھی قحط گراں میں بھی چلے کب کاغذی سکے
نہ یہ بے روزگاری تھی نہ آئی فاقہ مستی تھی — وفورِ فارغ البالی سے مہنگی میں بھی سستی تھی
نہ چوری تھی نہ ڈاکہ تھا نہ رخنہ بد سگالوں کا — کہیں چوری ہوئی کچلا گیا سر کوتوالوں کا
نہ تھی پھیلی ہوئی ہر سمت رشوت کی دکانداری — نہ تھا اتنا زمانے میں رواجِ مکر و عیاری
نہ پلیس تھی نہ طیارے نہ اتنے ڈاکخانے تھے — نہ تھی اتنی عدالت اور نہ اس کثرت سے تھانے
نہ راس آئی فضا اس ملک میں اسکول و کالج کی — مرض بڑھتا گیا اتنا دوا ہوتی گئی جتنی
فقط پنجاب ہی پنجا تھا غزنی کا ایک صوبہ — رکھا پنجاب سے لے بہ غزنی ہر جگہ دستہ
نظامِ ملک سے جب غزنوی کی ہو چکی فرصت — ایاز نیک خو کو کر کے حاکم خود ہوا رخصت

۱۰۳۰ء میں محمود غزنوی کا انتقال ہوا۔ تخت و تاج کو حاصل کرنے کے لئے محمود غزنوی کے بیٹوں محمد اور مسعود میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سلجوقیوں اور غوریوں میں بھی تخت پر قابض ہونے کے لئے ٹھن گئی۔ انہوں نے بھی غزنی کے تخت پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی غوریوں کا ستارہ بلند تھا۔ آخر کار علاؤ الدین امیر غور کی بن آئی وہ غزنی کے تخت پر بیٹھ گیا شہاب الدین غوری کو غور کا گورنر مقرر کر دیا۔ بعد میں موقع ملتے ہی علاؤ الدین کو قید کر کے شہاب الدین خود غزنی کا بادشاہ بن گیا ؎

علاؤ الدین امیر غور نے خونریز اک حملہ — کیا غزنی پہ اور غزنی کے سارے شہر کو پھونکا
شہاب الدین غوری جو حکومت کا گورنر تھا — لیا غزنی کا تخت و تاج خود سلطان بن بیٹھا
اسی برس نہیں لاہور پر بھی کر لیا قبضہ — مقید ہو گیا زنداں میں خسرو شاہ کا کنبہ

اس وقت ہندوستان کے صوبہ پنجاب اور اجمیر پر پرتھوی راج چوہان کا سکہ رواں تھا۔ قنوج پر جے چند کا پرچم لہرا رہا تھا۔ فقط یہی دو حکومتیں بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے قابل تھیں مگر بدقسمتی سے ان کی آپسی رنجش اور ذاتی دشمنی نے محمد غوری کو ہندوستان پر حکومت کرنے کی دعوت دی۔ پرتھوی راج

Marfat.com

کی فوج کا محمد غوری کی فوج سے اجمیر میں مقابلہ ہوا اور شکست کھائی۔ جنگ کا دل دوز خونچکاں نظارہ ملاحظہ ہو۔ ؎

دو طرفہ بجلیاں گرنے لگیں شمشیر بُرّاں کی — دھواں آندھیاں اُٹھیں خدنگِ تیر و پیکاں کی
اِدھر جے ہند کا نعرہ اُدھر تکبیر ہوتی تھی — جو صف گرتی تھی موجِ خوں کی اک تصویر ہوتی تھی
کہیں لتھڑا لہو سے عارض و گردن کا نظارہ — کہیں کچلی ہوئی لاشوں سے تھا خرمن کا نظارہ
کہیں تو غور و غزنی کے جواں ایڑی رگڑتے تھے — کہیں ہندوستاں کے پہلواں ایڑی رگڑتے تھے
کہیں ہر زخمِ تن سے خون کی ندی اُبلتی تھی — کہیں نیزہ لچکتا تھا کہیں تلوار چلتی تھی
کہیں گردن کہیں بازو کہیں زرہیں کہیں مغفر — کہیں ترکش کہیں چلّے کہیں نیزے کہیں خنجر

پرتھوی راج کی شکست کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا راجہ نہیں تھا جو محمد غوری کا مقابلہ کر سکتا۔

سلطان محمد غوری کا سکّہ میسور سے بنگال تک چلنے لگا۔ محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا جانشین مقرر کر کے وطن کا رُخ کیا مگر راستے میں دریائے جہلم کے کنارے اسمٰعیلیوں نے یا گھوکھر قوم کے کسی سردار نے محمد غوری کو ۱۲۰۶ء میں قتل کر دیا ؎

دیہات و شہر میں چلنے لگا سکّہ حکومت کا — ہوا سلطان کا لاہور سے بنگال تک قبضہ
سبھی جب آ گئے غوری حکومت کی اطاعت میں — کئے نذرانے سب پیش دامانِ عقیدت میں
تو قطب الدین ایبک کو بنا کر جانشیں اپنا — بصد عجلت کیا ہندوستاں سے قصد غزنی کا
کوئی کہتا ہے اسمٰعیلیوں کی یہ شرارت تھی — کوئی کہتا ہے گھوکھر قوم کے دل میں عداوت تھی
کسی سے ہو سکے گا فیصلہ کیا ان بیانوں کا — غرض ہے اختلاف اس میں بہت تاریخ دانوں کا
بڑی چالاکیوں کے ساتھ شہنشاہ غوری نے — کئے تھے تین حصّے ملک میں اپنی حکومت کے
جو تاج الدین یلدز غور و غزنی کا گورنر تھا — تو قطب الدین ایبک حکمراں تھا پنجاب و دہلی کا
حکومت سندھ میں، ناصر الدین قباچہ کی — انہیں کے ہاتھ میں تھی سطوت جہانبانیٔ غوری

مثنوی کا اختتام عبرت آمیز ہے ؎

وہ جب رخصت ہوا دنیا سے کچھ دنیا نہ کام آئی — پیامِ مرگ جب آیا تو کچھ حشمت نہ کام آئی
پڑا تھا کشوروں میں غلغلہ جن تاجداروں کا — پتا بھی آج کچھ ملتا نہیں ان کے مزاروں کا

Marfat.com

جہاں نغموں سے تھا گونجا ہوا ایوانِ سلطانی — اب ان کے کھنڈروں میں اُلو کرتے ہیں مرثیہ خوانی
تجلّی زار کا دھوکا تھا جس کی بزم روشن پر — دیئے مٹی کے بھی جلتے نہیں اب ان کے مدفن پر
یہ دُنیا ہے یہاں جس کی بلندی اس کی پستی ہے — اسی پر انحصار رونقِ بازارِ ہستی ہے

مندرجہ ذیل اشعار پر مثنوی اختتام پذیر ہو جاتی ہے ؎

اب اس کے بعد ہوں گی دفتر دیم کی تعمیریں — نظر آئیں گی جس میں ان شہنشاہوں کی تصویریں
زمانے میں جنھیں حاصل ہے شانِ امتیاز اب تک — زمین ہند و ایراں کو رہا ہے جن پہ ناز اب تک

سرّر نے شاہنامہ میں جہاں کہیں رزم آرائی کا منظر پیش کیا ہے رزم آرائی کی وہ شان پیدا نہیں ہو سکی جو چشم دید جنگی حالات لکھ کر پیش کی جا سکتی ہے۔ رزمیہ مناظر کے لئے جہاں بلند آہنگی مناسبت لفظی اور شکوہ الفاظ اس کے حُسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ اس سے مثنوی اگرچہ محروم نہیں ہے پھر بھی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اس کی غالباً معقول وجہ یہ ہے کہ سرّر کے سامنے چشم دید مناظر کی بجائے نثری تاریخ فرشتہ تھی۔ جس کے چوکھٹے میں موصوف نے تاریخی واقعات کو نظم کے پیرائے میں پیش کرنا تھا۔

مثنوی شاہنامہ ہند میں زبان و اسلوب کی برجستگی بے تکلفی اور روانی شروع سے آخر تک پائی جاتی ہے۔ سرّر کے یہاں نازک بیانی کے ساتھ کہیں کہیں شکوہ الفاظ میں امتزاج، مضمون میں بندش کی چستی پیدا کر دیتا ہے۔ مثنوی میں ربط و تسلسل ہر جگہ برقرار ہے۔

تشبیہات کی ندرت ملاحظہ ہو ؎

بصد غیظ و عتاب افواجِ دشمن سے لڑی آنکھیں — بھویں تنی ہوئیں آہو کی آنکھوں سے لڑی آنکھیں
عتاب آلود آنکھیں جن میں کچھ کچھ سرخ ڈورے ہیں — بھرے بغض و عداوت کے چھلکتے دو کٹورے ہیں
ہر اک روحوں کے طائر سینۂ دسر چھوڑ کر بھاگے — کہ جیسے زلزلے میں آدمی گھر چھوڑ کر بھاگے
لپک کرتی تھی اک اک گام پر اک زلزلہ پیدا — صدا گھنگھروں کی ہر دم کام کرتی تھی نقیبوں کا

مختصر یہ کہ سرّر نے تاریخ کے خشک موضوع کو اپنی شاعرانہ قادر الکلامی سے خشک نہیں ہونے دیا۔ بلکہ تاریخی واقعات مؤرخانہ انداز میں عربوں کی حکومت سے لے کر محمد غوری کے عہد تک ایک منظوم تاریخ مرتب کر دی۔ مگر اس کے بعد کے حکمرانوں کی تاریخ نظم نہیں کی۔

Marfat.com

# گوکل چند نارنگ

گوکل چند نارنگ نام۔ شعر گوئی کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ مایہ ناز ادیب، اچھے مقرر اور نامور مؤرخ تھے۔ بیرسٹر بھی بنے۔ آپ کو "ٹرانس فارمیشن آف سکھ ازم" پر یورپ کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ نارنگ فارسی، سنسکرت، اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ انگریزی اور اُردو میں آپ کی کئی تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں، جن میں نغمۂ جاوداں" "یادرفتگاں" "اقوالِ بزرگاں" قابلِ ذکر ہیں۔ "اقوالِ بزرگاں" کئی نظموں کا مجموعہ ہے جن میں ہمارے موضوع سے متعلق دو نظمیں ہیں "شہیدِ اعظم حقیقت رائے" اور "ستیوں کا شراب" ہیں۔ نارنگ نے اصلاح یا مشورۂ سخن علامہ عشق آبادی سے کیا۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔

**مثنوی شہیدِ اعظم حقیقت رائے** نارنگ نے اس مثنوی کی ابتدا بغیر کسی تمہید، حمد نعت و منقبت کے کی ہے۔ اس میں مصنّف نے مغلیہ عہدِ حکومت کے عہد میں حقیقت رائے کی شہادت کے واقعہ کو مثنوی کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ جس کا مختصر پلاٹ اس طرح ہے۔

ضلع سیالکوٹ مغربی پنجاب (پاکستان) میں پُری کھتری خاندان کا ایک شخص بھاگ مل رہتا تھا۔ جس کی رانی کا نام کوراں تھا۔ ایک عرصہ تک اُن کے ہاں اولاد نہیں ہوئی، بالآخر بھگوان کی مرضی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام حقیقت رائے رکھا گیا۔ اس زمانے میں ملکی زبان فارسی تھی۔ حقیقت فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مکتب میں داخل ہوا۔ مکتب میں جس مُلّا سے وہ تعلیم حاصل کرتا تھا، وہ بڑا غصیلہ اور تعصب کا پتلا تھا۔ ایک دن مولوی مکتب میں نہیں تھا۔ مسلمان طالب علموں اور حقیقت رائے میں کہا سُنی ہوگئی۔ مسلمان لڑکوں نے حقیقت رائے کو دُرگا دیوی کی گالی دی۔ بدلے میں حقیقت رائے نے بھی وہی الفاظ شانِ فاطمہ کے لئے دہرائے۔ جب مولوی کو معلوم ہوا، غصّہ اور تعصب کے زعم میں آکر دُرگا دیوی کو دخترِ پیغمبر کے مقابلے میں حقیر اور ترائے ہوئے

Marfat.com

پتھر سے تشبیہ دی اور حقیقت کو گناہِ کبیرہ کا مجرم گردانتے ہوئے شریعت کی رُو سے سزائے موت کا حق دار قرار دیا۔

حقیقت کے والد نے نابالغ بچے کی غلطی کی معافی چاہی مگر بے سود، معاملہ عدالت تک پہنچا شہری پنچایت نے مل کر حاکم تک رسائی کی۔ حقیقت رائے اور اُس کی ننھی مُنّی اردھانگنی کے لئے معافی کی درخواست کی۔ قاضی نے کہا مُفتی جو فتویٰ دے گا اس پر عمل ہوگا۔ مُفتی کے فیصلے کی رُو سے قرار پایا کہ شریعت نابالغ مجرم کو گناہِ کبیرہ کے معاملے میں معاف نہیں کر سکتی۔ بلکہ سزائے موت کا حکم دیتی ہے۔ جاں بخشی کی صرف ایک صورت ہے کہ مُجرم ہندو مذہب کو ترک کر کے اپنی مرضی سے مشرف بہ اسلام ہو جائے اور کلمۂ حق پڑھے۔ حقیقت کے والدین نے بچے کو مذہبِ اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی اور مفتی نے بھی بچے کو بہت سمجھایا، مگر بچے نے کہا کہ مجھے اپنا دھرم چھوڑنے پر مجبور نہ کرو۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ جلّاد نے حقیقت رائے کا سر دھڑ سے جُدا کر دیا۔ لاہور میں دریائے ستلج کے کنارے حقیقت رائے کی سمادھی بنائی گئی جہاں ہر سال بسنت پنچمی کے روز میلا لگا کرتا تھا۔ شاعر نے آخر میں دلی خواہش ظاہر کی ہے کہ دہلی میں حقیقت رائے کی کوئی یادگار تعمیر کی جائے جہاں ہر سال شہری وہ دن منائیں۔

مثنوی کے ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

کبھی سیالکوٹ ایک اچھا نگر تھا　　تھا پنجاب میں نام مشہور اس کا
وہاں بھاگ مل اک بڑی کھتری تھا　　بڑا بھگت پکّا تھا درگیشوری کا
ملی اس کو ایسی ہی اردھانگنی تھی　　کہ وہ بھی بڑی بھگت درگا ہی کی تھی
بڑی نیک بختی کوراں تھا نام اس کا　　بھجن صبح اور شام تھا کام اس کا[1]

ایک عرصہ کے بعد جب بھاگ مل کے ہاں بچے نے جنم لیا تو یہ خوش خبری سارے شہر میں پھیل گئی۔ گھر میں خوشیوں کے شادیانے اور بدھائی کے گیت گائے گئے۔ جب بچہ مکتب میں جانے کے لائق ہو گیا تو حسبِ دستور اُسے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مکتب میں داخل کیا گیا ؎

ہوا چاند سا بیٹا اک اُس کے گھر میں　　خوشی اس خبر کی ہوئی شہر بھر میں

---

[1] گوکل چند نارنگ "اقوالِ بزرگاں" دیال پرنٹنگ پریس دہلی۔ بار اوّل ۱۹۵۹ء

Marfat.com

نہایت خوشی کے بجے شادیانے | بدھائی کے گائے گئے گھر میں گانے
ہنوں کو بلائے گئے چار پنڈت | حقیقت ہوا بچے کا نام نشچت
بصد ناز ماں باپ نے اس کو پالا | سیانا ہوا جب تو مکتب میں بھیجا
پڑھائی وہاں تازی و فارسی تھی | یہی تھی سبیل ان دنوں نوکری کی

ایک دن مکتب میں ملا نہیں تھا، مسلمان طالب علموں اور حقیقت میں کہا سنی ہو گئی۔ حقیقت کو جماعت کے لڑکوں نے بہت مارا جب ملا مکتب میں آیا تو سب نے مل کر مولوی کو حقیقت کے برخلاف بھڑکایا اور کہا کہ حقیقت نے شانِ حضرت فاطمہ میں گستاخی کی، نازیبا الفاظ استعمال کیئے یہ سنتے ہی ملا غصے میں لال پیلا ہو گیا اور فرمانے لگا ۔

بس اتنے میں ملا بھی واپس جو آیا | مسلمان لڑکوں نے اس کو پڑھایا
بہت اس میں مرچ اور مسالا لگایا | اسے اس طرح سخت غصہ دلایا
کہا اس نے شیطان یہ کیا بکا ہے | یہ ہے فاطمہ کون؟ تجھ کو پتا ہے
ہمارے پیغمبر کی تھی پاک دختر | بڑی اس کی تعظیم لازم ہے سب پر
خبر ہے سزا شرع میں اس کی کیا ہے | اڑا دو سر اس کا یہ حکم خدا ہے

حقیقت نے اپنے حق میں جن الفاظ میں صفائی دی ہے وہ قابل غور ہیں۔ مگر تعصب کے پتلے ملا پر اس کا اثر نہیں ہوا ۔

حقیقت نے پھر سارا قصہ سنایا | مسلمانوں نے کیسا اس کو ستایا
اسی درگا کو سب نے گالی سنائی | جسے مانتی آئی ہے سب خدائی
شہنشاہ اکبر نے بھی جس کو مانا | جسے آج بھی پوجتا ہے زمانا
اسے پہلے ان سب نے جب دی تھی گالی | نکل ہی پڑی میرے منہ سے کچھ ایسی
خطا غصے میں ہو گئی مجھ سے ایسی | نہ توہین کی کچھ بھی نیت تھی میری
مجھے بخش دیں حضرت ازراہِ شفقت | نہ ہو گی کبھی مجھ سے پھر ایسی حرکت
مگر رحم ملا کو بالکل نہ آیا | حقیقت کو الٹا ہی تبرا سنایا
گناہِ کبیرہ یہ تو نے کیا ہے | شریعت میں بس قتل اس کی سزا ہے

Marfat.com

کہاں وہ ہمارے پیغمبرؐ کی دختر
کہاں وہ تراشا ہوا ایک پتھر

اسے پوجتا ہے اگر شاہ اکبر
تو سمجھو تھا وہ کافروں کے برابر

عدالت میں اب تجھ کو جانا پڑیگا
عذاب اس کا تجھ کو اٹھانا پڑیگا

جب معاملہ عدالت میں پہنچا تو پنچوں نے حاکم سے بڑی منت سماجت کی اور نابالغ حقیقت کو معاف کرنے کی درخواست عدالت میں دی مگر حاکم نے جواب دیا کہ جو فیصلہ مفتی کرے گا اس پر عمل ہو گا۔ یہ سنتے ہی پنچ مایوس ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے اور جانتے تھے ؎

یہ کیا ہو گا فتویٰ وہ سب جانتے تھے
کہ مفتی کی وہ نبض پہچانتے تھے

کسی جرم میں کوئی ہندو جو پھنسا
بری اس عدالت سے ہرگز نہ ہوتا

نہیں شرع میں حکم کوئی بھی ایسا
کہ دیں فائدہ اس کو نابالغی کا

ہے صرف ایک رستے سے نجات اس کو حاصل
کہ فوراً کرے ترک وہ دینِ باطل

کرے توبہ اپنے گناہوں کی یکسر
مشرف بہ اسلام مرضی سے ہو کر

نہیں تو اُسے قتل کرنا روا ہے
یہی شرع میں اس کی واجب سزا ہے

جب مفتی کا فتویٰ صادر ہوا تو حقیقت کے والدین نے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے کو مذہبِ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ حقیقت کا فیصلہ ملاحظہ ہو ؎

مجھے تم نہ ایسی نصیحت پڑھاؤ
میری بلکہ کچھ اور ہمت بڑھاؤ

سبق سب کو گیتا نے جو کچھ سکھایا
وہ اس وقت میرے بڑا کام آیا

کہ مرتی نہیں آتما یہ ہماری
یہ گیتا میں ملتا ہے اُپدیش بھاری

تمہارا کہا میں اگر مان جاؤں
مسلمان ہو کر یہ جیون بچاؤں

تو پھر کیا پتہ ہے کہ کب تک جیوں گا
بھروسہ نہیں زیست کے ایک دم کا

اسی رات کو سانپ ہی کاٹ کھائے
وبا ہی کوئی مجھ کو آ کر دبائے

تو پھر جان بھی دھرم کے ساتھ جائے
تو اسلام پھر کیا میرے کام آئے

اگر تم مجھے یہ یقیں بھی دلاؤ
لکھت لا کے یم راج کی بھی دکھاؤ

Marfat.com

کہ منظور کرے جو اسلام کوئی — حیات اس کو مل جائے گی جاودانی
نہ پھر بھی تیاگوں گا یہ دھرم اپنا — بنا دھرم جینے سے بہتر ہے مرنا

جس دھرم پر بزرگوں نے مصیبتیں اٹھا کر اس پر آنچ نہ آنے دی۔ گورو ارجن دیو نے جہانگیر کے ظلم سہے، شیواجی مرہٹہ بھی دھرم کے لئے لڑا۔ دسویں گورو گوبند سنگھ نے اپنے چاروں شہزادے دھرم کی راہ پر قربان کر دیئے مجھے بھی تو اپنا دھرم ویسا ہی پیارا ہے ؎

جیوں گا نہ میں دھرم قربان کر کے — بچاؤں گا میں بھی تو دھرم اپنا مر کے

آخر میں ناظم نے کوشش کی اور حقیقت کو فتویٰ کا کاغذ دکھایا اور بڑے پیار سے سمجھایا کہ اسلام قبول کر لو، تمہیں بے شمار دولت، بڑا عہدہ، جاگیر دلواؤں گا۔ اور خوبصورت لڑکی سے شادی کروا دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اس پر حقیقت کا جو ردِعمل ہوا ملاحظہ ہو ؎

نہیں مال و دولت کی مجھ کو ضرورت — نہیں چاہئیں ایسے عہدے حکومت
مجھے دھرم اپنا نہایت ہے پیارا — نہ بیچوں اُسے جو ملے راج سارا
ڈرا سکتا ہے کیا یہ مفتی کا فتویٰ — مجھے مرنے کی بھی نہیں کوئی پروا
ہمیشہ ملی ہے بزرگوں کی شکشا — کہ مر کر بھی انسان رہتا ہے زندہ
بدلتا ہے کپڑے ہر انسان جیسے — ہے مرکر یعنی نیا جسم ایسے

حقیقت کا جواب سنتے ہی ناظم نے حکم دیا کہ فتویٰ کی فوراً تعمیل کی جائے۔ جلاد نے حقیقت کا سر دھڑ سے جدا کر دیا اور لاش لواحقین کے سپرد کر دی گئی۔ لاہور میں دریائے ستلج کے کنارے شہیدِ اعظم حقیقت رائے کی سمادھی بنائی گئی۔ یہاں پر ہر سال میلا لگا کرتا تھا۔ ؎

مچے شور غل شہر میں ہائے ہائے — حقیقت کی جے ہو یہ نعرے لگائے
اُسے پریم شردھا سے سب نے اُٹھایا — بڑی شان سے داہ اس کا کرایا
شردھا سے اس کی سمادھی بنائی — وہاں ہر برس اس کی برسی منائی
حقیقت کا یش لوگ گاتے رہیں گے — سمادھی پہ جوتیں جلاتے رہیں گے
مگر ملک تقسیم جب سے ہوا ہے — دگرگوں یہاں حال تب سے ہوا ہے

مثنوی کا اختتام بھی نصیحت آمیز ہے۔ مصنف نے خواہش ظاہر کی ہے کہ شہیدِ اعظم

Marfat.com

حقیقت کے نام پر دہلی میں ایک یادگار قائم ہونی چاہیئے جہاں ہر سال شہید دوس منایا جائے ؎

کریں کوئی استھان[1] دلی میں قائم — حقیقت کا قائم رہے نام دائم
شہیدوں ہی کے دم سے جیتی ہیں قومیں — شہیدوں ہی کا خوں بھرے جان ان میں
گری قوم کو پھر شہادت اٹھائے — جو غفلت میں سوئی ہو اس کو جگائے
جوانوں کے ہو خون میں جو حرارت — تو آجائے پھر سے پراچین بھارت
بجا کرتا تھا جس کا ڈنکا جہاں میں — سماں پھر وہ آجائے ہندوستاں میں
رہے کوئی دشمن نہ اس کا اچھے ہو — ہو جے دھرم کی اور دھرمی کی جے ہو

مصنف ایک اچھا مؤرخ بھی ہے اس لئے اس نے تاریخی مضامین یا واقعہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ایک مؤرخ کا تاریخی موضوع کو کسی حد تک افسانوی رنگ دینا تاریخ کے ساتھ اگر مذاق نہیں تو اس کے ساتھ انصاف کرنا بھی نہیں مانا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں، حقیقت رائے کی شہادت ایک تاریخی واقعہ ہے جو مغلیہ دور میں ۱۷۴۲ء میں ہوا۔ جب مفتی نے حقیقت رائے کو قتل کی سزا سنادی تو پھر اُس کے بعد کسی حاکم کا حقیقت کو پیار سے سمجھانا کہ وہ خوشی سے مشرف بہ اسلام ہو کر کلمۂ حق پڑھے جس کے بدلے میں اُسے بڑا عہدہ، جاگیر اور بے شمار دولت کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کروانے کا وعدہ کرنا تاریخی اعتبار سے کہاں تک درست ہے ؟

تاریخی مثنوی کے لئے جذبات نگاری اور واقعہ نگاری اس کی شان کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مثنوی میں اس کی عمدہ مثالیں جا بجا موجود ہیں۔ ماں کی ممتا کے جذبات کی تصویر کشی جس انداز میں مصنف نے اس مثنوی میں کی ہے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ والدین اپنے اکلوتے بیٹے کو بہر صورت زندہ دیکھنا چاہتے ہیں اور ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور بیٹے کو اسلام مذہب قبول کرنے کی ترغیب دیتے ہیں مگر اخلاقی امداد کی بھی تو کچھ قدر و منزلت ہوتی ہیں۔ حقیقت نے اخلاقی تعلیم جو اپنے بزرگوں سے ورثے میں پائی تھی، یا اخلاقی کتابوں سے حاصل کی تھی،

---

[1] یہ یادگار ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ نے دہلی میں بنوا دی ہے۔

Marfat.com

وہ ماں کی جذباتی مامتا سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ جس پر عمل کر کے حقیقت رائے شہید ہو کر قوم کو ایک ایسا درس دے گئے ہیں جو رہتی دنیا تک دلوں تر و تازہ رہے گا اور قوم کے لئے مشعلِ راہ کا کام کرتا رہے گا۔

مصنف نے مثنوی میں سلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ نادر تشبیہات اور عام فہم ہندی الفاظ کی خوب پیوندکاری کی ہے جس سے مثنوی کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

**مثنوی ستیوں کا شراپ** گوکل چند نارنگ نے یہ مثنوی بھی بغیر کسی تمہید، حمد، نعت کے لکھی ہے۔ جو شعری مجموعہ "اقوالِ بزرگاں" میں پہلی بار ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے تاریخی واقعات کو افسانوی عنوان کے تحت نظمایا ہے۔ مثنوی کا مختصر پلاٹ یوں ہے۔ جب شیرِ پنجاب رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا زمانۂ قدیم کی روایت کے مطابق سب رانیاں ستی ہونے کے لئے آبھوشنوں سے آراستہ پیراستہ ہو کر چتا پر بیٹھ گئیں۔ ابھی چتا کو آگ نہیں لگائی گئی تھی کہ چند لٹیرے زیوروں کو لوٹنے کے لئے رانیوں پر ٹوٹ پڑے۔ تب رانیوں نے شراپ دیا واہگورو اُن کا بیڑا غرق کرے گا۔ اور سارا راج جلدی اُجڑ جائے گا۔ "ستیوں کا شراپ" رنگ لایا رنجیت سنگھ کے بعد کھڑگ سنگھ تخت پر بیٹھا۔ اس کی موت کے بعد چند رانی گدی نشین ہوئیں شیر سنگھ اپنی بھابی چند رانی کو قتل کر کے خود تخت پر بیٹھ گیا۔ سکھوں میں پھوٹ پڑ گئی، چند رانی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے سندھا کے سردار اجیت سنگھ اور اُس کے بیٹے نے شیر سنگھ کو قتل کر دیا بعد میں محل میں پہنچ کر دھیان سنگھ کو بھی قتل کرنے کے بعد رانی جنداں کو خوش خبری دی کہ تخت کے سبھی دعوے دار تقریباً ختم ہو گئے ہیں، دلیپ سنگھ کو اپنا راجہ تسلیم کر لیا جائے۔ دلیپ سنگھ کی خوردسالی کی وجہ سے یہ قرار پایا کہ رانی جنداں ستی نہ ہوں۔ دوسری طرف لاہور بھر میں خبر پھیل گئی۔ رانی دھیان سنگھ نے ستی ہونے کی بجائے اپنے بیٹے ہیرا سنگھ کو بلایا اور کہا جب تک تم دل کا بدلہ لے کر نہیں آؤ گے میں پانی نہیں پیوں گی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے سارے سازشی موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ ہیرا سنگھ جو دھیان سنگھ کا ولی عہد جائز تھا وزارت پر بیٹھا خالصہ کو یہ بات کب منظور تھی انہوں نے جموں سے ایک بڑا ڈوگرا بُلا کر اُسے وزارت پر بٹھا دیا۔

Marfat.com

ہیرا سنگھ نے اُسے بھی قتل کر دیا۔ چونکہ خالصہ کا نام زد ڈوگرا قتل کر دیا گیا تھا اس لئے ہیرا سنگھ کا بھی وہی حشر ہوا۔ اب سوال تھا گدی پر کون بیٹھے۔ رانی جنداں نے اپنے بھائی جواہر سنگھ کا نام پنجاب کی خدمت کے لئے پیش کیا یہ وہ وقت تھا' جب پنجاب میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی، فوجی سردار لوٹ میں شریک ہو گئے تھے۔ جواہر سنگھ نے سوچا اگر فوج راہِ راست پر نہ آئی تو پنجاب کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اُنہوں نے فوج کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور متنبہ کیا۔ جواہر سنگھ کی نصیحت انہیں ناگوار گزری اور غُصّے میں جواہر سنگھ کو بھی قتل کر دیا۔ اب رانی جنداں نے دیکھا کہ فوج کا جب یہ حال ہے تو چین و آرام سے راج کرنا ناممکن ہے۔ اس نے سردار فوج کی طاقت کو کم کرنے کے لیے اور چین سے حکومت کرنے کے لئے انگریزوں سے سازش بنائی اور سکھ سرداروں کی فوجی طاقت کو کچلنے کے لئے انگریزی فوج کو طلب کیا۔ انگریز تو یہی چاہتے تھے اور پنجاب کو للچائی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس کو ہڑپ کرنے کے لئے موقعہ کی تلاش میں تھے۔ موقعہ ملتے ہی انگریزی فوج ستلج کے پوربی کنارے پہنچ گئی تو رانی جنداں نے سردار فوج سے کہا۔ انگریزی فوج لڑنے کے لئے آگئی ہے اب تمہارا فرض ہے کہ انگریزوں کے ساتھ بڑی بہادری سے لڑو، ہار کر نہیں بلکہ جیت کر واپس آؤ۔ یہ سکھ فوج کے ساتھ دھوکہ تھا جس میں سکھ فوج کا لڑائی میں بیشمار جانی دمالی نقصان ہوا۔ اور اُس کی کمر ٹوٹ گئی۔

جب کسی راجہ یا شہنشاہ کی اچانک موت کے بعد وارثِ تاج و تخت جوان سال ہونے کے باوجود امورِ سلطنت سے پوری طرح واقف نہ ہو اور نہ اس کی پکڑ زمامِ سلطنت پر استوار ہو تو اُسے چابکدستی سے حکومت کرنے میں قدرے دشواری ہوتی ہے اور وقت لگتا ہے۔ برعکس اس کے اگر ولی عہد خورد سال ہو تو ملک یا ریاست کی حالت جلد دگرگوں ہو جاتی ہے اور ملک میں طوائف الملوکی کا دَور دورا ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت شیرِ پنجاب رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پنجاب کی ہوئی۔ ولی عہد دلیپ سنگھ خورد سال تھا، تخت کے کئی دعوے دار تھے۔ سردار فوجیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا، مگر گوکل چند نارنگ نے ایک مؤرخ ہوتے ہوئے بھی صوبہ پنجاب کی

Marfat.com

آئے روز کی بگڑتی حالت کو "ستیوں کے شراپ" کا کارن بتایا اور اس طرح افسانوی انداز میں مثنوی کا آغاز کیا۔ چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہوا شیرِ پنجاب[1] جب ہم سے رخصت | تو بے چین غم سے ہوا سارا بھارت
کہا سب نے پنجاب بیوہ ہوئی ہے | گورو رکھے رکھشک اب اک گاڑی ہے
مہاراج کی رانیاں تھیں بہت سی | مہاراج سے تھی محبت پریت اُن کی
ہوئیں سب اکٹھی یہی دل میں ٹھانی | کسی کام کی اب نہیں زندگانی
یہ ہے پُرکھوں سے آج تک ریت جاری | پتی کی چتا پر جلیں جا کے ساری
مگر رانی چنداں کو رہنے دو باقی | دلیپ اس کے بچے کو جاجیئے ماں کی
یہ کہہ کر گئیں ساری تیاری کرنے | سجائی گئیں وہ سبھی زیوروں سے

چتا پر بیٹھتے ہی لٹیرے رانیوں پر ٹوٹ پڑے اور سبھی زیورات آبھوشن لوٹ لئے۔ اور رانیاں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ؎

لگیں درد سے رونے بھر بھر کے آہیں | گئیں دیتی پر جھوں کو سب بددعائیں
کرے واہگورو غرق بیڑا تمہارا | اُجڑ جائے یہ راج جلدی ہی سارا
ستی ہو گئیں وہ پتی کی چتا پر | مگر بددعائیں ہی دیتی برابر
اثر بددعاؤں میں شاید تھا ایسا | گئیں راج ہی پھونک سب خالصے کا

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ولی عہد دلیپ سنگھ خورد سال تھا۔ اس لئے کھڑگ سنگھ تخت پر بیٹھا۔ کھڑگ سنگھ کی موت کے بعد چندرانی گدی نشین ہوئیں۔ شیر سنگھ کو یہ ناگوار گزرا اور اس نے اپنی بھابی کو پہلے قید کر لیا۔ پھر راستے کا کانٹا نکالنے کے لئے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا ؎

گئی تخت پر بیٹھ تو چندرانی | بھر آیا مگر شیر[2] کے منہ میں پانی
کیا قید بھابی کو زنداں میں ڈالا | کیا قتل پھر اس کو کانٹا نکالا

---

[1] مراد شیر پنجاب رنجیت سنگھ۔
[2] مراد شیر سنگھ چندرانی کا دیور

Marfat.com

ہوئے غصہ سردار پھر سندھا والے | لگے سوچنے چالیں وہ گھر میں بیٹھے
کہ لیں کس طرح بدلہ اب شیر سنگھ سے | کیا ہے بڑا ظلم رانی پہ اُس نے

گروہ بندی کی بدولت یکے بعد دیگرے کئی گدی کے دعوے دار موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ سوائے دلیپ سنگھ کے جب کوئی حقیقی وارثِ تاج و تخت کا نہ رہا تو سرداروں نے رانی جنداں سے مشورہ کیا کہ ولی عہد کی خورد سالی کی وجہ سے اب کسے راجہ بنایا جائے۔ تو رانی جنداں نے مشورہ دیا ؎

کہا اس نے میرا ہے بھائی جواہر | بڑا ہے امور سیاست میں ماہر
جو مانو تو دے دو اُسے تم وزارت | کرے گا وہ پنجاب کی دل سے خدمت
بالآخر وزارت کو اس نے سنبھالا | گلے ڈال لی اُستروں کی یہ مالا

وزارت پر بیٹھتے ہی جواہر سنگھ سے فوج کی بے راہ روی اور اس کی لوٹ مار میں شرکت، ہر طرف طوائف الملوکی کے دَور کو ختم کرنے کے لئے فوجی سرداروں کو بلایا اور طنزیہ انداز میں انہیں متنبہ کیا۔ اس موقعہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

کہا اس نے سردار سب جو یہاں ہیں | ذرا دھیان دے کر سُنیں جو کہوں میں
جو حالت ہے پنجاب کی جانتے ہو | سبھی نیک و بد سارے پہچانتے ہو
کہ کس جتن سے کیسی کر کے کمائی | مہاراج نے سلطنت تھی بنائی
مگر اس میں اب کھلبلی مچ رہی ہے | بڑی سخت تنظیم ڈھیلی ہوئی ہے
نہ تعمیل حکموں کی کرتا ہے کوئی | نہ قانون کی زد سے ڈرتا ہے کوئی
رہا جو یہی حال کچھ روز جاری | تو ہو جائے گی سلطنت ختم ساری
ہماری نظر آپ ہی پر جمی ہے | مگر باڑ کھیتی کو کھانے لگی ہے

اس قسم کے طنزیہ جملے فوجی سرداروں کو بھلا کب گوارا تھے۔ انہوں نے فوراً جواہر سنگھ کو قتل کر ڈالا۔ رانی جنداں نے دیکھا جب فوج اس طرح باغی اور سرداروں کا یہ حال ہے تو اس کے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ اس کے بچے دلیپ سنگھ کا بھی کہیں ایسا حشر نہ ہو، اس لئے رانی جنداں نے ایک سازش بنائی اور انگریزی فوج کو سرداروں کی طاقت کچلنے کے لئے

Marfat.com

دعوت دی۔ انگریز اس موقعہ کی تلاش میں تھے۔ اندھے کو دو آنکھیں مل گئی تھیں۔ اشارا پاتے ہی پنجاب پر چڑھ آئے، سکھ فوج مقابلہ پر آئی مگر شکست کھائی، اور بہت جانی و مالی نقصان اُٹھایا۔ یہ سکھ فوج کے ساتھ دھوکہ تھا۔ جس سے پنجاب کی سلطنت ہل گئی۔

اک انگریز کو اس نے چٹھی لکھا دی
کہ بنیاد سب سلطنت کی ہلا دی

یہاں آکر ایک دم چڑھائی کرو تم
نہ سکھوں کی فوجوں سے بالکل ڈرو تم

وہ پنجاب پہ پہلے للچا رہا تھا
کہ بھارت میں اب تک یہی اک بچا تھا

کیا کوچ کا حکم فوجوں کو اپنی
جو آیا اُدھر بھیجی رانی کو چٹھی

یہ رانی کو پیغام جس وقت آیا
سبھی فوج کے لیڈروں کو بلایا

کہا چونکہ اس جگہ ہے خانہ جنگی
ہمیں مارنے آرہا ہے فرنگی

قسم یہ میرے سامنے سب اٹھاؤ
نہ جیتو اگر زندہ واپس نہ آؤ

یہ دھوکہ ہوا فوج پہ زخم کاری
گئی جنگ میں پس بہت فوج ساری

یہ آغاز، آغاز انجام کا تھا
ہے تحریر تاریخ میں حال اس کا

پڑھیں اس میں ہم اور کیا کچھ بتائیں
پڑھیں اور سب مل کے آنسو بہائیں

"مثنوی ستیوں کا شراپ" میں اُردو ہندی الفاظ کی پیوند کاری شروع سے آخر تک موجود ہے۔ زبان بھی نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ مصنف نے تاریخ جیسا خشک موضوع افسانوی رنگ آمیزی سے خشک نہیں ہونے دیا۔ بلکہ دلچسپ بنا دیا۔ مگر تاریخ جیسے سنجیدہ مضمون کو افسانوی رنگ دینا درست نہیں ہے۔

تاریخی مثنوی کے لئے واقعہ نگاری جنگی مناظر کی مرقعہ کشی پر شکوہ الفاظ اور بلند آہنگی، لازمی عنصر

Marfat.com

ہیں جس سے مثنوی کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اس پہلو سے مثنوی کمزور ہے۔

مثنوی میں تشبیہات کی ندرت استعارے اور محاورے کے برجستہ استعمال نے مصنف کی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گئی تخت پر بیٹھ جو چندرانی — بھر آیا مگر شیر کے منھ میں پانی
بالآخر وزارت کو اُس نے سنبھالا — گلے ڈال لی استروں کی یہ مالا
ہماری نظر آپ پر ہی جمی ہے — مگر باڑھ کھیتی کو کھانے لگی ہے

Marfat.com

# اختتامیہ

اُردو مثنویات کے گراں قدر خزانے میں تاریخی مثنویوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے انہیں آسانی سے انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ اوراق میں دکنی، شمالی، شرقی و غربی ہند کی جن مثنویوں کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ کیا گیا ہے ان میں بھی کوئی ایسی طویل تاریخی رزمیہ مثنوی نہیں ہے جس کو ہم دوسری زبانوں کے رزمیہ کے مقابلے میں پیش کر سکیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" میں بڑی جچی تلی رائے دی ہے کہ:-

"اُردو مثنوی میں کوئی قابلِ قدر رزمیہ یا کوئی شاندار تمثیل پیش نہیں کی گئی۔ معدودے چند چیزیں جو ہیں وہ تیسرے درجے کی ہیں جس طرح یونانی میں "ایلیڈ" اور اوڈیسی، اطالوی میں "ڈیوائن کامیڈی" انگریزی میں "فری کوئین، پیراڈائس لاسٹ اور پیراڈائس ری گینڈ، سنسکرت میں، "رامائن" اور "مہابھارت" فارسی میں "شاہنامہ" اور "مثنوی معنوی" ہندی میں "پرتھوی راج راسو" "کامائنی" جیسی مہتم بالشان نظمیں ہیں۔ اُردو میں ایک بھی نہیں"

مثنوی کے زریں دور میں ملکی وقومی سطح پر اُردو زبان میں قابلِ قدر رزمیہ کا نہ لکھا جانا ہندوستانی عوام کا عام طور پر اور ہندوستانی فن کاروں کا خاص طور پر علاقائی تعصب اور شخصیت پسندی کے علاوہ غلامانہ ذہنیت کے رجحان کی وجہ سے بھی ہے جن جن زبان اور جس جس ملک میں جب کبھی مہتم بالشان رزمیہ لکھے گئے ہیں، اس عہد کے فن کاروں کے دل و دماغ میں قومی یک جہتی اپنے ملک سے بے پناہ بے لوث محبت اس سے وفاداری کا نتیجہ ہیں۔

نصرتی کا "علی نامہ" جسے وہ شاہنامہ دکن کہتا ہے، فردوسی کے شاہنامہ کے جواب میں سہی مگر ادبی نقطۂ نگاہ سے شاہنامہ کے ساتھ اس کا ذکر بے معنی ہے۔ یہ بات کہ "علی نامہ کو دکنی مثنوی میں وہی رتبہ حاصل ہے جو فارسی زبان وادب میں فردوسی کے شاہنامہ کو دیا جاتا ہے تو مقصد مختلف ہو جائے گا۔ مثنوی اپنے زریں دور میں، جب اُردو زبان اپنے عروج پر تھی کوئی قابلِ قدر رزمیہ پیش نہیں کر سکی تو اب جب اس صنف کا زمانہ نہیں رہا

Marfat.com

تو کسی طویل تاریخی رزمیہ کے ظہور میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر اس حقیقی زندگی اور تنگی اوقات کے تقاضوں نے اس رہے سہے امکانات کو اور بھی ختم کر دیا ہے۔

سردار جعفری صنف مثنوی کے روشن مستقبل یا اس کی ہمہ گیری خصوصیت کے خواہ کتنے ہی قائل ہوں مگر حقیقت یہ ہے طویل مثنویوں کا چلن حالی اور آزاد کے زمانے سے رو بہ زوال ہونے لگا تھا، اب انداز بدل گیا ہے۔ طویل مثنویوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی نظموں نے لے لی ہے۔ جدید شاعر ٹیکنک کے نت نئے تجربات کر رہے ہیں، قوافی اور ردیف کی قیود سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آزاد نظمیں اور نثری نظم پارے لکھے جا رہے ہیں، جدید شاعری کا یہ رجحان دھیرے دھیرے مقبول ہو رہا ہے ممکن ہے کہ مستقبل میں آزاد نظم کے پیکر میں طویل رزمیہ مجموعے وجود میں آئیں کیونکہ آزاد نظم میں بھی نظم کی خصوصیات مثلاً واقعہ نگاری اور اس میں ربط و تسلسل برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس پیکر شاعری کو کسی بھی نام سے پکاریں مگر مثنوی نہیں کہہ سکتے۔

گزشتہ صفحات میں جن جن علاقائی تاریخی مثنویوں کا ذکر آیا ہے وہ عہد ماضی کا بہترین بیش قیمت نمونہ ہیں اور ورثہ ہیں یہ مثنویاں مؤرخین کے لئے تاریخی حقائق کی تدوین میں کسی حد تک مددگار اور معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور تاریخی مثنویاں بھی ہیں جن کے صرف نام ہم تک پہنچے ہیں مگر ان کے متن دست بُرد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں اور کچھ مثنویاں ایسی بھی ہیں جن کے متن مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں مگر مجبوری کی وجہ سے ان تک رسائی نہ ہو سکی۔ اس لئے ان مثنویوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان مجبوریوں اور معذوریوں کے سبب چند مثنویوں کی مختصر سی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

Marfat.com

# چند مختصر تاریخی مثنویاں

## فتح نامہ" از:۔ راغب

محمد جعفر خاں نام راغبؔ تخلص تھا۔ جس کے سن ولادت و وفات نیز خاندانی حالات کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ نواب لطیف اللہ خاں پانی پتی کے بھتیجے تھے۔ بقول مؤلف تاریخ شعرائے بہار

راغبؔ "عظیم آباد میں آکر بحالت غربت بسر کرتے تھے، زیادہ تر فارسی اشعار سے راغب تھے۔" [1]

ان کے قلمی دیوان میں بہت سی مثنویاں ملتی ہیں مگر ہمارے موضوع سے متعلق صرف ایک مثنوی "فتح نامہ" ہے۔ جس میں جنگِ کارنوالس ٹیپو سلطان کا ذکر ہے، اس مثنوی میں دو سو پندرہ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی ہمیں دستیاب نہ ہو سکی ممتاز احمد نے بھی اس مثنوی سے متعلق اشعار پیش نہیں کئے۔

## جنگ نامہ" از:۔ بنیاد

مرزا بنیادؔ الہ آبادی نہد نواب شجاع الدولہ کے شاعر تھے۔ علی جواد زیدی نے امیر اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنیادؔ نے احمد شاہ درانی اور مرہٹوں کے درمیان ایک جنگ کا نقشہ ایسے دل دوز پیرائے میں پیش کیا ہے کہ قاریوں کے ہوش اُڑ جاتے تھے۔ موصوف کا خیال ہے یہ جنگی حالات مثنوی کی شکل میں ہوں گے۔

---

[1] بحوالہ ممتاز احمد مرتبہ مثنویات راسخ کے ایک مضمون بہار میں اُردو۔ ص ۲۴۔۴۸

Marfat.com

## جنگ نامہ از: اکرم
وفات ۱۸۲۵ء

موسیٰ اکرم محمد رام پور کے رہنے والے تھے۔ "جنگ نامے" لکھنے کا شوق تھا۔ انہوں نے ایک جنگ نامہ لکھا، جس میں نواب ضابطہ خاں روہیلہ اور مرہٹوں کے درمیان لڑائی کا ذکر ہے۔ اس لڑائی میں روہیلوں کی بڑی بڑی طرح سے ہار ہوئی، اور بے حد جانی و مالی نقصان اٹھایا۔ بطور نمونہ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جس میں افغانوں کی زبوں حالی کا واقعہ ایک افغان کی زبان سے یوں ادا کرایا ہے ؎

نہ جانو اسے تم کہ وہ فوج ہے — وہ دریائے عمّاں کی ایک موج ہے
حواس اس کے ایسے ہوئے باختہ — کہ شاہیں سے جیسے چھپے فاختہ [1]

## سوزِ عشق" از: اسیر

میر گلزار علی[2] اسیر کی ولادت ۱۸۰۲ء میں ہوئی تھی اور وفات ۱۸۷۲ء میں پائی۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی ایک مثنوی "سوزِ عشق" کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں راجہ دھول پور کی خاندانی تاریخ نظم کی گئی ہے۔

## تخت نشینی واجد علی شاہ اختر" از: سحر

شیخ امان علی نام[3] سحر تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔ پہلے ناسخ پھر برق سے شعر و شاعری کی اصلاح لی۔ ان کی ایک

---

[1] بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۱۹۸۵ء ۔ ص ۱۳۵ - ۱۳۶

[2-3] بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۱۹۸۵ء

Marfat.com

مثنوی تقریبِ تخت نشینی نواب واجد علی شاہ اختر کا پتہ چلتا ہے جو اچھی خاصی طویل مثنوی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

بدل ہیں جو حضرت غلامِ علی — وظیفہ ہے دن رات نامِ علی
زبانِ مبارک پہ ہے یہ سخن — دمِ عیسوی ہے دمِ پنجتن
ادا دل سے کرتے ہیں فرضِ خدا — کہ ہوتی نہیں پنجگانہ قضا

## "رشکِ ماہِ تمام" از:۔ عاشق [۱]

نواب محمد رضا خاں نام عاشق تخلص تھا۔ جرأت و ناسخ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ایک مثنوی "رشکِ ماہِ تمام" سانحہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد لکھی جس میں نواب واجد علی شاہ اختر کی معزولی اور قید ہو کر مٹیا برج میں نظر بندی کا حال ہے بلکھنؤ کی بربادی کے علاوہ حاکموں کی غداری اور انگلشیہ کمپنی کی بے ایمانی کا بھی تذکرہ ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں، جس میں نواب واجد علی شاہ اختر اور عقلِ کل نواب علی خاں نقی مدار المہام کی بات چیت کا ذکر ہے۔ ؎

دیا کچھ نہ سلطاں نے اس کا جواب — وہاں "عقلِ کل" کو بلایا شتاب
وہ آئے جو خدمت میں اُن سے کہا — کہا کیا تھا تم نے ہوا اب یہ کیا
نہ ایسا سمجھتا تھا میں تم کو آہ — یونہی چاہیے مرحبا واہ واہ
تمہاری نہیں اس میں صاحب خطا — مقدر کا میرے فقط پھیر تھا

## "اشکِ مسلسل" از:۔ عیش

شیخ فدا علی نام عیش تخلص تھا۔ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۹ء میں وفات پائی۔ [۲]

---

[۱-۲] بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۱۹۸۵ء

لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کی چار مثنویوں کا پتہ چلتا ہے، ان میں ایک "اشک مسلسل" ہے، جس میں واجد علی شاہ کی معزولی اور شہر لکھنؤ کی بربادی کی داستان ہے جس کو بڑے کربناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؂

شہر یارِ دگر ہوا ویراں — لکھنؤ ہو گیا ہے ٹھوکا مکاں
چرخ سے بے بسی برستی ہے — بے شہنشاہ اُجاڑ بستی ہے

## "رامائن" از:۔ خوشتر [1]

منشی جگناتھ سریواستو نام، خوشتر تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔ رامائن کے جتنے بھی خلاصے یا ترجمے ہوئے ہیں ان سب میں خوشتر لکھنوی کی رامائن کو جو شہرت ملی ہے وہ اور کسی رامائن کے مصنف کو نہیں ملی۔ اس رامائن کے مطالعہ سے مریادہ پرشوتم شری رام کی عظیم شخصیت اور رُوحانی حیثیت سے بڑی آسانی سے واقفیت ہو جاتی ہے مثنوی میں جا بجا مافوق الفطرت اور معجزہ نمائی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، جو تاریخی رزمیہ کے شانِ شایان نہیں۔ کیونکہ تاریخ کے موضوع میں ایسے واقعات کا جوڑ بے میل ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؂

### رام کی معجزنمائی

سُنا جب رام نے یہ قصہ بال — اٹھائے استخواں انگلی سے فی الحال
چہل فرسنگ پر پھینکے وہاں سے — ہلا گردوں صدائے استخواں سے
جو تھے تاڑ اس جگہ یہ حلقہ افگن — کیا اک تیر سے ساتوں میں روزن

---

[1] بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۔ ۱۹۸۵ء

Marfat.com

دکھایا رام نے یہ معجزہ جب	دلِ سگریو کو آیا یقیں تب
کہ بے شک صاحبِ اعجاز ہیں یہ	دو عالم میں بہت ممتاز ہیں یہ

## امیر مینائی [1] ولادت ۱۸۲۹ء وفات ۱۹۰۰ء

امیر احمد نام، امیر تخلص تھا۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ہمارے موضوع سے متعلق دو مثنویاں ملتی ہیں۔ "در بیانِ جشن مسند نشینی نواب کلب علی خاں" اور "مثنوی در بیان خلعت پوشی نواب کلب علی خاں" ان مثنویوں کے دو چار اشعار اب بھی مل جاتے ہیں لیکن مثنویاں نایاب ہیں۔

## مہابھارت" از: طوطارام شایاں [2]

طوطارام نام، شایاں تخلص تھا۔ ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔ شایاں امیر کے شاگرد تھے۔ سنسکرت، فارسی دونوں زبانوں میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ انہوں نے پانچ مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ ان میں ایک "مہابھارت" ہے جس میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کا حال ہے۔ یہ ایک تاریخی جنگ ہے۔ شایاں کی "مہابھارت" کا بنیادی ماخذ فیض کی فارسی مہابھارت' ہے۔ شایاں کے دیباچے مہابھارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی فیض کے بیانات میں شک و شبہ ہوا، سنسکرت 'مہابھارت' سے اس کی تصدیق کی۔ لڑائی کا ایک منظر ملاحظہ ہو

لڑائی کے میداں میں آیا جو بھیم	ہر اک پہلواں کا ہوا دل دو نیم
کیا جس گھڑی نعرۂ ہولناک	گریباں زمیں کا ہوا چاک چاک

---

[1-2] بحوالہ جین گیان چند: اردو مثنوی شمالی ہند میں۔

Marfat.com

نہ تھا بند ستو میں اکیلا دلیر — بنا گوسپندوں کے گلّے کا شیر
دیئے اس طرح کے برابر جواب — کسی کو نہ آئی لڑائی کی تاب

مثنوی رزمیہ جوش و خروش سے عاری ہے۔ یہ مثنوی ۱۸۶۳ء میں تصنیف ہوئی

---

## جنگ روس و جاپان[1] از:- جمنا داس بھارگو

جمنا داس بھارگو ڈبائیوی، بلند شہری کی پیدائش ۱۸۶۱ء میں اور وفات ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ آپ کی ایک رزمیہ مثنوی "جنگِ روس و جاپان" ۱۹۰۹ء میں امپیریل پریس دہلی سے طبع ہوئی، جس میں یورپ کے ایک طاقت ور ملک رُوس اور ایشیا کے نوخیز ابھرتے ہوئے ملک "جاپان" کے درمیان ہوئی جنگ کا حال ہے۔

---

## نقدِ رواں[2] از:- رواں

جگت موہن لال نام، رواں تخلص تھا۔ اُناؤ کے رہنے والے تھے۔ رواں کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں اور وفات ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ "نقدِ رواں" میں رواں نے مہاتما گوتم بُدھ کے حالاتِ زندگی اور اصولِ مذہب کو مثنوی کے انداز میں نظم کیا ہے۔ مگر مکمل نہ ہو سکی۔ بعد میں کرشن سہائے وحشی نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا، جو ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ بطورِ نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں جسودھا کے انتخاب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

سب کے تحفے پا چکے رنگت قبول — نقد خلعت ہو چکا سب کو حصول
سب سے آخر اس ادا سے اک حسیں — لے کے مالا آئی گوتم کے قریں

---

۱-۲ بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۱۹۸۵ء

Marfat.com

سرو قامت ہار پھولوں کا لئے — سر جھکائے اور گردن خم کئے
وہ پری پیکر جسودا جس کا نام — خوش طراز و خوش نگاہ و خوش خرام
گُل کھلاتی آئی یوں مستانہ وار — جیسے گلشن میں عروسِ نوبہار
اِس ادا سے مسکراتی آئی تھی — تحفۂ گل شاخِ گل خود لائی تھی
سُرخ بندی صندل ماتھے پہ تھی — یا جبینِ صبح پر تارا کوئی
رُوبرو گوتم کے آکے رُک گئی — شاخِ گل بارِ حیا سے جھک گئی
آنکھوں آنکھوں میں ہوا شکوہ گلا — نذر کیسی، نذر کا کیسا صلا
یوں نگاہوں سے نگاہیں مل گئیں — جس طرح مل جائیں دو بچھڑے کہیں
صورتیں تھیں جیسے کچھ جانی ہوئی — اور آوازیں بھی پہچانی ہوئی
تھا عجب منظر نگاہِ عام میں — دل کا تحفہ اور دل انعام میں
آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے — ہم تمہارے تم ہمارے ہو گئے

## "درِ شہوار" از:- زبیر [1]

اس مثنوی میں شہزادہ مرزا محمد رئیس زبیر پسر بہادر شاہ ظفر نے مغلیہ بادشاہوں کی عظمت و سطوت کا ذکر کیا ہے، جو نور جہاں بیگم کے حالات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ مثنوی اُنیسویں صدی کے آخر چوتھائی میں مطبع قیصر پٹنہ سے شائع ہوئی۔

## "سنگ و آہنگ" از:- جعفر [2]

جعفر ملیح آبادی، شاہ ملیح آبادی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں پیدا

---

[1] بحوالہ عقیل سید محمد "اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد ۱۹۶۵ء
[2] بحوالہ علی جواد زیدی، مثنوی نگاری ۱۹۸۵ء

Marfat.com

ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق ورثے میں ملا۔ آپ کا ایک مجموعۂ کلام "سنگ و آہنگ" میں مجاہدِ آزادی "ٹیپو سلطان" کے عنوان سے ایک چھوٹی سی مثنوی ملتی ہے۔ جس کے مطالعہ سے مجاہدِ آزادی ٹیپو سلطان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

وہ ٹیپو سلطان میسور کا — وہ صفدر وہ سادنت سورما
وہ رُوحِ شجاعانِ ہندوستاں — امامِ شہیدانِ ہندوستاں
فرنگی کی چالوں سے برہم ہوا — وطن کی حفاظت کو آگے بڑھا
کیا سب سے پہلے یہ ٹیپو نے کام — وطن کے اکابر کو بھیجے پیام
خبر بھی ہے انگریز کے بھیس میں — بلا ایک آئی ہے اس دیش میں

---

ان مثنویوں کی تاریخی قدر و قیمت صرف اتنی ہے کہ ان سے بادشاہان و نوابین اور راجگانِ ہندوستان کی تخت نشینی، خلعت پوشی، غسلِ صحت، تقریباتِ شادی یا ان کے مختلف النوع مشاغل وغیرہ کے بارے میں تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔ اس عہد کی تہذیبی و تمدنی نیز معاشرتی زندگی کی بھی جھلکیاں دکھائی دے جاتی ہیں۔

"ختم شد"

Marfat.com

# کتابیات

جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویوں کے اس تحقیقی و تنقیدی کام کی تیاری میں جن مثنویوں، تنقیدی کتابوں، رسالوں کا مطالعہ کیا ہے، ان کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

تاریخی کتابیں:-

بشیر الدین احمد "واقعات مملکتِ بیجاپور" در مطبع مفید عالم آگرہ، طبع اوّل ۱۹۱۵ء

مولوی محمد ذکاء اللہ "تاریخ ہندوستان" جلد نہم، شمس المطابع دہلی ۱۸۹۸ء

مولانا محمد نجم الغنی "تاریخ اودھ" جلد اوّل مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۹۱۹ء

ایضاً " جلد دوم، " ۱۹۱۹ء

" " جلد سوم، " ۱۹۱۹ء

" " جلد چہارم " ۱۹۱۹ء

" " جلد پنجم " ۱۹۱۹ء

عبد الحلیم شرر "گذشتہ لکھنؤ" یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ طبع اوّل

محمد احتشام الدین "افسانہ پدمنی" محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۹ء

تاریخ ادب اُردو کی کتابیں:-

محمد حُسین آزاد "آبِ حیات"

رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اُردو" راجہ رام کمار پریس لکھنؤ ۱۹۵۲ء

شعبۂ اُردو علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ "تاریخ ادب اُردو" یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۶۲ء

محی الدین قادری زور "دکنی ادب کی تاریخ" ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۰ء

نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اُردو" انشا پریس لاہور طبع پنجم ۱۹۶۰ء

سید اعجاز حسین "مختصر تاریخ ادب اُردو" آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی طبع پنجم ۱۹۵۳ء

جمیل جالبی "تاریخ ادب اُردو" جلد اوّل، ریس آرٹ پریس لاہور ۱۹۷۸ء

Marfat.com

## چند مطبوعہ وغیر مطبوعہ مثنویاں اور تنقیدی کتابیں

سید جمیل الدین احمد جعفری "تاریخ مثنویات اُردو" عالم گیر پریس لاہور طبع دوم

منظر اعظمی "اردو میں تمثیل نگاری" الجمیعتہ پریس دہلی ۱۹۷۰ء

عطاء اللہ پالوی "اُردو کے مثنوی نگار" آرٹ پریس سلطان گنج پٹنہ ۱۹۸۲ء

الطاف حسین حالی "مقدمہ شعر و شاعری" وحید الدین قریشی

شبلی نعمانی "شعر العجم" جلد چہارم مطبع معارف اعظم گڈھ، طبع چہارم ۱۹۵۷ء

ندوی السلام "شعر الہند" حصہ دوم، مطبع معارف اعظم گڑھ

محمد امیر احمد علوی ...... مثنویات

عبد القادر سروری "اُردو مثنوی کا ارتقاء" جدید ایڈیشن

جلال الدین احمد "تاریخ مثنویات اُردو"

گوپی چند نارنگ "ہندوستانی قصوں سے ماخذ اُردو مثنویاں" طبع اوّل ۱۹۶۲ء

سید محمد عقیل "اُردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں" مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد طبع اوّل ۱۹۶۵ء

گیان چند جین "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" انجمن ترقی اُردو علی گڈھ، طبع اوّل ۱۹۶۹ء

محمود شیرانی "پنجاب میں اُردو"

مسعود حسین خاں "قدیم اُردو"

نعیم احمد "شہر آشوب" جمال پرنٹنگ پریس، مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع اوّل ۱۹۶۸ء

صابر علی خاں "سعادت یار خاں رنگین" انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۶ء

محی الدین قادری زور "تذکرہ مخطوطاتِ اُردو"

محی الدین قادری زور "اُردو شہ پارے"

نصیر الدین ہاشمی "یورپ میں دکنی مخطوطات"

ایضاً "کتب خانہ آصفیہ کے اُردو مخطوطات" جلد اوّل ۱۹۶۱ء

ایضاً "کتب خانہ سالارِ جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ۱۹۵۷ء"

Marfat.com

مولوی عبدالحق "نصرتی" انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی ۱۹۵۹ء

شاہ محمد سلطان "انتخاب مثنویات میر" مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، بار اوّل ۱۹۳۰ء

خان رشید "اُردو کی تین مثنویاں"

میر جعفر زٹلی "کلیات" مرتبہ مولوی رحمت اللہ، نجات مشین پریس بجنور ۱۹۲۵ء

عبرت و عشرت "یادِ مادت" مطبوعہ بھارت الیکٹرک پریس، سہارنپور ۱۹۴۷ء

منشی امیر اللہ تسلیم "مثنوی تاریخ رامپور" (غیر مطبوعہ) رضا لائبریری رامپور

میر تقی میر "کلیاتِ میر"

سید حیدر حسین خاں سہیل "تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ" قلمی نسخہ، رضا لائبریری رامپور

ایضاً "مثنوی سہیلِ دکن" قلمی نسخہ، رضا لائبریری رامپور

ایضاً "تاریخ ہندوستان (منظوم)" قلمی نسخہ، رضا لائبریری رامپور

محمد عبداللہ چغتائی "تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ از سہیل" مطبوعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) ۱۹۳۱ء

واجد علی شاہ، جانِ عالم اختر ـ مرتبہ عبدالحلیم شرر

ملا نصرتی "علی نامہ" مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، طبع اوّل

غضنفر حسین "جنگ نامہ سید علی عالم علی خان" مرتبہ مولوی عبدالحق

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد گیارہ، مطبوعہ گریٹ برٹین ـ انگریزی میں

عبدالحمید، طابع و ناشر "اُردو انسائیکلوپیڈیا" بار اوّل، مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۲ء

غلام حیدر، حیدر "مثنوی سکندر نامہ اُردو"

عبدل "ابراہیم نامہ" قلمی نسخہ، سالار جنگ میوزم، حیدرآباد

مسعود حسین خان ـ ابراہیم نامہ مطبوعہ

میر ایوب علی علوی "مثنوی یادِ علوی" قلمی

گوکل چند نارنگ "اقوال بزرگاں" شعری مجموعہ

نانک چند ناز "ظفرنامہ" تشریحی ترجمہ ۱۹۵۲ء

نانک چند ناز "وچتر ناٹک" تشریحی ترجمہ


ذخیرہ محمد وقار المجید

Marfat.com

سید محمد عباس سَرِیر کابری "شاہنامہ ہند" ۱۹۵۵ء

حکیم حافظ بشر محمد خان صاحب مُسلم "ہندوستانی شاہنامہ" دلّی پرنٹنگ پریس ۱۹۲۶ء

سلامت علی رفیق "غزنی نامہ" آر می پریس دہلی ۱۹۲۶ء

برج نارائن ورما ناظم "پھول نامہ" مرتبہ رائے بہادر لالہ موہن لال در مطبع مفید عالم لاہور ۱۹۱۴ء

سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی "مثنوی نوید ہند" صادق پریس پٹنہ، بار اوّل

سید علی محمد شادؔ عظیم آباد "مثنوی مادرِ ہند"

سید احمد علی شاہ "کشفِ بغاوت گورکھپور"

سید احمد علی شاہ "محبوب التاریخ"

کاشی رام سہائے تمنّاؔ "مثنوی یادگار بھوپال"

سلیم حامد رضوی "اُردو ادب کی تاریخ میں بھوپال کا حصّہ" علوی پریس بھوپال ۱۹۶۵ء

سید حسین ذوقیؔ "مثنوی ذوقی موسوم بہ شاہنامہ احمدیت

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدر آباد ۱۹۶۰ء

میاں سید مصطفیٰ تشریفِ الٰہی "مقدمہ الابصار" مطبع مطبوعہ اعلیٰ پریس حیدر آباد طبع دوم ۱۹۶۳ء

ڈاکٹر میمونہ دلوی "بمبئی میں اُردو"

النسا بیگم ولی اللہ "ریاست میسور میں اُردو کی نشو و نما" مطبوعہ برقی پریس منگلور ۱۹۶۳ء

باقر حسین ضیاؔ "مثنوی ضیادکن" در مطبع بُرہانیہ بلدہ حیدر آباد ۱۸۹۱ء

محمد حبیب اللہ رُشدؔ "آصف نامہ" جلد ہفتم، مقدمہ ڈاکٹر محی الدین قادری

دلاور علی دانشؔ "تذکرہ منظوم سلاطینِ دکن (تحفۂ عثمانیہ)

مثنوی نادر، نادرؔ "سفرنامہ اعظم جاہ والئ ارکاٹ"

نذر علی "مثنوی سراج التواریخ"

علی جواد زیدی "مثنوی نگاری" نشاط پریس ٹانڈہ، ۱۹۸۵ء

حسین علی عزتؔ "اضرابِ سُلطانی" قلمی، کتب خانہ سالار جنگ میوزیم

پریم چند "شاہنامہ" قلمی، کتب خانہ آصفیہ

Marfat.com

شاہ کمتر "داستان نواب نظام علی خاں" قلمی، کتب خانہ آصفیہ

کبیر - قلمی دیوان، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

وزیر الدین اظہر "مثنوی طغیانی رودِ موسیٰ" محمد شمس الدین مطبع اصح المطابع حیدرآباد

## رسالہ جات

رسالہ اُردو شمارہ جولائی ۱۹۲۹ء

رسالہ اُردو شمارہ جنوری ۱۹۳۲ء

رسالہ اُردو شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء

رسالہ اُردو شمارہ اپریل ۱۹۵۴ء

رسالہ نگار شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء نیاز فتح پوری

رسالہ اُردو کراچی ماہ اپریل ۱۹۵۱ء مضمون تحسین سروری

رسالہ معاصر ۱۹۵۱ء

Marfat.com

Marfat.com

# ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات ایک نظر میں

## ادب و تنقید

| | | | |
|---|---|---|---|
| تاریخ ادب اردو (آغاز سے اٹھارہویں صدی تک) (تین جلدوں پر مشتمل) | جمیل جالبی | اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے | فرمان فتح پوری |
| مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ | جمیل جالبی | اردو نثر کا فنی ارتقاء | فرمان فتح پوری |
| ارسطو سے ایلیٹ تک | جمیل جالبی | اردو شاعری کا فنی ارتقاء | فرمان فتح پوری |
| نئی تنقید | جمیل جالبی | اقبال سب کے لئے | فرمان فتح پوری |
| ادب، کلچر اور مسائل | جمیل جالبی | تاریخ ادبیات عالم (چار جلدیں) | وہاب اشرفی |
| محمد تقی میر | جمیل جالبی | تاریخ ادبیات عالم (جلد پنجم) | وہاب اشرفی |
| ایلیٹ کے مضامین | جمیل جالبی | قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ | وہاب اشرفی |
| معاصر ادب | جمیل جالبی | معنی کی تلاش | وہاب اشرفی |
| ادبی تحقیق | جمیل جالبی | آگہی کا منظر نامہ | وہاب اشرفی |
| میرا جی ایک مطالعہ | جمیل جالبی | راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری | وہاب اشرفی |
| تنقید و تجربہ | جمیل جالبی | کاشف الحقائق | وہاب اشرفی |
| قومی ڈکشنری (انگلش۔اردو) | جمیل جالبی | شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری | وہاب اشرفی |
| بوطیقا (تصنیف ارسطو) ترجمہ | جمیل جالبی | حرف حرف آشنا | وہاب اشرفی |
| ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ | گوہر نوشاہی | اردو فکشن اور تیسری آنکھ | وہاب اشرفی |
| شاہ عالم ثانی آفتاب احوال و ادبی خدمات | ڈاکٹر خاور جمیل | تفہیم البلاغت | وہاب اشرفی |
| ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات | گوپی چند نارنگ | ہندوستانی محاورے | محمد حسن |
| اردو افسانہ روایت اور مسائل | گوپی چند نارنگ | ہندوستانی شاعری | محمد حسن |
| گوپی چند نارنگ۔حیات و خدمات | ڈاکٹر سید حامد علی | ہندی ادب کی تاریخ | محمد حسن |
| ادبی تنقید اور اسلوبیات | گوپی چند نارنگ | ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر | قمر رئیس |
| اقبال کا فن | گوپی چند نارنگ | تعبیر و تحلیل | قمر رئیس |
| امیر خسرو کا ہندوی کلام | گوپی چند نارنگ | اصول تحقیق و ترتیب متن | تنویر احمد علوی |
| انیس شناسی | گوپی چند نارنگ | ابتدائی کلام اقبال | گیان چند جین |
| اسلوبیات میر | گوپی چند نارنگ | کھوج | گیان چند جین |
| سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ | گوپی چند نارنگ | پرکھ اور پہچان | گیان چند جین |
| سفر آشنا | گوپی چند نارنگ | قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن | گیان چند جین |
| لمحہ لمحہ زندگی | محمود واحد | اوپندر ناتھ اشک | گیان چند جین |
| جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں | کندن لال کندن | کرشن چندر کی ناول نگاری | ڈاکٹر [illegible] |
| گھوڑے کا کرب | ہرچرن چاولہ | وہاب اشرفی شخصیت اور فن | ڈاکٹر منظر حسن |


EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Phones: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com


81-87667-09-5

Marfat.com